پالیسی، قانون سازی اور نظام

ابتری، تشخیص اور علاج

پروفیسر خورشید احمد

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
© IPS Press 2023

پالیسی، قانون سازی اور نظام: ابتری، تشخیص اور علاج

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: محمود فاروقی

ISBN: 978-969-448-827-1

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹوریج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

۳۲۰٫۶۹۵۴۹۱ پالیسی، قانون سازی اور نظام: ابتری، تشخیص اور علاج
خ ور خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۳ء
۲۵۸ صفحات مع اشاریہ
۱۔ قانون سازی-پاکستان ۲۔ قدرتی آفات اور حکومتی اقدامات ۳۔ انسانی جان اور امن وامان-حکومتی ذمہ داری
۴۔ سرکاری ملازمتیں ۵۔ سفارت کاری ۶۔ ذرائع ابلاغ کی آزادی

PRESS

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۱ فیکس: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۰

ای میل: publications@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk

فیس بک: www.facebook.com/IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری

الفاظ وصفحہ سازی: محمد عالم

طباعت: پریمئر پرنٹرز، راولپنڈی

فہرست

— پیش لفظ V

— تعارف VII

باب نمبر ۱: **قانون سازی اور اس پر عملدرآمد (۱)**: غیر سنجیدہ حکومتی طرزِ عمل ۱-۳۰

● اسلام آباد ہائی کورٹ کے قیام کا قانون ● قانون برائے انسانی حقوق کمیشن ● جیل خانہ جات کے قانون میں ترمیم ● عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار، ججوں کی کمی ● عدالتوں میں ججوں کی تقرریاں ● بار کونسل ایکٹ ● سماجی تحفظ کا آئینی حق ● قومی کمیشن برائے اسٹیٹس آف ویمن بل ● چوری کی سزا کا مجوزہ قانون ● پرائیویٹ پاور اینڈ انفراسٹرکچر بورڈ ● نجی سرمایہ کاری کے فروغ اور تحفظ کا ترمیمی قانون

باب نمبر ۲: **قانون سازی اور اس پر عملدرآمد (۲)**: تحفظ نسواں کا قانون ۲۰۰۶ء ۳۱-۸۰

باب نمبر ۳: **قدرتی آفات، تباہی اور بحران سے نمٹنے کا قومی نظام** ۸۱-۱۱۴

● ۲۰۰۵ء کا زلزلہ ● سیلاب اور بارشوں سے تباہی (۲۰۰۷ء) ● کوئٹہ میں زلزلہ (۲۰۰۸ء) ● سیلاب سے تباہی (۲۰۱۰ء)

باب نمبر ۴: **انسانی جان کی حفاظت اور حکومتی ذمہ داری** ۱۱۵-۱۳۶

● خطرناک ادویات کی فروخت ● انسانی اعضاء کی تجارت ● پینے کے صاف پانی کی فراہمی کا منصوبہ ● ناکارہ گیس سلنڈروں کی بناء پر ہونے والی ہلاکتیں ● پارلیمنٹ ہاؤس میں آتشزدگی کا واقعہ ● اسلام آباد میں پولیس کے جرائم پر رپورٹ ● ملاوٹ شدہ گوشت، سوفٹ ڈرنکس اور شراب کی فروخت ● بلوچستان میں تین خواتین کا قتل ● دیت کی عدم ادائیگی پر مجرم کے لیے نرمی کی تجویز

باب نمبر ۵: **امن وامان کی صورتحال اور حکومتی ذمہ داری** ۱۳۷-۱۷۸

● جان ومال کا تحفظ ● کراچی میں بدامنی کے سیاسی و معاشی پہلو اور کرنے کے کام

باب نمبر ۶: **سرکاری ملازمتوں کی فراغت اور بحالی**: ناانصافی پر مبنی امتیازی فیصلے ۱۷۹-۱۹۶

● کنٹریکٹ سرکاری ملازمین کی سبکدوشی ● مختلف اداروں میں چھانٹی ● پندرہ سال قبل سبکدوش ہونے والے ملازمین کی بحالی کا قانون ● پی آئی اے میں کنٹریکٹ ملازمین کا مسئلہ ● پلاننگ کمیشن میں تقرریاں ● فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں تقرریاں

باب نمبر ۷: **سفارت کاری: کارکردگی اور کردار** ۱۹۷-۲۰۶

● جدہ میں پاک وہند مشاہرہ میں پاکستانی سفیر کی تقریر ● ملک شام میں پاکستانی سکول ● سندھ طاس معاہدہ - سفارتی دباؤ کی ضرورت ● سندھ طاس معاہدہ - بھارتی وفد کا خیر مقدم

باب نمبر ۸: **ذرائع ابلاغ کی آزادی اور ان کا کردار** ۲۰۷-۲۳۲

● آزادی صحافت اور صحافیوں کا تحفظ ● پیمرا آرڈیننس اور الیکٹرانک میڈیا میں آزادی کی حدود

● پاکستان ٹیلی ویژن کا کردار ● سینیٹ آف پاکستان کے بارے میں 'مسلم' اخبار کا توہین آمیز تبصرہ

اشاریہ ۲۳۳-۲۴۸

پیش لفظ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کر کے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشو و نما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے۔ یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن و سنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آ گیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیٔ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہو گیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لا ڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن و سنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جاسکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورتِ حال کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کر سکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرز حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، معاشی صورت حال اور امکانات، بلوچستان کی صورت حال، پاکستان کا جمہوری سفر، قانون، ادارے اور حکومت جیسے موضوعات پر دس کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ الحمد للہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کر لے۔

پروفیسر خورشید احمد

لیسٹر، برطانیہ

تعارف

انسانی عمل اور تعلقات میں اونچ نیچ، رویوں میں بے اعتدالی کا نتیجہ بھی ہوتی ہے اور سبب بھی۔ ایک خاص حد تک تو یہ مسئلہ سماجی اقدار اور روایات اور انہی پر مبنی ادارتی نظام کی روشنی میں ازخود متوازن ہو جاتا ہے۔ تاہم جب ایسا کوئی حل موجود نہ ہو یا وہ ناکام ہو جائے تو ایسے نظام کی ضرورت پیش آتی ہے جہاں مختلف افراد یا گروہوں کو اجتماعی طور پر طے کردہ اصولوں کی بنیاد پر تصادم سے روکا جا سکے، اور ہر ایک کو اس کا حق حاصل ہو سکے۔ قانون اور قانون سازی کی بحث انہی اصولوں سے متعلق ہے۔

سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو قوانین کا کوئی بھی مجموعہ ان اصولوں اور قواعد وضوابط کا نام ہے جو کسی بھی خاص صورت حال میں انسانوں کے درمیان حقوق و فرائض، اختیارات اور ذمہ داریوں کو بیان کرتا ہے۔ ان اصولوں کی پابندی کے لیے محرکات اور خلاف ورزی کی صورت میں تادیبی اقدامات، اور ان پر عمل درآمد کے لیے طریق کار بھی اس نظام کا حصہ ہوتا ہے۔ ان قوانین کا نفاذ حکومتوں کی ذمہ داری ہوتی ہے جو اس کے لیے مختلف ادارے تشکیل دیتی ہیں۔ چنانچہ عدالتی نظام کی تشکیل کی بنیاد بھی یہی ہے کہ وہ قانون کے نفاذ کو یقینی بنا سکے۔

قانون کی تشکیل میں شفافیت اور معاشرہ کے مختلف طبقات یا ان کے نمائندوں کی شرکت، اس کی قبولیت اور اس پر عمل درآمد کے امکانات بڑھاتی ہے۔ تب یہ بھی یقینی ہوتا ہے کہ قانون معاشرہ کی اقدار اور روایات سے ہم آہنگ ہو جو کسی بھی اچھے قانون کی ایک اہم صفت ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بدلتے حالات میں ضرورت پیش آنے پر قانون میں تبدیلی کی جا سکے، اگرچہ ایک جامع قانون وہی ہوتا ہے جس میں آئے دن تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

انسانی زندگی کے دائرہ میں آنے والی وسعتوں اور تنوع نے اس ضرورت کو بھی اہم

کر دیا ہے کہ ہر قانون کی تشکیل کے وقت یہ اہتمام کیا جائے کہ وہ مجموعی طور پر دیگر تمام قوانین سے ہم آہنگ ہو۔ ان قوانین میں ملک میں مختلف سطحوں پر رائج قوانین ہی نہیں وہ عالمی قوانین بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کو کسی حکومت نے قبول کر لیا ہو۔ قانون سازی پر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو اس میدان میں انفرادی و گروہی مفادات کے ساتھ ساتھ طاقتور عناصر کی جانب سے لابنگ (Lobbying) اور خوف، لالچ اور دباؤ کے ہتھیار آج بھی بکثرت استعمال ہونے لگے ہیں۔

اس مجموعی تناظر میں قانون سازی کا عمل غیر معمولی توجہ اور احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ ان تقاضوں کو پورا کرنا ہو تو پہلا مرحلہ اہلیت کی بنیاد پر حقیقی نمائندگی اور قانون ساز اداروں کی تشکیل اور ان میں قانون سازی کے اصولی طریقۂ کار سے متعلق ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ محض طریقۂ کار کی موجودگی کافی نہیں ہے۔ اس طریقۂ کار پر اس کی حقیقی روح کے ساتھ عمل درآمد ہی وہ امکانات پیدا کرتا ہے کہ مذکوہ بالا صفات کے ساتھ مؤثر قانون سازی ہو سکے۔

اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو قانونی ڈھانچہ ہی نہیں پورا ریاستی نظام قرآن وسنت کی روشنی میں "مقاصد شریعۃ" کے حصول کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے جن میں دین اور ایمان کی حفاظت، انسانی جان اور عزت کی حفاظت، عقل کی حفاظت، نسل و نسب کی حفاظت اور مال کی حفاظت شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کی کسی بھی اجتماعیت کے لیے قانون سازی میں اس نکتہ کی کلیدی اہمیت بن جاتی ہے۔

پاکستان کے دستور پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں دی گئی راہنمائی (بالخصوص اس میں دیے گئے راہنما اصول) بحیثیت مجموعی مذکورہ نکات کا احاطہ تو کرتی ہے، تاہم عملی طور پر قانون سازی کا جائزہ لیا جائے تو صورت حال تکلیف دہ حد تک ابتر نظر آتی ہے۔ دوسری جانب کسی موضوع پر قانون سازی کا عمل مناسب انداز میں سرانجام دے بھی لیا جائے تو اس کے نفاذ کے عمل میں آنے والی کمزوریاں اور پیچیدگیاں اسے غیر مؤثر بنادیتی ہیں۔

'ارمغانِ خورشید' سیریز کی یہ دسویں پیشکش **"پالیسی، قانون سازی اور نظام: ابتری، تشخیص اور علاج"** مذکورہ سیاق وسباق میں پاکستان کی گزشتہ سالوں کی تاریخ کا جائزہ اور اس پر تبصرہ ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ آف پاکستان میں تقاریر پر مشتمل اس کتاب کے پہلے باب میں متعدد قوانین کے مسودات کی مثال دے کر واضح کیا گیا ہے کہ حکومت اور اس کے ذمہ داران ہی نہیں خود پارلیمنٹ کے ارکان کی غیر سنجیدگی کا بھی قانون سازی کی کمزوریوں اور اس پر عمل درآمد میں بڑا کردار ہے۔ اسی تسلسل میں دوسرا باب بالخصوص تحفظ نسواں قانون سے بحث کرتا ہے جو اضافی طور پر ان عالمی اثرات کی جانب اشارہ کرتا ہے جن کی بنیاد پر بنائے گئے قوانین معاشرتی و نظریاتی اقدار سے متصادم ہونے کی بناء پر عمومی قبولیت اور احترام سے محروم رہتے ہیں۔

اگلے تین ابواب میں قدرتی آفات، انسانی جان کی حفاظت اور امن وامان کی صورت حال کے تناظر میں متعدد عنوانات پر مبنی قانون سازی اور عمل درآمد کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ قدرتی آفات ہی نہیں، بظاہر لاپروائی اور چھوٹے چھوٹے حادثات اور واقعات کے پس منظر میں قانون سازی اور اداروں کی کمزوریاں کس طرح انسانی جانوں کی ہلاکت کا سبب بنتی ہیں اور ان کے تدارک کے لیے کیا ہونا چاہیے، یہ ان مباحث کا اہم عنوان ہے۔

چھٹا باب سرکاری ملازمتوں میں میرٹ کی خلاف ورزی اور ناانصافی پر مبنی ان امتیازی فیصلوں سے متعلق ہے جو فی الاصل گروہی یا مختلف سیاسی مفادات کے پیش نظر کیے جاتے رہے ہیں۔ اس تسلسل میں ساتویں باب میں سفارت کاری کے دائرے میں سامنے آنے والے دو اہم واقعات پر تبصرہ ہے۔ آخری باب ذرائع ابلاغ کے طرز عمل اور ان کے حوالہ سے حکومتی طرز عمل سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں ذرائع ابلاغ کی آزادی اور اس کی حدود پر قابل قدر بحث موجود ہے۔

قانون کی دنیا بے حد وسیع ہے۔ درحقیقت زندگی کا کوئی دائرہ اس سے باہر نہیں ہوتا۔ "پالیسی، قانون سازی اور نظام" قانون کی کوئی روایتی کتاب نہیں ہے۔ یہ روزمرہ زندگی میں

سامنے آنے والے انفرادی واجتماعی مسائل کی روشنی میں قانون کی تشکیل سے لے کر عمل درآمد تک کے مراحل سے بحث کرتی ہے۔

ایسے میں یہ پیشکش پیشہ ور ماہرین کے لیے ہی نہیں، قانون، مطالعہ پاکستان اور سیاسیات وسماجیات کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بھی ایک اہم مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

'ارمغان خورشید' کی موجودہ سیریز کی یہ آخری کتاب بھی حسب سابق ایک ٹیم ورک کا نتیجہ ہے۔ وہ تمام ساتھی جنہوں نے اس کام کے مختلف مراحل میں کردار ادا کیا ہے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔

خالد رحمٰن

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز-اسلام آباد

باب نمبر ۱

قانون سازی اور اس پر عملدرآمد (۱)

غیر سنجیدہ حکومتی طرزِ عمل

قانون سازی ایک نہایت سنجیدہ کام ہے۔ اس کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ خود ان اداروں سے متعلق ہو جو قانون پر عملدرآمد کے ذمہ دار ہوں۔ اس تناظر میں پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ آف پاکستان میں زیرِ نظر تقاریر عدالتی و قانونی امور پر سامنے آنے والی قانون سازی پر بحث کا جزو ہیں۔ مختلف مواقع پر کی گئی ان تقاریر میں جہاں مجوزہ قانون یا ترمیم پر اظہار خیال کیا گیا ہے وہیں خود قانون سازی کے طریقۂ کار اور پیش کردہ مسودات قانون میں کمزوریوں اور لاپروائی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

اسلام آباد ہائی کورٹ کے قیام کا قانون[1]

جناب چیئرمین! جہاں تک اس بل کا تعلق ہے، یہ بہت ضروری تھا اور اسی بنا پر ۱۸ویں ترمیم میں اس کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ ہم خیر مقدم کرتے ہیں کہ وزارتِ قانون نے

---

[1] جنرل پرویز مشرف نے ۱۴ اگست ۲۰۰۷ء کو ایک صدارتی حکم کے ذریعے اسلام آباد ہائی کورٹ قائم کی تھی۔ تاہم سپریم کورٹ نے جولائی ۲۰۰۹ء میں ایک آئینی درخواست پر فیصلہ سناتے ہوئے اسلام آباد ہائی کورٹ کو کام کرنے سے روک دیا۔

جنرل پرویز مشرف کی حکومت کے خاتمے کے بعد قائم ہونے والی پارلیمنٹ نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی بحالی اور اس میں مزید بہتری کے لیے ۲۰۱۰ء میں ۱۸ویں ترمیم کی منظوری دی۔ اس ترمیم کا ایک لازمی تقاضا وفاقی دارالحکومت میں ہائی کورٹ کا قیام تھا۔ قبل ازیں وفاقی علاقوں کے رہائشیوں کو اپنے مقدمات ضلعی عدالتوں کے بعد لاہور ہائی کورٹ میں لے جانا پڑتے تھے۔ اس معاملے کو درست کرنے کے لیے اسلام آباد ہائی کورٹ کے قیام کا قانون پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ پروفیسر خورشید احمد کی زیرِ نظر تقریر اسی موقع کی ہے۔

اس کو ترجیح دی ہے لیکن مجھے بڑی تکلیف سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ میرے بیس سالہ پارلیمانی کیریئر میں کسی بل کی ڈرافٹنگ میں اس سے زیادہ غیر ذمہ داری میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ اس لیے میں زور دے کر کہوں گا کہ ہمیں قانون سازی کے معاملات کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے اور اس ضمن میں قواعد اور روایت، دونوں کا پاس بہت ضروری ہے۔ میں کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہتا اس لیے کہ وزارتِ قانون بھی اور قومی اسمبلی بھی، دونوں بہت محترم ہیں لیکن جنابِ والا! اس بل کا ابتدائیہ آپ دیکھیے کہ:

> ”اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں ۱۸ویں ترمیم ایکٹ ۲۰۱۰ء کی ترمیم کے بعد آرٹیکل ۱۷۵ کے مطابق“

کوئی بھی ترمیم منظور ہونے کے بعد دستور کا حصہ بن جاتی ہے۔ مجوزہ قانون کے مسودہ میں اس ترمیم کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی کہ:

> ”جیسا کہ آئین کے آرٹیکل ۱۷۵ کے مطابق...“

دوسری چیز جنابِ والا! تصوراتی ہے۔ وزیر محترم اس کمیٹی کے ممبر تھے جہاں یہ تجویز آئی تھی چنانچہ اس وقت بھی ہم نے تفصیلی گفتگو کی تھی اور واضح کیا تھا کہ یہ وفاقی عدالت (فیڈرل کورٹ) نہیں ہے۔ اس کا تصور یہ ہے کہ چونکہ وفاقی علاقہ اپنا جداگانہ وجود رکھتا ہے اور چاروں صوبوں کی ہائی کورٹس موجود ہیں، اس لیے وفاقی علاقے میں بھی ایک عدالت ہونی چاہیے، فیڈرل کورٹ نہیں لیکن اس پورے قانون میں تصور فیڈرل کورٹ کا ہے، جو بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ کمیٹی نے جو سفارش کی ہے وہ اس بنیاد پر میری نگاہ میں صریحاً دستور کو بائی پاس کرنا ہے، اسے نظر انداز کرنا اور اس سے انحراف کرنا ہے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وزارتِ قانون، جو ان سارے معاملات میں شریک تھی، وہ اتنی بڑی غلطی کرے گی۔ آپ دیکھیے کہ اس میں یہ بات کہی گئی ہے:

> شق ۳، ”اسلام آباد ہائی کورٹ:- اسلام آباد ہائی کورٹ ایک چیف جسٹس اور چھ

دیگر ججوں پر مشتمل ہوگی جو ہر صوبے سے اور ایک اسلام آباد کے علاقے سے، اور ایک وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں سے مقرر کیے جائیں گے۔ چیف جسٹس کا تقرر اسلام آباد کے علاقے، صوبوں اور وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں سے باری باری کیا جائے گا"۔

جنابِ والا! یہ اس تصور کے بالکل برعکس ہے۔ بلاشبہ ہم نے اپنی سفارشات میں یہ بات کہی ہے کہ چونکہ یہ فیڈرل ایریا ہے، یہاں سب صوبوں کے لوگ رہتے ہیں، اس لیے ان تمام چیزوں کو تقرری کے موقع پر زیرِ غور لایا جائے گا لیکن قانون میں اسے اس طریقے سے لانا نہ خواہش تھی، نہ ہی اس ارادے سے مطابقت رکھتا ہے۔

دوسری بات جناب! اس میں کہا گیا ہے کہ چیف جسٹس کی تقرری روٹیشن کے ذریعے ہوگی۔ یہ آئین کے آرٹیکل ۱۷۵ سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ جو تجاویز دی گئی ہیں اور جو اب دستور کا حصہ ہیں، اس میں یہ ہے کہ سینئر ترین جج چیف جسٹس ہوگا۔ روٹیشن کا تصور کہاں سے آگیا؟ آپ دستور کے خلاف ایک قانون لا رہے ہیں اور یہ وزارتِ قانون کی جانب سے آرہا ہے، میں اس پر تعجب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا! جنابِ والا! آگے کہا جارہا ہے کہ اسلام آباد ہائی کورٹ کی پرنسپل سیٹ اسلام آباد میں ہوگی کیا اسلام آباد کے علاوہ کوئی اور سیٹ بھی ہوگی؟ یہ واحد ایک سیٹ اسلام آباد کی ہے۔ اگر ایک ہی ہے تو یہ پرنسپل سیٹ کہاں سے دستور میں آگئی۔

جناب چیئرمین! اور آگے بڑھیے۔ جو چیزیں انتظامی نوعیت کی ہوتی ہیں، ان کو قانون میں اکثر نہیں لیا جاتا لیکن آپ دیکھیے کہ:

"اسلام آباد کیپٹل ٹیریٹری میں ایسی علاقائی حدود کے ساتھ دو سیشن ڈویژنز ہوں گے جن کا تعین سرکاری گزٹ میں نوٹیفکیشن کے ذریعے کیا جاسکتا ہے"۔

میری نگاہ میں دو ہوں، ایک ہو، پانچ ہوں، یہ انتظامی معاملہ ہے۔ قانون میں اس طرح ہونا چاہیے کہ Sessions Divisions ہوں لیکن ان کی تعداد مقرر کر دینا اور

قانون کا حصہ بنا دینا، میری نگاہ میں یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ ایک اور عجیب و غریب شق ۱۲ میں ملتی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ:

”قوانین کو اپنانے کا اختیار:- اسلام آباد کیپٹل ٹیریٹری سے متعلق کسی بھی قانون کے اطلاق میں سہولت فراہم کرنے کے مقصد سے، وفاقی حکومت، تقرری کی تاریخ سے دو سال کی میعاد ختم ہونے سے پہلے، حکم کے ذریعے قانون میں ایسی موافقت اور ترمیم کر سکتی ہے، چاہے منسوخی یا ترمیم کے ذریعے، جیسا کہ اس ایکٹ کی دفعات کو نافذ کرنے کے لیے ضروری یا مناسب ہو اور اس قانون کو مؤثر بنانے کے لیے اور ہر موافقت اور ترمیم سے مشروط تا آنکہ کسی مجاز مقننہ یا با اختیار اتھارٹی کے ذریعے ترمیم / تبدیل یا دہرایا جائے“۔

جنابِ والا! قانون سازی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قانون سازی پارلیمنٹ کرتی ہے۔ اس معاملہ میں انتظامیہ یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے کہ جس وقت بھی وہ چاہے، ایک آرڈر کے ذریعے، اس قانون میں جو اس کا دل چاہے ترمیم یا اضافہ کر دے اور وہ پارلیمنٹ میں آئے بغیر، دو سال تک قانون کا مقام حاصل کرے۔ جنابِ والا! پارلیمنٹ کو اپنا اختیار ختم نہیں کرنا چاہیے اور اس اختیار کو غصب کرنے کے لیے اس خطرناک راستہ کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ مشکلات ہوں تو انھیں دور کیا جائے اور یہ بالعموم قوانین میں ہوتا ہے لیکن قانون میں ترمیم و اضافہ قانون ساز اتھارٹی ہی کر سکتی ہے۔ چنانچہ دفعہ ۱۲ کا اس میں شامل کیا جانا، قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

جنابِ والا! ایک اور عجیب و غریب بات اس میں کی گئی ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ہر قانون اپنا ایک تشخص اور وجود رکھتا ہے۔ یہ تشخص اور وجود ایک مربوط کردار کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس میں جب اور جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کی روشنی میں ترمیمی بل کے ذریعے قانون میں ترمیم کی جاتی ہے۔ کوئی ایسا جامع قانون نہیں ہوتا کہ کسی ایک قانون میں آپ دوسرے قوانین کو ضم کر دیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس قانون میں یہ اختیار بھی حاصل کیا

گیا ہے۔ آرٹیکل ۱۴ کہتا ہے کہ:

ضابطہ فوجداری، ۱۸۹۸، سیکشن ۴ میں، شق (ج) میں لفظ ''صوبہ'' کے بعد ''اور اسلام آباد کے کیپٹل ٹیریٹری'' کے الفاظ شامل کیے جائیں گے۔

بلاشبہ یہ ضرور ہونا چاہیے۔ یہ قانون کا تقاضا ہے۔ جب آپ یہاں ایک عدالت قائم کر رہے ہیں تو اس کے لیے یہ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس ترمیم کو کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ضابطہ فوجداری کے اندر ترمیم لائیے۔ نہ کہ آپ اس قانون میں ترمیم لاکر، اس کے ذریعے کسی دوسرے قانون میں ترمیم کریں۔ یہی کھیل آگے کھیلا گیا ہے:

۱۹۷۰ کے پی-او نمبر ۸ کی ترمیم۔ ہائی کورٹس (اسٹیبلشمنٹ) آرڈر، ۱۹۷۰ (پی-او نمبر ۸، ۱۹۷۰) میں، آرٹیکل ۳ میں، شق (ون) میں، پیراگراف (بی) میں الفاظ ''اور اسلام آباد کیپٹل ٹیریٹری'' کو حذف کر دیا جائے گا۔

جنابِ والا! اس پر میرا بڑا سنجیدہ اعتراض ہے کہ آپ نے یہ نیا دروازہ کھولا ہے۔ ماضی میں یہ ہوا ہے کہ فنانس بل کو بیس بیس اور تیس تیس قوانین میں ترامیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اسی ایوان، سینیٹ نے متفقہ طور پر اور پیپلز پارٹی اور ہم نے مشترکہ طور پر ہمیشہ اس پر اعتراض کیا ہے، فنانس کمیٹی نے اعتراض کیا ہے کہ یہ طریقہ غلط ہے۔ آپ فنانس بل کی حد تک منظوری لیجیے لیکن انتظامی قوانین میں ترمیم کرنے کا طریقہ غلط ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب حکومت نے اس پر توجہ دی ہے اور پچھلے سال کے بجٹ میں تقریباً ۱۱، ۱۲ ایسے قوانین واپس کیے ہیں، جن کو اس مبہم دفعہ کی مدد سے ترمیم کیا جا رہا تھا۔ یہاں بھی اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر قانون کی ایک امتیازی خصوصیت ہے، آپ کو ترمیم کا حق ہے اور تینوں ترامیم صحیح اور ضروری ہیں لیکن غلط جگہ کی جا رہی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس پر فوراً نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے جو نکات اٹھائے ہیں ہم نے اپنی ترمیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ یہ قانون، قانون سازی پر

ایک بدنما داغ ہوگا اور ہم اس میں ہرگز پارٹی نہیں بننا چاہتے۔

جناب چیئرمین! میں نے وزیر قانون کی بات کو بہت غور سے سنا ہے ان کی پرنسپل سیٹ کی بات بالکل صحیح ہے[1]، اس لیے کہ دستور میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دوسری چیز جو ان کی صحیح ہے وہ یہ ہے کہ جو صدارتی حکم ہیں وہ تبدیل ہو سکتے ہیں، اس پر مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن جو میرا اعتراض ہے وہ یہ ہے۔ نمبر ایک، مجھ سے یہ متضاد بات منسوب کی گئی کہ میں نیشنل اسمبلی کی کسی حیثیت سے تحقیر کر رہا ہوں جبکہ وہ ہمارا محترم ادارہ ہے، اس کا بڑا کردار ہے لیکن اگر اسمبلی کسی معاملے میں کوئی کوتاہی کرتی ہے، کوئی غلطی کرتی ہے، کوئی خطا اس سے ہو جاتی ہے تو اس کی نشاندہی کی جاتی ہے اور کیا جانا چاہیے۔ ایوان بالا اسی لیے ہے کہ اگر قانون سازی وہاں شروع ہوئی ہے اور اس میں خامیاں رہ گئی ہیں تو ہم یہاں اس کی اصلاح کریں۔ یہ اس کی توہین نہیں ہے، یہ اس کی اصلاح ہے۔ اس معاملے میں آپ کوئی بھی اہم قانون لے کر دیکھ لیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک ہاؤس نے دوسرے ہاؤس کے معاملات کو تبدیل بھی کیا ہے اور میرے علم میں ایسے کیسز بھی ہیں کہ جس میں انہوں نے ایک ہاؤس میں جو خلاف ورزی ہے اس کو اپنے لیے ایک قانون کی خلاف ورزی قرار دیا ہے۔ May کی کتاب میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ میں نے اس سیاق میں بات کی ہے ورنہ نیشنل اسمبلی میرے لیے بہت محترم ہے اور سوال نہیں پیدا ہوتا کہ اس کے بارے میں کوئی غلط بات کی جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قانون کی شق ۳[2] میں جو چیز ہماری حکومت کی ایما پر اسمبلی نے پاس کی ہے وہ صریحی طور پر دستور کے خلاف ہے۔

---

[1] پروفیسر خورشید احمد نے اسلام آباد ہائی کورٹ کے قانون میں پرنسپل سیٹ کے الفاظ استعمال کیے جانے پر اپنی تقریر میں جو اعتراض کیا تھا اس کے جواب میں وزیر قانون جناب ظہیر الدین بابر اعوان نے وضاحت کی کہ ۱۸ویں ترمیم کے تحت آئین پاکستان میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے لیے پرنسپل سیٹ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے اسلام آباد ہائی کورٹ کے مجوزہ قانون میں آئین کی پیروی میں یہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس پر پروفیسر خورشید احمد نے اپنا اعتراض واپس لے لیا۔

[2] متن صفحہ نمبر ۲ پر موجود ہے۔

جہاں تک شق ۱۴ا کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ میرے تحفظات رہتے ہیں، مجھے اطمینان نہیں ہے اگرچہ وسیم سجاد بھی یہ بات کہہ رہے ہیں اور دوسروں کا بھی خیال ہے تو اس لیے میں زور نہیں دوں گا۔ حالانکہ جہاں تک ضابطہ فوجداری کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کسی دوسرے قانون کے ذریعہ ترمیم نہیں ہوسکتی اس کے لیے آپ وہاں ہی ترمیم لائیں۔ اس قانون کے ذریعے سے ضمنی تبدیلیاں کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان پوائنٹس پر میں اپنے مؤقف پر قائم ہوں صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ ایک الگ بل لائیں جس میں ضابطہ فوجداری میں متعلقہ کلاز کے اندر یہ تبدیلی تجویز ہو۔ ایسا ہوا تو ہم بھی ساتھ دیں گے۔ میرا یہ اعتراض طریقۂ کار پر ہے، متن پر نہیں ہے۔

میں آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہم پارلیمانی زندگی میں بڑی صحت مند روایت قائم کر رہے ہیں۔ یہ دونوں بڑے اہم قوانین تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں بڑے موٹے موٹے سقم رہ گئے ہیں لیکن آپ کے تعاون سے اور ہاؤس کے تعاون سے کمیٹی نے اس پر غور کیا اور ایک بار نہیں بلکہ تین تین، چار چار نشستیں پانچ پانچ، چھ چھ گھنٹے کے اندر کیں اور اس طریقے سے اب یہ ایک ترمیم شدہ شکل میں آگیا ہے۔ یہ بڑی اہم پیش رفت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس روایت کو ہم جاری رکھیں۔ اسی طریقے سے اس ملک میں قانون سازی پارلیمنٹ کے ذریعے سے ہوسکے گی اور آرڈیننس کی لعنت سے ہم نجات پاسکیں گے۔ (۱۳ مئی ۲۰۱۰ء)

قانون برائے انسانی حقوق کمیشن[۱]

جناب چیئرمین! جہاں تک اس بل کے مقاصد کا تعلق ہے، ان سے ہمیں پورا پورا اتفاق

---

۱ دنیا بھر میں انسانی حقوق کی بڑھتی ہوئی خلاف ورزیوں کے سبب اقوام متحدہ کی جانب سے تمام رکن ممالک کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ اپنے دائرہ کار میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے نمٹنے کے لیے ایک آزاد و خود مختار انسانی حقوق کمیشن قائم کریں۔ حکومت نے اس بین الاقوامی تقاضے کی تکمیل کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں آزاد انسانی حقوق کمیشن قائم کرنے کا قانون پیش کیا جسے قومی اسمبلی نے فوری طور پر متفقہ طور پر منظور کر لیا لیکن سینیٹ میں پروفیسر خورشید احمد اور دیگر سینیٹرز نے عمومی جائزے کے بعد مسودہ قانون میں کچھ تبدیلیاں تجویز کیں اور مجوزہ قانون کو تفصیلی غور اور جائزے کے لیے سینیٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی برائے قانون اور انسانی حقوق کو بھیجنے کی سفارش کی جسے منظور کر لیا گیا۔

ہے۔ ملک کے تقریباً سب ہی حصوں میں لیکن خاص طور پر بلوچستان، کراچی، خیبر پختونخوا اور پنجاب کے کچھ علاقوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی جو حالت ہے اس پر یقیناً فوری توجہ دینی چاہیے۔ جو انتظام اس وقت ہے اسے بھی اور مؤثر بنانے کی ضرورت ہے۔ بلا شبہ دستور کے تحت عدالتوں کو اس معاملے میں از خود نوٹس کا اختیار بھی حاصل ہے اور عدالتوں نے اس پر عمل بھی کیا ہے، جس کی ہم تحسین کرتے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے مسئلے کی شدت کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کوئی آزاد کمیشن بنایا جاتا ہے تو کم از کم اس کے تصور کی حد تک میں پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ البتہ دو باتوں کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ یہ ادارہ افسر شاہی کا ایک اور شعبہ نہ بن جائے۔ لوگوں کو کھپانا اور اس کی بناء پر ملکی خزانے پر بوجھ کے ایسے کئی تجربات کر کے ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں بچنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو۔

دوسری چیز سیاسی ہے۔ اسے حقیقت میں آزاد ہونا چاہیے اور اس میں ایسے ایماندار افراد ہونے چاہییں جو سیاسی وابستگی سے بالا ہوں۔ ہمارا دستور، بین الاقوامی اور اسلامی قانون اور نبی پاک ﷺ کے الوداعی خطبے سے بڑا انسانی حقوق کا چارٹر اور کون سا ہو سکتا ہے، یہ ہمارے لیے راہنما اصول ہیں۔ ہمارے دستور میں بھی ان حقوق کو قانون کی ان دفعات کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ادارہ کے قیام کے حوالہ سے ان دو باتوں کی حفاظت کرنے کی ضرورت ہے۔

مجوزہ قانون میں نے جب پڑھا تو اس میں مجھے یہ بات پسند آئی کہ تقرریوں کے سلسلے میں قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کی مشاورت رکھی گئی ہے جیسا کہ ۱۸ویں ترمیم میں کئی اور اہم اداروں کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کے لیے پارلیمانی کمیٹی کو مرکز بنایا گیا ہے، وہ بھی میرے خیال میں صحیح ہے۔ آپ نے اس کے لیے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو ہم نے ۱۸ویں ترمیم میں کیا ہے یعنی حزب اقتدار و حزب اختلاف سے برابر برابر اور قومی اسمبلی اور سینیٹ سے دو تہائی اور ایک تہائی ارکان یہ تمام چیزیں میری نگاہ میں مناسب ہیں لیکن جو چیز میرے لیے بہت حیران کن ہے، وہ ہے تقرریوں کا طریقہ۔

اس میں پہلی بات یہ کی گئی ہے کہ:

تقرری: وفاقی حکومت، پبلک نوٹس کے ذریعے، کمیشن کے چیئرپرسن اور ممبران کی تقرری کے لیے موزوں افراد کے بارے میں تجاویز طلب کرے گی اور مناسب جانچ پڑتال کے بعد، ان افراد کی فہرست وزیراعظم اور قومی اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف کو پیش کرے گی۔

یہ عجیب و غریب معاملہ ہے کہ آپ کہیں کہ لوگ خود درخواست دیں یا دوسرے لوگوں کے نام دیں کس بنیاد پر دیں اس کے لیے آپ نے کوئی معیار مقرر نہیں کیا۔ معیار کے سلسلہ میں محض یہ کہا گیا ہے کہ:

"کمیشن کے رکن کی عمر ۳۰ سال سے کم نہ ہو گی اور اسے انسانی حقوق سے متعلق علم اور تجربہ ہو گا"۔

یہ کتنی مبہم چیز ہے۔ آپ اتنا اہم ادارہ بنا رہے ہیں، اس کو وہ سارے اختیارات دے رہے ہیں جو عدلیہ کو حاصل ہوتے ہیں اور آپ اس کے بعد تعلیمی قابلیت اور تقرری کے طریقۂ کار کو اتنا مبہم رکھتے ہیں۔ میری نگاہ میں اس کی مکمل جانچ پڑتال کی ضرورت ہے۔ جناب چیئرمین! میں تجویز دوں گا کہ آپ نے جس طرح ماضی میں کیا ہے اور ہم نے حکومت سے تعاون کیا، اس بل کو قانون کی کمیٹی کے حوالے کیا جائے اور انسانی حقوق کمیٹی کے ارکان اس میں شریک ہوں تاکہ قانون اور انسانی حقوق کی دونوں کمیٹیاں اس کی توثیق کریں، اس میں جو خامیاں ہیں، ان کو دور کریں، اور غور کریں کہ اس میں جو مقاصد رکھے گئے ہیں، وہ کس طرح حاصل کیے جاسکتے ہیں، اس کے بعد اس کو یہاں پر لایا جائے۔ جو مقاصد آپ کے سامنے ہیں، ہم ان مقاصد کو اسی صورت میں ممکنہ حد تک حاصل کر سکیں گے۔ (۲۵ جنوری ۲۰۱۲ء)

جیل خانہ جات کے قانون میں ترمیم[1]

جناب چیئرمین! سب سے پہلے میں وزیر قانون کے اس رویے خیر مقدم کرتا ہوں کہ قانون میں تبدیلی کے لیے انہوں نے آرڈیننس کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ہاؤس میں آنے کا راستہ اختیار کیا۔ یہ ماضی کے تجربے سے مختلف ہے اور ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ ہم یہی توقع رکھتے ہیں کہ آپ قانون سازی کا عمومی راستہ اختیار کریں گے۔ آرڈیننس کا جو شارٹ کٹ ہے وہ غیر معمولی ہنگامی صورتحال میں تو شاید گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن عام قانون سازی کے لیے صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک ریت سی قائم ہو گئی ہے کہ جس قانون کو بدلنا چاہیں اس میں تبدیلی کا قانونی طریقہ اختیار کرنے کی بجائے دوسرے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ جیسا کہ بجٹ کی منظوری کو پچھلے پانچ، چھ سال سے بڑے پیمانے پر قانون سازی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت یہ ترمیم جیلوں کے قوانین وضوابط کا مسئلہ ہے اور اس کی اصلاح ترمیم کے لیے معمول کے طریقۂ کار کے مطابق ہونی چاہیے۔ میں چاہوں گا کہ وزیر قانون اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں اور ایک بہتر چیز لے کر آئیں۔ جہاں تک اصل مسئلے کا تعلق ہے تو اس میں، میں صرف تین باتیں کہنا چاہتا ہوں:

۱۔ملزم اور مجرم کا فرق: پہلی بات یہ کہ جس طرح میرے اور ساتھیوں نے بھی کہا کہ قاتل

---

[1] پیپلز پارٹی کی حکومت نے ۴ ستمبر ۲۰۰۸ء کو سینیٹ آف پاکستان میں ضابطہ فوجداری ۲۰۰۸ء میں ایک ترمیم تجویز کی جس کے مطابق کسی قاتل کو نچلی عدالت سے سزائے موت ہونے کے باوجود اس کی سزا ہائی کورٹ سے کنفرم ہونے تک موت کی کوٹھری میں نہ رکھا جائے۔ اس ترمیم پر بحث کے دوران عمومی طور پر سینیٹ کے اراکین نے توجہ دلائی کہ یہ معاملہ جیل خانہ جات کے قانون یا جیل کے قواعد سے متعلق ہے یہ ترمیم ضابطہ فوجداری کے بجائے جیل خانہ جات کے قانون میں ہونی چاہیے تھی جبکہ بعض ممبران کا خیال تھا کہ اس ترمیم میں سزائے موت کی ہائی کورٹ سے توثیق کی شرط نچلی عدالتوں پر عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ دیگر اراکین کے مطابق سزائے موت کے قیدی کو موت کی کوٹھری میں رکھنے کا مقصد خود اس کا اور دیگر قیدیوں کا تحفظ مطلوب ہے کہ وہ خود اپنے آپ یا دوسروں کو نقصان نہ پہنچائے۔ بحث کے نتیجے میں وزیر قانون نے اراکین سینیٹ کی تجاویز کی روشنی میں مجوزہ ترمیم پر غور ملتوی کرنے کی مہلت چاہی تا کہ ترمیم کو ضروری اصلاح کے بعد پیش کیا جائے۔

اس وقت تک جب تک جرم ثابت نہیں ہوتا، صرف ملزم رہتا ہے۔ اور اس حد تک جب تک کہ اپیل میں فیصلہ نہ ہو جائے آپ اس کو مجرم نہ سمجھیں اس سے قبل اسے مجرم کا مقام دینا صحیح نہیں ہے۔

یہاں ہمارے ساتھی خالد رانجھا صاحب نے اس سلسلہ میں ایک مثال دی ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں اسی حوالہ سے اپنا ذاتی تجربہ عرض کروں۔ ۱۹۶۴ء میں جب جنرل ایوب (چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر / صدرِ پاکستان) نے جماعت اسلامی پر سیاسی پابندیاں لگائیں تو میں بھی ان افراد میں سے تھا جن کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ دہشت زدہ کرنے کے لیے اس موقع پر ہمیں ۲۴ گھنٹے سزائے موت کے کمرے میں رکھا گیا۔ اس تجربہ کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ در حقیقت اس سے زیادہ انسانیت کش رویہ نہیں ہو سکتا، وہاں نہ کوئی سہولت ہے اور نہ ہی یہ جگہ انسانوں کے رہنے کے قابل ہے۔ ہمیں انسانوں کے ساتھ انسانوں والا معاملہ کرنا چاہیے۔ اور یہ یقینی بنانا چاہیے کہ اگر کوئی مجرم ہے تب بھی وہ سزا سے اپنے انجام کو پہنچے۔ میری نگاہ میں اس کے علاوہ اذیت پہنچانے کے اقدامات کی حیثیت ایک تشدد کی ہے اور یہ تشدد ختم ہونا چاہیے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب تک کہ ملزم مجرم ثابت نہ ہو جائے، اس کے ساتھ جیل میں رویہ تبدیل ہونا چاہیے۔

۲۔ سیکورٹی کا مسئلہ: سینیٹر وسیم سجاد نے جائز توجہ دلائی کہ سیکورٹی کا مسئلہ جیل میں بھی اہمیت رکھتا ہے، اس کے لیے مناسب انتظام ہونا چاہیے لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آپ ملزم کو غیر انسانی تشدد کے سیل میں ڈال دیں۔ اس کا حق ہے کہ اسے سزا ملے لیکن جب تک سزا نہیں ملتی اس وقت تک اس سے انسانوں جیسا معاملہ کیجیے، جانوروں والا معاملہ نہ کیجیے۔

۳۔ تفتیش کا مرحلہ: میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس قانون میں اس حقیقت کا احاطہ نہیں کیا گیا کہ ہمارا اصل مسئلہ انصاف میں تاخیر ہے۔ تفتیش کا مرحلہ ہے تو اس میں تاخیر بد دیانتی بھی ہے اور بد انتظامی بھی۔ اس ضمن میں برادریوں اور دیگر وجوہات کی بناء پر جھوٹی گواہیوں کا معاملہ بھی ہے۔ اس کے بعد پھر مقدمات کی سماعت میں التواء مہینوں نہیں سالوں

ہوتا ہے، سول معاملات میں بھی اور فوجداری معاملات میں بھی۔ انگلستان میں، میں نے یہ دیکھا کہ مقدمہ شروع ہونے کے بعد وکلاء اور تحقیقاتی اداروں کو ایک وقت دے دیا جاتا ہے۔ لیکن جب مقدمہ شروع ہوتا ہے تو پھر اسے ختم کرتے ہیں، یہ نہیں ہوتا ہے کہ ٹکڑوں میں سماعت کر کے آپ برسوں مقدمے کو لٹکائے رکھیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات آنی چاہیے اور اس سلسلے میں سینیٹر بھنڈر صاحب کی جو تجویز مقدمہ کی مدت کے تعین کے سلسلے میں ہے وہ اگر اس شکل میں قبول نہ بھی کی جائے تو کہیں نہ کہیں اس کو بات کو شامل کیا جانا چاہیے کہ اگر کسی متعین مدت میں جرم ثابت نہیں ہوتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ متعلقہ فرد مجرم نہیں۔ اس کا تجربہ ہم میں سے بہت سوں نے خود بھی کیا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ ملزم ہی نہیں اصل مجرموں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ متعین وقت میں تفتیش کا معاملہ مکمل ہو جائے اور یہ لامتناہی سلسلہ نہ ہو۔

جنابِ والا! اگر اس قانون کو واپس لے کر نظر ثانی کی جائے اور صحیح شکل میں دوبارہ لے آیا جائے تو ہم اس کی مکمل تائید کریں گے۔ ہم اس کوشش کو سراہتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ انسانی ہمدردی ملزمان کے ساتھ بھی ہونی چاہیے، اس کی انہوں نے فکر کی ہے، یہ قابل قدر ہے۔ رہا معاملہ سزائے موت کا تو وہ بہر حال اسلامی تناظر اور آج کے لادینی تناظر میں مختلف ہے، اسلام میں سزائے موت دینے کی کھلی آزادی نہیں لیکن چند جرائم ایسے ہیں کہ ان جرائم کی سزا قطعی ہے اور وہاں سزائے موت ضرور دینی چاہیے، اس میں ترمیم کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ (۴ ستمبر ۲۰۰۸ء)

عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار، ججوں کی کمی

جنابِ والا! تعزیری نظام انصاف، تفتیش، مقدمہ اور عدالت کا نام ہے۔ کل ہی زیرِ التوا مقدمات کے حوالہ سے جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ملک میں پچھلے دس سال میں جو کیسز رجسٹر کیے

گئے ہیں ان میں سے دس فیصد سے بھی کم پر عدالتی کارروائی ہوئی [1]۔ اگر ان مقدمات میں ملوث ملزمان کو آپ نے غلط گرفتار کیا تو یہ نوے فیصد سے زیادہ معصوم انسان جنہیں آپ نے جیلوں میں ڈالا، اس کی کون جواب دہی کرے گا۔ ان کی آزادی، ان کا خاندان اور ملک اور معاشرہ کو کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ دوسری جانب اگر وہ مجرم تھے تو اس سے بڑا ظلم کیا ہو گا کہ آپ دس سال کے اندر دس فیصد سے کم کو عدالتی انصاف دے سکے ہیں۔ جنابِ والا! یہ بڑے سنجیدہ مسائل ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ حکومت اور اپوزیشن، پارلیمنٹ کے دونوں ایوان اور عدلیہ ان کی اہمیت کو محسوس کریں اور اس کا سیاسی حل نکالیں۔

جنابِ والا! میں یہ کہوں گا کہ جرائم اور لاقانونیت کی وجوہات کو سیاسی، معاشی اور تاریخی اعتبار سے جانچے بغیر دیرپا تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس لیے اس آگ کو فوری ٹھنڈا کرنے کے لیے جو اقدامات آپ کرنا چاہتے ہیں وہ ضرور کریں لیکن خدا کے لیے کچھ وقت آپ اس بات کے لیے بھی دیں کہ بنیادی اقدار کیوں متاثر ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں جب تک آپ معاشی پالیسی نہیں بدلتے، جب تک آپ سیاست کو دستور اور قانون کے تابع نہیں کرتے، جب تک ہر ادارہ اپنے دائرے کے اندر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کا اپنے آپ کو پابند نہ کرے اور دوسروں پر اثر اندازی کی کوشش ترک نہ کرے تو صورتِ حال بہتر نہ ہو سکے گی۔ کل میں یہ مسئلہ اٹھا چکا ہوں اور آج میڈیا میں بھی یہ بات آئی ہے یہ بڑا سنجیدہ مسئلہ ہے۔ در حقیقت عدلیہ کو بہت بڑی جدوجہد کے بعد ایک مقام ملا ہے اگر آپ اس کے تقاضے پورے نہیں کر رہے تو آپ اس ملک کو تصادم کی طرف لے جا رہے ہیں یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دستور اور قانون کی پاسداری اور معاشی، سیاسی اور ثقافتی اسباب کے ساتھ ساتھ جو لسانی اور فرقہ وارانہ معاملات ہیں ہمیں ان پر ہمہ پہلو اور جامع انداز میں توجہ دینا ہو گی (۱۲ فروری ۲۰۱۰ء)

[1] صورتِ حال میں اب بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جیو ٹی وی چینل کی ایک رپورٹ ۱۸ جون ۲۰۲۱ء کے مطابق پاکستان میں زیرِ التوا، مقدمات کی اس وقت تعداد ۲۱ لاکھ ۵۹ ہزار چھ سو پچپن ہے جبکہ ججوں کی تعداد ۳۰۶۷ ہے۔ پاکستان کی ضلعی اور اعلیٰ عدالتوں میں ججوں کی ۱۰۴۸ آسامیاں خالی ہیں۔ صرف سپریم کورٹ میں ۵۱۱۳۸ مقدمات زیرِ التوا ہیں جبکہ ججوں کی تعداد محض ۱۷ ہے اور وہاں دو آسامیاں خالی ہیں۔

عدالتوں میں ججوں کی تقرریاں

جناب چیئرمین ! اس وقت عدلیہ میں لاکھوں مقدمات رُکے ہوئے ہیں۔ دوسری جانب پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور سپریم کورٹ پانچوں مقامات پر آسامیاں خالی ہیں۔ آسامیوں کے بارے میں سفارشات اخباری اطلاعات کی حد تک معلوم ہوتا ہے کہ دی جاچکی ہیں اور آپ کو یاد ہوگا کہ ججز کے مقدمے میں یہ اصول بھی طے ہوا تھا کہ جو آسامیاں خالی ہوں، ان کو ایک مہینے کے اندر پُر ہو جانا چاہیے[1]۔ لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ مہینوں گزر گئے ہیں اور میری اطلاع کی حد تک صوبوں سے جو سفارشات، گورنروں کو یا دوسرے متعلقہ افراد کو پہنچی ہیں اس میں چھ سے نو ہفتے تک کا وقت گزر چکا ہے لیکن ابھی تک یہ تقرریاں نہیں ہوئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عدلیہ کے ساتھ زیادتی ہے اور عدلیہ کی آزادی کی جو تحریک چلی تھی، اس کو منتشر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ حکومت کو اس معاملے میں اپنا رویہ تبدیل کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں فوری طور پر مداخلت کرنے کی ضرورت ہے۔ سینیٹ مطالبہ کرے، وزیر اعظم مداخلت کریں اور ۴۸ گھنٹوں کے اندر یہ آسامیاں پُر ہونی چاہییں۔ ورنہ ہم توہین عدالت کے بھی عملاً مرتکب ہو رہے ہیں اور عدالتی نظام کو بہت ہی شدید ضرب لگا رہے ہیں۔ (۱۱ فروری ۲۰۱۰ء)

بار کونسل ایکٹ[2]

دو باتوں کی نشاندہی کرنا بے حد ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو اصل قانون تھا،

---

[1] (PLD 1996 Supereme Court 324)

[2] پاکستان بار کونسل ایکٹ ۱۹۷۳ء جس میں پاکستان بار کونسل ترمیمی ایکٹ ۲۰۱۱ء کے ذریعے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ جہاں مناسب سمجھیں اپنے اپنے دائرہ اختیار میں صوبائی، ضلعی و تحصیل سطح پر بار کونسلوں اور بار ایسوسی ایشنز کو بلالحاظ ممبران کی تعداد مالی امداد دے سکتی ہیں تاکہ وہ اپنے دفاتر کے ساتھ لائبریری، وکلاء اور سائلین کے بیٹھنے کی جگہ اور فرنیچر اور دیگر اخراجات پورے کر سکیں۔ ۱۹۷۳ء کے قانون کے مطابق وفاقی اور صوبائی حکومتیں صرف بار کونسلوں کو ان کے ممبران کی تعداد کے مطابق مالی امداد دے سکتی تھیں اس ترمیم کے ذریعے نہ صرف بار ایسوسی ایشنوں کو اس میں شامل کیا گیا بلکہ ممبران کی تعداد کی شرط بھی ختم کر دی گئی۔

اس میں لکھا ہوا تھا کہ:

> پاکستان بار کونسل کے معاملے میں وفاقی حکومت اور صوبائی بار کونسل کے معاملے میں صوبائی حکومت جیسے مناسب سمجھے بار کونسل کے رجسٹرڈ ممبران کی تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے بار کونسل کو امدادی رقم / فنڈز دے سکتی ہے۔

اب اس کو تبدیل کر کے یہ کیا گیا ہے کہ:

> وفاقی حکومت اور صوبائی حکومت پاکستان بار کونسل، صوبائی بار کونسل اور بار ایسوسی ایشنز کو جیسے مناسب سمجھے امدادی رقم دے سکتی ہے۔

جنابِ والا! میں اس ضمن میں دو چیزوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ ہے کہ اصل قانون میں ایک بڑا اہم نکتہ یہ تھا کہ جو امداد دیں گے، وہ بار کونسلز کے ممبران کی تعداد کو سامنے رکھ کر دیں گے۔ یہ ایک واضح معیار تھا جس سے اقربا پروری کو روکا جا سکتا تھا اور ایک بامقصد نشاندہی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس ہدایت کو کیوں نکالا گیا ہے؟ اس لیے کہ اس کی وجہ سے اقربا پروری کا دروازہ کھل جائے گا۔ آپ جس کونسل کو نوازنا چاہیں گے، جتنا چاہیں، اس کو دے دیں گے اور یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ حال ہی میں اس سلسلے میں خاصی فیاضی دکھائی بھی گئی ہے۔ اس بناء پر اس کا حذف کرنا ایک بڑی غلطی ہے، اس کو اصل قانون میں شامل ہونا چاہیے۔

جنابِ والا! آج تک جو قانون نافذ ہے، اس کی رو سے وفاقی حکومت پاکستان بار کونسل کو گرانٹ دے سکتی ہے، صوبائی حکومتیں، صوبائی بار کونسلز کو امداد دے سکتی ہیں۔ اب ایک طرف اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کی بات ہو رہی ہے، اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ صوبوں کے پاس زیادہ اختیارات ہوں اور ان کو آزادی ہو لیکن دوسری طرف مرکزی حکومت یہ اختیار لے رہی ہے کہ صرف پاکستان بار کونسل نہیں بلکہ صوبائی بار کونسلوں اور اس سے آگے بڑھ کر مختلف صوبائی بار ایسوسی ایشنز کو بھی مدد دے سکتی ہے،

اس سے مداخلت اور جوڑ توڑ کا دروازہ کھلے گا۔ یہاں پر ایک اور بھی نکتہ بہت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جو قانون اس وقت نافذ ہے، اس کی رو سے جس طرح وزارتِ قانون کو پچھلے دنوں ڈاکٹر بابر اعوان نے گرانٹس کی مد میں چیک دیے ہیں[1]، وہ قانون کے تحت اس کے مجاز نہیں ہیں۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ آڈیٹر جنرل نے اس پر اعتراض اٹھایا ہے اور اس پر پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی میٹنگ بھی متوقع ہے۔ تاہم اس ترمیم کے ذریعے یہ چاہ رہے ہیں کہ کم از کم آئندہ کے لیے مرکزی حکومت کو یہ اختیار مل جائے۔ جس کے معنی ہوئے کہ جو کچھ کیا گیا ہے، وہ اگرچہ غیر قانونی تھا اور غیر قانونی رہے گا لیکن یہ اختیار آئندہ کے لیے استعمال ہو سکے۔ میں اس بناء پر سمجھتا ہوں کہ یہ قانون مناسب نہیں ہے اس پر نظر ثانی کی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں کم از کم دو ترامیم کی جائیں۔ اس صورت میں ہم اس کی حمایت کریں گے۔ ایک جس طرح ایس ایم ظفر نے متوجہ کیا کہ اس کو لازماً گرانٹس کے باقاعدہ نظام کے تحت ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ بہت ضروری ہے کہ بار کے ممبران کی تعداد کے مطابق گرانٹ ہو تاکہ دوسرا معیار بھی یہاں پر واضح رہے۔ ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہیے کہ شفاف ہو اور سسٹم کے مطابق ہو۔ ممبران کی تعداد بھی اہم ہے، اس کے علاوہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ایک سسٹم بنائیے اور اس کی روشنی میں یہ کام کیجیے۔ بلاشبہ قانون کے شعبہ میں نچلی سطح تک ہمیں مدد دینی چاہیے اور زیادہ دینی چاہیے لیکن اسے ایک سسٹم کے تحت ہونا چاہیے۔ ہمارا مدعا یہ ہے، ہم بل کے مقصد کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں، ہم صرف بتا رہے ہیں کہ صحیح طریقہ کیا ہے تاکہ اس کو بدعنوانی، سیاسی مداخلت اور سازباز سے بچایا جا سکے۔ (۱۲ مئی ۲۰۱۱ء)

---

[1] پیپلز پارٹی کے دور حکومت ۱۳-۲۰۰۸ء میں اس وقت کے وزیر قانون ڈاکٹر بابر اعوان نے ۷۷ کروڑ ۲۴ لاکھ روپے ۱۳۲ ضلعی بار ایسوسی ایشنوں میں امدادی رقوم کے چیک تقسیم کیے۔ اس کا مقصد حکومت پر وکلاء کے دباؤ کو کم کرنا تھا۔

سماجی تحفظ کا آئینی حق[1]

سماجی تحفظ .... یہ ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں کے اندر بھی ہے اور مسلسل ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا کوئی اثر حکمرانی کے مجموعی انداز پر نہیں ہوا، بلاشبہ موجودہ حکومت نے اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا اقدام بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے ذریعے سے کیا بھی ہے۔ میں نے جو کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز پہلے ہی ریاستی پالیسی کے اصولوں میں موجود ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ نمبر ایک، اسے ایک دستوری حق کے طور پر تسلیم کیا جائے اور نمبر دو، اس حق کو بروئے کار لانے اور اس کے نفاذ کے لیے ایک نظام کار بن جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کام ایک دن میں ہو سکتا ہے لیکن ہمیں اس سمت میں قدم اٹھانا ہو گا۔

آپ دیکھیں کہ ۱۸ویں ترمیم میں آپ نے ایک بڑا اہم اقدام کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تعلیم کے حق کو ایک بنیادی حق تسلیم کیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کل آپ اسے کر دیں گے لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ کو اب ایک آئینی ذمہ دار کے طور پر اس پر کام کرنا پڑے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم سماجی تحفظ کا نظام اس طریقے سے قائم کریں کہ اس کو بطور بنیادی حق مانا جائے اس کے لیے باقاعدہ اسکیم بنائی جائیں۔ اور ایک عرصے کا تعین کیا جائے ساتھ ساتھ یہ تجویز کیا ہے کہ آپ دیکھیے مسئلہ حقیقت میں کیا ہے۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ۳۱ء۲۴ فیصد (ساڑھے پانچ کروڑ) آبادی غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی گزار رہی ہے اور اس میں ہر سال لاکھوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب آپ

---

[1] پروفیسر خورشید احمد نے ۱۸ویں ترمیم کے حوالے سے پارلیمانی کمیٹی میں انتہائی اہم اور متحرک کردار ادا کیا تھا بالخصوص بنیادی حقوق کے سلسلے میں پروفیسر خورشید کی تجویز پر بعض اہم ترمیمات شامل ہوئیں لیکن بعض حقوق کو مؤخر کر دیا گیا۔ (تفصیل جاننے کے لیے ”آئین پاکستان: انحرافات اور بحالی کی جدوجہد“ کا مطالعہ کیجیے) بعد ازاں رہ جانے والے موضوعات میں سماجی تحفظ کو بطور آئینی حق دستورِ پاکستان میں شامل کرنے کے لیے پروفیسر خورشید احمد نے ایک نجی بل پیش کیا جو فوری طور پر منظور تو نہیں ہوا لیکن پارلیمنٹ کے زیرِ بحث ایجنڈے میں شامل ہو گیا۔ زیرِ نظر تقریر اس بل کے حوالے سے ہے۔

کو پتا ہے کہ سیلاب کی وجہ سے کم از کم ستر لاکھ افراد ایسے ہیں جو اس وقت غربت کی لکیر کے نیچے شامل ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جو خودکشیاں ہو رہی ہیں اور یا لوگ بھوک سے مر رہے ہیں ان کی جانیں بچانے کے لیے بالخصوص مایوس کیسز کی بحالی کے لیے کوئی راستہ اختیار کیا جائے۔ پہلے آئینی حق دیا جائے اور پھر قانون اور منصوبے کے تحت اس کی اسکیم ہو تاکہ وہ ہمارے ترقیاتی منصوبے کا حصہ بنے۔ یہ تین مراحل ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اس کو کمیٹی کے سپرد کیجیے لیکن تجویز یہ ہے کہ پہلے آئینی حق پھر قانون سازی جیسا کہ جناب چیئرمین! آپ نے فرمایا تیسرے مرحلے میں اس کے لیے قابل عمل منصوبہ سازی، یہ تین چیزیں کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۸ویں ترمیم ایک ارتقائی عمل ہے جو بتدریج عمل پذیر ہوتا رہے گا، ہم نے ہر پہلو سے کچھ چیزیں کی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ نہیں کیں، لیکن یہ عمل جاری رہنا چاہیے۔

(یکم نومبر ۲۰۱۰ء)

قومی کمیشن برائے اسٹیٹس آف ویمن بل [۱]

جناب چیئرمین! میں سب سے پہلے تو اس بات کا اظہار کروں گا کہ قومی کمیشن برائے اسٹیٹس آف وومن کا قیام ایک مفید اقدام ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک کمیشن قائم تھا اس

[۱] اقوام متحدہ نے ۱۹۴۶ء میں خواتین کی حیثیت اور حقوق سے متعلق ایک عالمی کمیشن بنایا۔ بعد ازاں اقوام متحدہ کے رکن ممالک نے اس روایت کی پیروی میں اپنے اپنے یہاں خواتین کی حیثیت سے متعلق کمیشن بنائے۔ پاکستان میں ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۳ء میں مختصر مدت کے کمیشن قائم کیے گئے جن کا مقصد پاکستان میں خواتین کے حالات کا جائزہ لے کر مسائل کی نشاندہی اور بہتری کے لیے سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس دوران عالمی سطح پر ۱۹۹۵ء میں بیجنگ کانفرنس اور اسکے بعد قاہرہ میں خواتین کے حقوق سے متعلق عالمی کانفرنسیں ہوئیں۔

خواتین کی ترقی کے سلسلے میں حکومتی پالیسیوں اور اقدامات کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان میں ۲۰۰۰ء میں ایک مستقل کمیشن صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قائم کیا گیا۔ ۲۰۱۲ء میں پاکستانی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے 'قومی کمیشن برائے اسٹیٹس آف وومن' قائم کیا جس کا مقصد خواتین کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کرنا تھا۔ پروفیسر خورشید احمد کا زیرِ نظر خطاب اسی موضوع پر بحث کا حصہ ہے۔

قانون کے ذریعے اس کو اب ایک زیادہ بہتر پوزیشن دی جا رہی ہے۔ ہم اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن جیسا کہ اس ایوان میں ہم بار بار کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ان کوششوں میں سنجیدگی کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ قانون کا مسودہ اسمبلی سے ہو کر یہاں سینیٹ میں آجاتا ہے لیکن ہمیں دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ مسودہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وزارتِ قانون اور متعلقہ وزارت میں جس قسم کی ہم آہنگی ضروری ہے وہ موجود نہیں ہے۔

آپ خیال کیجیے کہ مسودہ کے مطابق "Woman" کی تعریف کیا ہے:

"عورت کے معنی، ۱۸ سال یا اس سے اوپر کی ایک مؤنث انسان"

"Girl" کی تعریف کیا ہے:

"لڑکی کے معنی، ۱۸ سال سے کم عمر کی مؤنث انسان"

یعنی عورت بھی اور انسان بھی، جبکہ عورت تحریر کر دینا کافی تھا۔ یہ مسودہ کی تحریر کا مسئلہ ہے۔ لیکن بہرحال وزارت کا کام قانون سازی ہے اور پھر اس کا سارا تعلق حقوق سے ہے۔ لیکن حقوق کو واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ حالانکہ بہت آسان تھا اور آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ دستورِ پاکستان کے مطابق حقوق ہوں گے۔ اس صورت میں دفعہ ۹ سے لے کر ۴۰ تک، کہیں عملی اور کہیں رہنما اصولوں میں جن حقوق کو بیان کیا گیا ہے وہ شامل ہو جاتے لیکن انہیں شامل نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد دیکھیے کہ چیئر پرسن کمیشن کی ایک بہت اہم پوزیشن ہے۔ لیکن اس پوزیشن کے لیے کیا تعلیمی قابلیت ہونی چاہیے، اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ کہا جا رہا ہے:

"چیئر پرسن! وہ عورت جو خواتین کے حقوق سے متعلق مسائل پر پندرہ سال سے زیادہ کام کرنے کا تجربہ رکھتی ہو اور خواتین کو بااختیار بنانے کے مقصد سے وابستہ ہو"۔

جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس میں سوسائٹی کی نمائندگی اس طرح ہوتی کہ

پیشہ وارانہ صلاحیت اور تجربہ بھی یقینی ہو جاتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ محض یہ نہ ہو کہ ہم نے یہ جلسہ کر لیا اور یہ بیان دے دیا بلکہ اس کے متعلق واضح بات ہو کہ وہ کیا چیز ہو گی جسے تجربہ تصور کیا جائے جیسا کہ میں نے عرض کیا عورت کا بااختیار ہونا یا نہ ہونا ایک مجہول تصور ہے، دستور نے اس کے بارے میں ایک واضح بات کہی ہے لیکن قانون میں اس کو نہیں لایا گیا۔ اسی طریقے سے اراکین کے بارے میں بھی یہی مبہم بات رکھی گئی ہے اور اس بات کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا کہ معاشرے کے تمام طبقات کی اس میں نمائندگی ہو، جسے ہونا چاہیے اسی طریقے سے جو اختیارات دیے گئے ہیں، خاص طور کلاز ۱۱(۱) جو کہتی ہے:

> "(کمیشن) خواتین کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی شکایات کی تحقیقات کے دوران وفاقی حکومت، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور خود مختار اداروں یا متعلقہ اداروں سے معلومات یا رپورٹ طلب کر سکتا ہے؛ اور اس سلسلے میں کمیشن کو ضابطہ کے تحت سول عدالت کا اختیار حاصل ہو گا"۔

یعنی میں جاننا چاہتا ہوں کہ جب آپ ان تمام چیزوں کے لیے کسی کو بااختیار کرتے ہیں تو پھر اس کا محاسبہ کا طریقۂ کار کیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس مسودہ کو مکمل طور پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں اسکی مخالفت نہیں کر رہا، البتہ تکنیکی غلطیوں کی نشاندہی کر رہا ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے متعلقہ کمیٹی میں بھیج دیں، وہاں ہم بیٹھیں گے اور اسے بہتر کرنے کی کوشش کریں گے۔ ۱۹ جنوری [۲۰۱۲] کو یہ اسمبلی سے پاس ہوا ہے اس اعتبار سے ہمارے پاس وقت موجود ہے، ان شاء اللہ ہم اسی سیشن میں یا زیادہ سے زیادہ اگلے سیشن میں اسے بہتر بنوانے کے بعد پاس کرا دیں گے۔ (۲ فروری ۲۰۱۲ء)

چوری کی سزا کا مجوزہ قانون[1]

جنابِ چیئر مین! ہم یہ بات سنتے سنتے تھک گئے ہیں کہ جو بل اسمبلی سے آجائے اسے سینیٹ لازماً پاس کرے۔ یہ بات ہم سے ماضی میں بھی بار بار کہی گئی ہے آج بھی کہی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے اگر یہی رویہ اختیار کرنا ہے تو پھر آخر ایوان بالا کی ضرورت کیا ہے۔ درحقیقت اس ایوان کو ایوان جائزہ کہتے ہی اس لیے ہیں کہ ایک ہاؤس سے چیزوں میں جو سقم اور کمزوریاں رہ جاتی ہیں دوسرا ہاؤس ان کو پورا کرے۔ دستور کی یہ پوری سکیم ہے لیکن آپ نے اپنی ایک حکمت عملی کی بنا پر اس سکیم کو معطل کر دیا ہے۔ میں جناب وزیر قانون کو متوجہ کروں گا کہ انگلستان میں، ہندوستان میں اور دوسرے تمام ممالک میں جہاں پارلیمنٹ کے دو ایوان ہوتے ہیں وہاں ایک نہیں سینکڑوں قوانین ہیں جو ترمیم کے بعد، ان ملکوں کے اپنے اپنے قانون کے مطابق، یا ابتدائی ہاؤس میں دوبارہ گئے ہیں یا مشترکہ اجلاس میں لے جائے گئے ہیں۔ اس بات کو ان حدود کے اندر ہی رکھیے۔ ہاں کبھی کوئی بہت ایمر جنسی ہو اور کسی قانون کا فوراً وجود میں آنا بہت ضروری ہو تو ہم نے ماضی میں بھی تعاون کیا ہے اور آئندہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس دلیل کی بنیاد کے اوپر ایک ہاؤس کو ناکارہ بنا دینا یہ بات اس ہاؤس کے وقار کے خلاف ہی نہیں دستور کے خلاف بھی ہے۔

جنابِ والا! دوسری بات یہ ہے کہ جو سوالات اٹھائے گئے ہیں ان میں کچھ تو جزوی نوعیت کے ہیں اور ان کے ذریعے سے اس قانون کو بلا شبہ بہتر کیا جا سکتا ہے۔ میرے بھی دستخط ہیں ان تمام ترامیم کے اوپر جو اس ہاؤس میں ہم نے پیش کی ہیں۔ لیکن چند نکات تو

---

[1] پشاور ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کی روشنی میں قانون فوجداری میں ایک ترمیم پیش کی گئی جس کے مطابق کار چوری کے جرم کی سزا بڑھا کر تین سال سے سات سال کی گئی تھی۔ قبل ازیں یہ قانون قومی اسمبلی سے منظور کیا گیا تھا۔

اس ترمیم پر سینیٹر چوہدری انور بھنڈر، سینیٹر آفتاب احمد شیخ، سینیٹر شہزاد گل اور پروفیسر خورشید احمد نے تفصیلی اظہار کیا۔ ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ اس ترمیم کے ذریعے کار چوری ایک نیا جرم تخلیق کیا گیا ہے اور اس طرح یہ حدود کی سزا سے نکل گیا ہے جبکہ مقدمہ کی سماعت کا اختیار مجسٹریٹ درجہ اوّل کو دیا گیا ہے جس کے پاس تین سال سے زیادہ سزا دینے کا اختیار نہیں ہے۔

ٹھوس ہیں اور ان میں میری نگاہ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک جرم کی مختلف سزائیں ملک کے قانون کے نظام کے اندر انصاف کے خلاف ہیں۔ اس طرح کی قانون سازی سے پورے ملک کا جو نظام ہے اس کو ہم تضادات اور تناقص کا شکار کر رہے ہیں۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو کہ آپ ایک ایسا نیا جرم تخلیق کر رہے ہیں جو پہلے ہی حدود اور تعزیر کے قانون کے تحت موجود ہے اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس طرح دراصل آپ اس پہلے قانون کو غیر متعلق بنانے کے لیے نیا جرم بنا رہے ہیں۔ چنانچہ کار کے سلسلے میں جو چوری ہو اس کو حدود قوانین کے تحت نہ چلایا جا سکے اور یہ کہا جا سکے کہ یہ خاص جرائم ہیں اور خاص جرائم کے لیے خاص دفعات موجود ہیں اس لیے اسے صرف اس مخصوص قانون کے تحت چلایا جائے گا۔ یہ بڑا بنیادی نکتہ ہے جنابِ والا! اسی طرح اس میں مجسٹریٹ کے اختیارات والا مسئلہ ہے۔ حقیقت میں یہ فاش غلطی ہے آپ ہم سے یہ توقع کیسے رکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ہم سزا تجویز کریں اور دوسری طرف جس جج کو وہ سزا دینی ہے وہ مختار ہی نہیں ہے۔ آپ کیسے توقع کرتے ہیں کہ یہ ایوان اس قسم کی کھلی کھلی فاش غلطیاں نظر انداز کر کے ان سے گزر جائے۔

جنابِ والا! اصل مسئلہ قانون میں تبدیلی کا نہیں آپ کے پورے نظام کا ہے۔ جس طریقے سے یہ نظام چل رہا ہے اس میں پولیس اور انتظامیہ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میرے ساتھی سینیٹر آفتاب احمد شیخ نے چار پارٹیوں[1] کا ذکر کیا جو مل کر یہ کام کر رہے ہیں۔ میں اس میں ایک پانچویں پارٹی کی نشاندہی بھی کرتا ہوں۔ یہ ان چوروں کے وہ سرپرست ہیں جو اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور جو مقدس ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان کی سرپرستی میں ہی یہ سارا کام ہو رہا ہے۔ یہ قانون ان کو ہاتھ نہیں لگاتا یہ صرف ان کارندوں کو

---

[1] سینیٹر آفتاب احمد شیخ صاحب نے چوری کے منظّم کاروبار میں جن چار پارٹیوں کا ذکر کیا وہ کچھ یوں تھا کہ ایک پارٹی موٹر سائیکل یا گاڑی چوری کرتی ہے وہ دوسرے گروپ کے حوالے کرتی ہے جو اس کی شناخت ختم کر کے رنگ وروغن کر کے انجن نمبر تبدیل کر کے مارکیٹ میں بھیج دیتی ہے، تیسری پارٹی اس موٹر سائیکل کے نئے جعلی کاغذات بناتی ہے اور چوتھی فروخت کرتی ہے۔

ہاتھ لگاتا ہے جنہیں یہ بااقتدار تحفظ یافتہ افراد استعمال کر رہے ہیں۔ قانون اگر بنانا ہے تو وہ بنایئے جو سب کو پکڑ سکے اور بالخصوص بڑی مچھلیوں کو پکڑے۔ بڑی مچھلیوں کو تحفظ اور چھوٹی مچھلیوں کی گرفت، یہ خود انصاف کے خلاف ہے۔

جنابِ والا! حکومت کو اس قانون کے سلسلے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ جب سے قوانین آرہے ہیں ہم نے تو ان میں ترامیم نہیں کی ہیں کیونکہ ہم حکومت سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن اس میں سمجھنا چاہیے کہ قانون سازی ایک سنجیدہ کام ہے۔ ہم نے قانون سازی کو مذاق بنا دیا ہے۔ ۹۰ فیصد قوانین آرڈیننسز کے ذریعے آرہے ہیں جن میں اسمبلیوں اور سینیٹ میں کوئی بحث نہیں ہوتی۔ پھر بار بار ان ہی قوانین کی تجدید کر دی جاتی ہے اس طرح پورا نظام ان الل ٹپ قوانین کے ذریعے چل رہا ہے۔ اب جو قوانین پارلیمنٹ کے ذریعے سے بھی آرہے ہیں، اگر ان میں بھی اتنے سقم اور جھول ہوں، تضادات اور خلاء ہوں، تو آپ یہ بتایئے کہ اس طرح ہم نے پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے قانون سازی کے معاملے میں کیا خدمت انجام دی ہے۔ کیا یہاں پر ہم صرف الاؤنس لینے اور تماشا بننے یا دیکھنے اور سیاسی معاملات میں ایک دوسرے کے گریبان پکڑنے کے لیے ہیں۔ یا یہ ادارے اس لیے ہیں کہ یہاں سنجیدہ قانون سازی ہو اور اسی میں یہ وقت صرف کیا جائے۔

ہم قانون سازی کے لیے گھنٹوں ایوان میں اور کمیٹیوں میں بیٹھنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن آپ قانون سازی کرنے کے لیے آئیں تو! آپ کا عالم تو یہ ہے کہ قومی اسمبلی جس دن ملتوی ہوئی ہے اس کے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر آپ نے ایک نیا آرڈیننس جاری کر دیا۔ اور شرمندگی کی بات ہے اس آرڈیننس کے ذریعہ آپ نے اپنی ایجنسیوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے تمام ارکان اور اس ملک کے شہریوں کے ٹیلی فون ٹیپ کر سکیں۔ یہ بات شرمناک ہے کہ قانون کے ذریعے آپ یہ اجازت دے رہے ہیں اور اس طرح دے رہے ہیں کہ پارلیمنٹ کا اجلاس ابھی ختم ہی ہوا ہے اور آپ نے یہ آرڈر جاری کر دیے۔ یہ طریقہ بدلیے، یہ راستہ ملک کو چلانے کا نہیں ہے، یہ راستہ جمہوریت کا نہیں ہے، یہ راستہ قانون کی بالادستی کا نہیں ہے، یہ راستہ دستور کی پابندی کا نہیں ہے۔

[ایوان میں بحث کے بعد حکومت کا خیال تھا کہ اگر اس موقع پر سینیٹ کی ترامیم کو قبول کیا گیا تو یہ بل یا تو از سر نو قومی اسمبلی میں بھیجا جائے گا یا جوائنٹ سیشن کے انتظار میں تاخیر کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ حکومت نے اکثریت کی بنیاد پر قانون منظور کر لیا۔]

(۲۷ دسمبر ۱۹۹۵ء)

پرائیویٹ پاور اینڈ انفراسٹرکچر بورڈ[۱]

جنابِ والا! مجوزہ قانون اس پہلو سے غیر معمولی طور پر اہم ہے کہ ملک میں بجلی کا بحران بہت شدت اختیار کر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو گئی ہے۔ اس معاملے میں نجی و سرکاری شعبہ دونوں کو مناسب منصوبے کے تحت مل کر کام کرنا ہو گا اس تناظر میں، میں کم از کم اس بل کی تحسین کرتا ہوں اور اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہی بات میں نے کمیٹی میں بھی کہی تھی۔

لیکن کمیٹی کی جو رپورٹ پچھلے ہفتے یہاں پیش ہوئی ہے وہ درست نہیں ہے میں نے اسی وقت اس پر اعتراض کیا تھا اور وہ یہ تھا کہ کمیٹی کی تین نشستیں ہوئی ہیں، دو میں، میں نے شرکت کی تھی اور آخری میں، میں شرکت نہیں کر سکا تھا لیکن دونوں نشستوں میں، میں نے بہت اہم دستوری سوالات اٹھائے تھے اور زور دے کر کہا تھا کہ اس قانون میں ۱۸ ویں ترمیم کے ڈھانچے کا لحاظ رکھنا چاہیے جو کہ نہیں رکھا گیا ہے۔ آخری میٹنگ میں، میں نہیں جا سکا،

---

[۱] پرائیویٹ پاور اینڈ انفرااسٹرکچر بورڈ ۱۹۹۴ء میں ایک سرکاری نوٹیفکیشن کے ذریعے قائم کیا گیا تھا۔ بورڈ کے قیام کا مقصد ملک میں توانائی کی قلت دور کرنے کے لیے نئے پراجیکٹس کے لیے سرمایہ کاری لانا تھا۔ آنے والے سالوں میں سرمایہ کاروں نے یہ اعتراض کیا کہ یہ بورڈ کسی اداراتی تحفظ کے بغیر کام کر رہا ہے جس پر حکومت نے ۲۰۱۲ء میں ایک قانون پارلیمنٹ میں پیش کیا تاکہ بورڈ کو آئینی و قانونی تحفظ حاصل ہو سکے۔ مجوزہ قانون پر بحث کے دوران بعض ممبران نے اعتراض کیا کہ ۱۸ ویں ترمیم کے ذریعے صوبائی و وفاقی حکومت کے درمیان اختیارات کی ایک نئی تقسیم کی گئی اس لیے ان کے خیال میں یہ بورڈ قائم کر کے وفاقی حکومت ۱۸ ویں ترمیم کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ دوسری جانب حکومت کے مطابق پاور جنریشن اور مینجمنٹ وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے دائرہ کار میں ہے۔ دوسرے پرائیویٹ پاور اینڈ انفرااسٹرکچر بورڈ کے انتظامات میں صوبائی نمائندگی مساوی ہے اس لیے ایسے اعتراضات کی گنجائش نہیں۔

چنانچہ میں یہ اعتراض تو نہیں کر سکتا کہ انھوں نے اس پر مزید غور کیے بغیر کیوں منظور کر کے یہاں بھیج دیا۔ لیکن میرے اعتراضات کا جو ریکارڈ پر موجود ہیں، رپورٹ میں کوئی ذکر نہیں ہے، یہ غیر منصفانہ ہے۔

نمبر دو، جہاں تک قانون کا تعلق ہے جیسا میں نے کہا کہ اس کے مقاصد سے مجھے اتفاق ہے، اس کی ضرورت کو بھی میں محسوس کرتا ہوں لیکن جنابِ والا! میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ ہماری حکومت، جس میں حکومت ہی نہیں بلکہ میں افسر شاہی کو بھی موردِ الزام ٹھہراتا ہوں، دستور میں جو ترمیم ہو چکی ہے اس کے تقاضوں کو مدنظر نہیں رکھ رہے اور نہایت سہل انگاری کے ساتھ قانون سازی کے معاملات کر رہے ہیں۔ کل بھی سینیٹ میں اس پر بحث ہوئی ہے، سینیٹ کے ارکان بار بار ان مسائل کو اٹھا رہے ہیں لیکن صورتِ حال میں بہتری نہیں آرہی۔ اسی حوالے سے میں بھی اپنی بات کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ اصل میں ہوا کیا تھا۔

یہ ادارہ پہلے ۱۹۹۴ء میں ایک سرکاری نوٹیفکیشن کے ذریعے بنا۔ میری نگاہ میں وہ غلط تھا۔ جس نوعیت کا یہ ادارہ تھا اس کے لیے باقاعدہ قانون سازی ہونی چاہیے تھی لیکن ۱۹۹۴ء سے آج تک وہ نوٹیفکیشن کی بنیاد پر چلتا رہا۔ حالانکہ اس دوران بیرونی حکومتوں نے، بیرونی سرمایہ کاروں نے، نجی شعبہ اور حتّٰی کہ عدالتوں نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کی جو قانونی بنیاد ہے اس کا ٹھوس ہونا ضروری ہے۔ بالآخر اب ۲۰۱۲ء میں ۱۸ ویں ترمیم پاس ہونے کے بعد قانون آیا ہے لیکن یہ بعینہٖ اسی قانون اور نوٹیفکیشن کا چربہ ہے جو ۱۹۹۴ء میں آیا تھا۔ جو جوہری تبدیلی اس زمانے میں واقع ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ توانائی کا شعبہ اب مرکز اور صوبوں کے مشترکہ کنٹرول میں ہے اور صوبوں کا حصہ کم از کم پچاس فیصد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منصوبے صوبے میں بھی شروع ہو سکتے ہیں اور مرکز میں بھی۔ صوبوں کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ نجی شعبہ کو ملک میں اور ملک کے باہر سے شامل کر سکتے ہیں حتّٰی کہ صوبے اس قسم کے منصوبوں پر گارنٹی بھی دے سکتے ہیں۔ یہ بڑی ٹھوس تبدیلیاں ہیں لیکن آپ دیکھیں کہ جو ادارہ یہاں بنایا گیا ہے، اس کی اہمیت

سے ہمیں انکار نہیں ہے لیکن یہ پورے کا پورا ایسا ہے جیسے کہ ایک وفاقی ادارہ ہے۔ اس کا سیکرٹری آبی و توانائی وسائل ہے اور سیکرٹری خزانہ، سیکرٹری پٹرولیم، سیکرٹری پلاننگ اور چیئرمین ایف بی آر اور مینجنگ ڈائریکٹر واپڈا اس کے ارکان ہیں۔

صوبوں کو کیا دیا گیا ہے، صوبوں کے چیف سیکرٹری اس کے رکن ہوں گے۔ یہ بالکل مناسب ہے۔ صرف ریکارڈ کی خاطر یہ بات کہہ رہا ہوں کہ یہاں پر آزاد کشمیر کا ذکر موجود ہے، جسے ہونا چاہیے اس لیے کہ آبی توانائی کے لیے ان کا بہت اہم کردار ہے۔ گلگت، بلتستان کا بھی ذکر نہیں ہے، اسے بھی ہونا چاہیے کہ وہاں بھی توانائی کے نقطۂ نظر سے بہت اہم علاقے ہیں اور ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آزاد جموں و کشمیر کا ذکر ذیلی دفعہ (ا) میں بجا طور پر کیا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ذیلی دفعہ "I" میں گلگت بلتستان سے ایک نمائندہ وہاں کے سیکرٹری کو رکھا گیا ہے۔ گلگت، بلتستان کی حیثیت ایک صوبے کی نہیں۔ وہ ایک متنازعہ علاقہ ہے اور وہاں پر ایک خصوصی انتظام ہے جس طرح آزاد کشمیر کا معاملہ ہے اسی طریقے سے گلگت بلتستان بھی ہے۔ اس کا ذکر وہاں "I" کے اندر ہونا چاہیے تھا، "J" میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔

لیکن اس سے آگے "J" اگر آپ غور سے دیکھیں تو عجیب و غریب بات ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام صوبوں کے نجی شعبہ سے ایک ایک نمائندہ وفاقی حکومت نامزد کرے گی۔ اس سے زیادہ قابل اعتراض تجویز اور کیا ہو سکتی ہے کہ ۲۰۱۲ء میں آپ قانون سازی کر رہے ہیں ۱۹۹۴ء کے نوٹیفکیشن کے چربے کے اوپر چنانچہ صوبوں کو ان معاملات میں جو اختیار ہے اسے نظر انداز کرتے ہوئے آپ نجی شعبہ سے جو افراد لے رہے ہیں، وہ بھی وفاقی حکومت نامزد کرے گی، آپ نے مسودہ میں تبدیلی کی اتنی زحمت بھی نہیں کی ہے کہ صوبہ سے نامزدگی صوبوں کے ذریعہ کی جائے۔ اب اگر نجی شعبہ سے ارکان کو بھی وفاقی حکومت نامزد کرتی ہے اور چار وفاقی سیکرٹری بھی اس بورڈ میں موجود ہیں تب بھی گو اس بورڈ میں اس کی اقلیت ہو گی لیکن ایک مضبوط پوزیشن ہو گی۔ پھر میں آپ کی توجہ دلاؤں گا کہ مینجنگ ڈائریکٹر

بھی وفاقی حکومت نامزد کر رہی ہے حالانکہ اصول یہ ہوتا ہے کہ ایسے معاملات کے اندر کم از کم بورڈ کو کہا جاتا ہے کہ وہ سربراہ کو نامزد کرے۔ اس لیے کہ بورڈ میں مرکز اور صوبوں کی نمائندگی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس کو مرکز صوبوں کے مشورے سے نامزد کرے لیکن کم از کم بورڈ میں تو یہ اہتمام کریں کہ جہاں اگر آٹھ آدمی صوبوں کے ہوں گے اور نو یا دس مرکز کے ہوں گے تو چلیے لو اور دو کے ذریعے سے یہ کام ہو سکے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ صوبائی خود مختاری کے نقطۂ نظر سے اور ۱۸ویں ترمیم کے اعتبار سے اس کے تقاضوں کو اس میں سمویا نہیں گیا ہے، اس بنا پر میں نے وہاں بھی اعتراض کیا تھا، کوئی جواب نہیں آیا، بلاشبہ کمیٹی کی آخری میٹنگ میں، میں شریک نہیں ہو سکا جس میں انہوں نے اس بل کو منظور کر دیا۔ اسی لیے میں نے یہ حق لیا کہ میں ایوان میں اپنی بات پیش کروں اور حکومت کو بھی دعوت دوں کہ یہ مسئلہ کوئی سیاسی اختلاف کا نہیں، یہ مسئلہ اس ملک میں فیڈریشن کے نظام کو اس کی اصل روح کے ساتھ نافذ کرنے کا ہے۔ یہ ایک نازک کام ہے، اگر ہم نے اب بھی وہی کام کیا کہ جو چیز ۱۹۹۴ء میں تھی، اسی کو اب بھی تھوپیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی اور فاصلے بڑھیں گے۔ نجی شعبہ کو ضرور شامل کیجیے لیکن نجی شعبے کی جو نامزدگیاں ہیں انہیں وفاق کی بجائے صوبوں کی جانب سے ہونا چاہیے۔ اگر یہ چیز آپ اسی طرح کرتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ جس مقصد کے لیے آپ یہ کام کر رہے ہیں، وہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

میں پورے ادب سے عرض کروں گا کہ خدا کے لیے میرٹ پر غور کیجیے۔ جب میں نے نوید قمر صاحب (سابق وزیرِ پٹرولیم اور قدرتی وسائل) سے یہ ساری باتیں کیں تو انہوں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ہاں! ہمیں آپ کے ساتھ بیٹھ کر اس معاملے کو حل کرنا چاہیے۔ آج وہ موجود نہیں ہیں، میں پوری ذمہ داری سے بات کر رہا ہوں کہ وہ میرے پاس اٹھ کر یہاں آئے تھے، میرے سامنے بات کی، میں نے نکات ان کو بتائے تو انھوں نے یہ بات کہی کہ ہم اس کو پاس تو کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ نے جو بات کہی ہے، ہم اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں۔

جناب چیئرمین! آپ کو یاد ہو گا کہ پہلی خواندگی میں غالباً سب سے زیادہ بات میں نے اس پر کی تھی اور اس کے بعد محترم وزیر نے پیش کش کی کہ بیٹھ کر اس معاملے کو حل کر لیا جائے۔ چنانچہ تبدیلی کی گفتگو کو اسی پس منظر میں لیا جانا چاہیے۔

میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ شاید اس قانون کو ٹھیک سے سمجھا نہیں جارہا ہے۔ ایک ادارہ پہلے سے ہی موجود ہے، جو نوٹیفکیشن کے مطابق ۱۹۹۴ء میں قائم ہوا تھا۔ مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ قانونی اعتبار سے یہ ایک آئینی ادارہ نہیں تھا تو اس لیے سرمایہ کاروں نے اس پر اعتراض کیا اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اب اس کو ایک قانون کی شکل دی جارہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ۱۸ویں ترمیم میں ہم نے مرکز اور صوبوں کے درمیان میں ایک توازن قائم کیا ہے۔ ہائیڈل کے لیے بھی اور دوسرے وسائل کے لیے، اور جو چیزیں ماضی میں صوبوں کو حاصل نہیں تھیں وہ ہم نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت متفقہ طور پر صوبوں کو دیں اس کا تحفظ پورا پورا ہونا چاہیے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ہر صوبہ یہ ادارہ قائم کرے۔ ہم نے جو ترمیم پیش کی ہے اس کے نتیجے کے طور پر اس کا جو بورڈ بنا ہے اس میں گیارہ افراد صوبے سے آئیں گے اور سات مرکز سے ہوں گے۔ اس میں انھیں اکثریت حاصل ہو گی اور ہم نے اس کا پوری طرح خیال رکھا ہے۔

[بعد ازاں اس قانون کو سینیٹ نے منظور کر لیا۔ البتہ حکومت نے یقین دہانی کرائی کہ آئندہ ان نکات کو زیرِ غور لایا جائے گا۔]

(۲۸ اور ۳۱ جنوری ۲۰۱۲ء)

نجی سرمایہ کاری کے فروغ اور تحفظ کا ترمیمی قانون[1]

جناب چیئرمین! میں اس بل کو منظور کرنے کے حق میں ہوں یہ بہت مفید ہے۔ بلکہ میری نگاہ میں تو بنکنگ اور انشورنس کے لیے بھی اس کو ہونا چاہیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان شعبوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جائے۔ لیکن یہاں پیش کیا گیا پوائنٹ قانوناً بہت درست ہے اور یہ دراصل پارلیمنٹ کے حقوق کے اوپر ایک قسم کا ڈاکہ ہے۔ اس لیے کہ بجائے اس کے کہ قانون سازی پارلیمنٹ کے ذریعے سے ہو آپ نے اس کے اندر ایک ایسا محتسب کا پھندا ڈال دیا ہے کہ اس کے بعد حکومت خود جب اور جو چاہے پابندیاں لگا دے۔ جبکہ اصولاً یہ پارلیمنٹ کا حق ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں آنے والا یہ اعتراض درست ہے۔ جو شرائط آپ نے دی ہیں کہ مثلاً پارلیمنٹ منظور کرے گی وہ درست ہیں۔ لیکن ساتھ ہی گورنمنٹ کو یہ اختیار کہ جب اور جو شرائط وہ چاہے محض نوٹیفکیشن کے ذریعے سے بعد میں اس پر لگا دے یہ صحیح نہیں۔ یہ گویا سرکاری نوٹیفکیشن کے ذریعے قانون سازی ہے۔

حکومت ذرا کھلے ذہن سے ہماری بات پر غور کرے ہمارا مقصد آپ کے ہاتھ باندھنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ جو ہدف ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ فی الحقیقت آپ کے لیے

---

[1] پاکستان میں نجی سرمایہ کاری حکومت کے محتاط رویے کے سبب ایک الجھا ہوا موضوع رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک چند مخصوص شعبوں میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت تھی لیکن بنکنگ، انشورنس جیسے شعبے بیرونی سرمایہ کاری سے باہر تھے۔ ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی اقتصادی اصلاحات میں بنکوں اور اہم صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی نے بیرونی سرمایہ کاری کا راستہ روک دیا۔ ۱۹۸۴ء میں صدر ضیاء الحق کے دور میں بیرونی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی گئی اور تحفظ بھی دیا گیا۔ ۹۰ء کی دہائی میں جب بیرونی سرمایہ کاری کے لیے خصوصی کوشش بھی کی گئی تو حکومت کی پالیسی اور پاکستان کے قوانین میں اتنا فرق تھا کہ سرمایہ کار اس جانب آگے نہ آسکے بعد ازاں امن و امان کی صورتِ حال اور سیاسی عدم استحکام نے سرمایہ کاروں کو اعتماد فراہم نہ کیا۔

بیرونی سرمایہ کاری کے فروغ اور تحفظ کے بل ۱۹۹۳ء میں ایسی اصلاحات تجویز کی گئیں جن سے سرمایہ کاری کو فروغ ملے لیکن قومی اسمبلی اور سینیٹ کی موجودگی میں حکومت کچھ اس طرح سے اس بل کو پاس کرانا چاہتی تھی کہ جو پارلیمانی طرزِ حکومت اور طریقۂ کار کے خلاف تھا۔

ممکن ہو سکے۔ ایک طرف خود وزیر اعظم اس ایوان میں اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ کے اختیارات جو اس سے ماضی میں لے لیے گئے ہیں اس کے پاس واپس جانے چاہییں، ہمیں اس سے پورا پورا اتفاق ہے، لیکن سوال یہ ہے پارلیمنٹ کو اختیار دینے کا ایک طریقہ آٹھویں ترمیم کی کچھ دفعات تھیں ان پر ضرور غور کیجیے۔ اگر آپ نے معقول بات کی تو ہم بھی آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی واضح رہنا چاہیے کہ پارلیمنٹ کے اختیارات لینے کا یہ ایک غلط طریقہ ہے کہ حکومت اس نوعیت کی چلتی دفعات ڈال کر کے پارلیمنٹ کو بائی پاس کرتی رہے۔ یہ ماضی میں ہوتا رہا ہے اور خصوصاً آمرانہ حکومتوں نے تو قانون سازی کے سارے اختیارات عملاً اسی قسم کی دفعات کی بنا پر اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ آپ بھی وہی غلطی کر رہے ہیں۔ خدارا پارلیمنٹ کے اختیارات کو اس طرح کم نہ کیجیے جو آپ اختیار لینا چاہتے ہیں ضرور لیجیے لیکن پارلیمنٹ میں آکر بحث و مباحثہ اور مشاورت کے بعد، یہ نہیں کہ چور دروازے سے یہ اختیار لیے جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں سے آپ نے مشورہ کیا ہو وہ باہر کے سرمایہ کار ہوں انہوں نے اس بات کو محسوس نہ کیا ہو۔ لیکن معاشیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اور دنیا کے حالات کو جاننے والے فرد کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں کہ آج جو گنجائش آپ قانون کے اندر دے رہے ہیں اسے آپ اس ایک چیز کے ذریعہ واپس بھی لے رہے ہیں کہ کل آپ جو شرائط چاہیں گے لگا سکتے ہیں۔ براہ مہربانی یہ نہ سوچیئے کہ کل بھی آپ ہی برسر اقتدار ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کوئی اور حکومت میں ہو۔ اس طرح کے قانون کے تحت وہ حکومت جو چاہے پابندیاں لگا سکتی ہے جو چاہے شرائط لگا سکتی ہے اور اس طرح ضمانت دے کر کے آپ جو سرمایہ لانا چاہتے ہیں یہ پیداواریت کے خلاف ہونے کی بناء پر قابل عمل ہی نہ ہو گا۔ خدارا وہ کام کیجیے جو درحقیقت قوم کے مفاد میں ہوں اور جس سے آپ بھی مقصد حاصل کر سکیں۔ (یکم مارچ ۱۹۹۳ء)

باب نمبر ۲

قانون سازی اور اس پر عملدر آمد (۲)

تحفظ نسواں کا قانون ۲۰۰۶ء

برصغیر میں برطانوی نو آبادیاتی سامراج کی حکومت کے قیام سے قبل معاشرتی جرائم جیسے زنا، ڈکیتی وغیرہ کے مقدمات عموماً قرآن و سنت کی روشنی میں نمٹائے جاتے تھے۔ برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے ۱۸۹۸ء میں قانونِ فوجداری نافذ کر کے تمام جرائم کے مقدمات اس قانون کے تحت نمٹانا شروع کر دیے۔

۱۹۷۹ء میں جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں پہلی بار قیام پاکستان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے حدود آرڈیننس جاری کیا گیا۔ جس میں زنا، شراب نوشی، ڈکیتی، چوری اور جھوٹی گواہی جیسے جرائم کو ضابطہ فوجداری سے نکال کر حدود آرڈیننس کے تحت کیا گیا اس کے لیے وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی۔ تمام سزائیں قرآن و سنت کی بنیاد پر مقرر کی گئیں۔

پاکستان میں بعض مخصوص طبقات اور غیر ملکی حکومتیں شروع ہی سے حدود قوانین کے خلاف رہیں۔ جرائم کی سنگینی سے قطع نظر ان کی جانب سے کوڑوں اور سنگسار کرنے کی سزاؤں کو ظالمانہ قرار دیتے ہوئے پروپیگنڈے کی ایک لہر چلائی گئی کہ یہ قوانین عورت کی آزادی کے خلاف ہیں اور ان قوانین کے تحت ہزاروں عورتوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں تحفظ نسواں قانون کے نام پر قانونِ فوجداری، ضابطہ فوجداری اور حدود آرڈیننس میں ترمیم کے ذریعے متعدد ترامیم کی گئیں جن کے ذریعے زنا بالجبر، زنا بالرضا اور قذف کے قوانین میں تبدیلی کر کے اللہ کی مقرر کردہ حدود، کوڑوں اور سنگسار کی سزائیں ختم کر دی گئیں۔

اس ضمن میں پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ سے باہر پاکستانی عوام اور علماء نے حدود کے حوالے

سے درست حقائق پیش کرنے کی کوشش کی۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۶ء کو حکمراں پارٹی (ق) لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین اور تمام مسالک کے غیر سیاسی علماء اور محققین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جس کے مطابق حکومت کے مجوزہ بل میں تبدیلیاں تجویز ہوئیں۔ لیکن حکومت نے علماء کو اعتماد میں لیے بغیر ۱۵ نومبر ۲۰۰۶ء کو قومی اسمبلی میں تحفظ حقوق نسواں قانون پیش کیا۔ سینیٹ آف پاکستان نے یہ بل ۲۳ نومبر ۲۰۰۶ء کو پاس کیا اور اس پر تقریباً ایک ہفتہ بحث ہوئی۔ تمام ہی جماعتوں نے بحث میں حصہ لیا۔ حزبِ اختلاف کے اراکین نے حکومت کے مجوزہ بل میں کئی ترامیم پیش کیں جنھیں مسترد کرتے ہوئے اکثریت کی بنیاد پر بل کو پاس کرالیا گیا۔ پروفیسر خورشید کی زیرِ نظر تقاریر اس حوالہ سے سینیٹ میں ہونے والی بحث کا حصہ ہیں۔

جنابِ والا! گو اس قانون کو تحفظ نسواں کا قانون قرار دیا گیا ہے لیکن آپ گہرائی میں جاکر جتنا بھی اس کا مطالعہ کریں، تجزیہ کریں اور اس کے مضمرات کو سمجھنے کی کوشش کریں تو میں بڑی دردمندی اور دیانتداری سے کہتا ہوں کہ اس میں تحفظ نسواں کے لیے کوئی ایک چیز بھی موجود نہیں ہے۔ صرف عنوان ہے، مضمون اور مدعا غائب۔ بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ اس میں کوئی ایک شق بھی ایسی نہیں ہے جس کے کسی بھی پہلو سے ان حقیقی مظالم کی روک تھام ہوسکے جو آج ہماری خواتین کے ساتھ ہو رہے ہیں اور جس کی وجہ انگریز کا نوآبادیاتی نظامِ قانون (انڈین پینل کوڈ ۱۸۹۸ء) ہے ہم آج بھی اس پر آگے بڑھ کر عمل کر رہے ہیں اور اسے بدلنے کی جو ضمانت دستور نے دی تھی، اس کا کوئی لحاظ نہیں کر رہے۔

عورتوں پر مظالم کی وجوہات

پولیس کا فرسودہ نظام: مذکورہ قانون کے علاوہ عورتوں پر مظالم کی دوسری بڑی وجہ پولیس کا فرسودہ نظام اور پولیس کی طرف سے عدالتی چارہ جوئی کا طریقۂ کار ہے۔ اس لیے کہ ایک مستقل قانون ہوتا ہے اور دوسرا اس پر عمل کرنے کے لیے قانونی طریقۂ کار ہوتا ہے، مستقل قانون میں بھی خامیاں ہوسکتی ہیں لیکن اس سے زیادہ خامیاں قانونی طریقۂ کار میں ہیں۔ خامیوں سے پُر اس عدالتی طریقۂ کار کا ناجائز فائدہ اٹھاکر پولیس معاشرے کے کمزور

طبقات کا استحصال کرتی ہے اور اس طرح عورتوں، مردوں اور معصوم انسانوں پر مظالم کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس ملک میں سب سے زیادہ بدعنوان اور طاقت کے غلط استعمال کی سب سے زیادہ مرتکب پولیس ہے۔ اس کی اصلاح کے بغیر مردوں اور عورتوں دونوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں ان کا تدارک نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ عوام میں تعلیم اور شعور کی کمی اور سول سوسائٹی کا غیر مؤثر ہونا ہے۔

عدلیہ میں کرپشن: جنابِ والا! میں بڑے دکھ سے یہ بات کہتا ہوں کہ عدلیہ میں ہر سطح پر اور خصوصیت سے زیریں سطح پر بشمول مجسٹریٹ اور سیشن عدالتوں کے، شدید لاقانونیت، کرپشن اور اثرورسوخ کا استعمال ہے۔ حتیٰ کہ پیشہ قانون جو کہ بڑا محترم پیشہ ہے اور جس کا مقصد معصوم انسانوں کو قانون کی غلط دسترس سے بچانا ہے، اس کا مجرموں کے ساتھ ساز باز اور عدالت کے ساتھ ملی بھگت ایک معمول ہے۔ فی الحقیقت یہ وہ چیزیں ہیں جن سے کہ انسانوں پر ظلم ہوتا ہے۔

ظالمانہ نظام: پھر اس ملک میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہے، میں اس کو وسعت دوں گا کہ سرمایہ دار جو نئی اشرافیہ اور نودولتیہ طبقہ ہے، اس کے ساتھ بیوروکریسی اور فوج کے مخصوص عناصر ہیں جو اپنے دائرے اور حصار سے نکل کر سول دائرہ میں ایک نئی طرح کے معاشی و سیاسی وڈیرے بن گئے ہیں، یہ سب مل کر ایک ظالمانہ نظام کی محافظت کر رہے ہیں۔

یہ وہ اصل وجوہات اور ذرائع ہیں جن سے فی الحقیقت عام شہری پر اور کمزور و غریب پر ظلم ہو رہا ہے۔ درحقیقت ہمارے اس پورے نظام کا مرکزی نکتہ کمزوروں کو دبانا اور طاقتوروں کو تحفظ دینا ہے، اور یہی اصل خرابی ہے۔

مجوزہ قانون کی حقیقت

جنابِ والا! زیرِ بحث قانون میں تحفظ نسواں کا عنوان ضرور بنایا گیا ہے لیکن تحفظ نسواں کے لیے اس میں کوئی ایک بھی واضح قانونی ترمیم نہیں کی گئی ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ درحقیقت اس کے جو نتائج ہوں گے، وہ عورتوں پر ظلم کو بڑھانے کا ذریعہ بنیں گے۔

جنابِ والا! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حدود آرڈیننس کو ایک رکاوٹ بنا کر بتایا جا رہا ہے کہ وہ عورتوں کے خلاف ہے۔ حالانکہ اس میں خواتین کے خلاف کوئی امتیازی چیز موجود نہیں ہے۔ بلکہ اگر اس کا صحیح صحیح نفاذ ہو تو وہ عورتوں کے لیے ہر اعتبار سے اور ہر سطح سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس کے ذریعے سے عورتوں کو جو حق مل سکتا تھا، وہ اب نہیں ملے گا۔ مثال کے طور پر زنا بالجبر کے سلسلے میں جو گنجائش اس وقت موجود تھی کہ اگر زنا بالجبر پورا ثابت نہ ہو لیکن اغواء کرنا، دباؤ استعمال کرنا یا زیادتی کی کوئی اور شکل جو قانون کی تعریف کے مطابق زنا نہ ہو ثابت ہو جائے تو پھر بھی مجرم کو سزا دی جا سکتی ہے، یہ تحفظ عورت کے لیے حدود آرڈیننس میں موجود تھا، تحفظ نسواں قانون میں اب وہ باقی نہیں رہا ہے۔

سطحی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مجوزہ قانون میں پولیس کی مداخلت کو کم کیا گیا ہے، گو اس بارے میں بھی دو آراء ہو سکتی ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں آپ کو شہادت کے ساتھ بتاؤں گا کہ حدود قوانین کو جس طرح پولیس نے استعمال کیا ہے، وہ حدود قوانین کی غلطی نہیں ہے بلکہ پولیس کی غلطی ہے۔ ہمارے پورے نظامِ احتساب اور نظامِ عدل کی غلطی ہے جس نے پولیس کی زیادتیوں کو روکا، نہ ان کے ہاتھ پر قدغن لگائی اور یہ سلسلہ ستائیس سال سے برابر اسی طرح جاری ہے جس طرح دیگر تمام قوانین کے حوالے سے برسوں سے جاری ہے۔ آپ نے جو، اب کیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ سیشن جج اور سیشن کورٹ، شہروں کی حد تک تو متاثرین کے لیے قابل رسائی ہونگے لیکن ملک کے طول و عرض میں بالخصوص اگر دیہی علاقے میں کسی عورت کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو اب اس کو بہت دور سیشن کورٹ میں اپنا مقدمہ لے کر جانا ہو گا۔ اس کے لیے کتنے میل کا سفر، کتنا خرچہ اور کتنا وقت لگے گا اس پر آپ نے غور ہی نہیں کیا ہے۔ پھر متاثرہ فریق کے لیے مزید نئی پابندیاں لگائی گئی ہیں کہ درخواست کے ساتھ دو گواہ بھی ہوں۔ گویا کہ ایک مظلوم خاتون کے لیے آپ نے ناممکن کر دیا ہے کہ زیادتی کی صورت میں وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکے اور انصاف حاصل کر سکے۔ درحقیقت آپ کے قانون سے اس پر زیادتیاں بڑھیں گی، کم نہیں ہوں گی۔ قانون کے شعبہ سے وابستہ افراد بھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ کم از کم دو اہم

وکلاء ڈاکٹر فاروق اور اکرام چوہدری نے اعلانیہ یہ بات کہی ہے کہ اس قانون کے بعد عورتوں پر زیادتی اور عورتوں کا استحصال بڑھے گا، کم نہیں ہو سکتا ہے۔

جنابِ والا! اس تناظر میں اس قانون کو تحفظ نسواں کا نام دینا ایک مذاق، دھوکہ اور ایک قانونی زیادتی اور سقوط عدل ہے۔ جنابِ والا! دراصل یہ بل حدود قانون پر ایک حملہ ہے، اس کو تحفظ نسواں کا نام دیا جارہا ہے جبکہ یہ عملاً استحصال نسواں کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ میری نگاہ میں یہ دراصل لادینیت کا ایجنڈا ہے جسے اس وقت دنیا میں فروغ دیا جارہا ہے۔ اور یہ اسی ایجنڈے کا حصہ ہے جس کے تحت اسلامی حدود پر، خصوصاً اس میں متعین کی گئی سزاؤں پر مغربی دانشور اور مبلغین اعتراض کرتے رہے ہیں۔ وہ سارے اس بات کو بھول کر برابر طعن کرتے رہے ہیں کہ وہ جن سزاؤں پر معترض ہیں تلمود، بائبل، دوسرے مذہبی صحائف اور دوسری تہذیبوں کے اندر بھی یہی اور اس سے سخت قوانین موجود رہے ہیں۔ وہ اس بات کو بھی نظر انداز کر رہے ہیں کہ جس دنیا کو آج مہذب دنیا کہا جاتا ہے، اس دنیا میں کیسے کیسے قوانین اور انصاف کے نام پر کیسی کیسی غیر مہذب حرکتیں روا رکھی گئی ہیں۔

جنابِ والا! میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یورپ میں ابھی بیسویں صدی میں یہودیوں، خانہ بدوشوں اور اقلیتوں کے ایک دو نہیں، لاکھوں انسانوں کو سسکا سسکا کر مارا گیا ہے۔ شہادتیں موجود ہیں کہ زندہ انسانوں کی کھالیں اتاری گئیں، اعضاء کاٹے گئے اور مُردوں کی چربی سے صابن بنایا گیا۔ یہ ساری چیزیں اس مہذب یورپ میں، اسی بیسویں صدی میں ہوئی ہیں۔ آج بھی گوانتاناموبے، ابوغریب اور بگرام کی جیلوں میں ناٹک کے نام پر سی آئی اے کے ذریعے، یورپ کے بارہ ممالک میں ظلم کی انتہا ہو رہی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ میں ایسے ۸۰۰۰ افراد کا اندراج ہے جنہیں اغوا کیا گیا ہے۔ جنابِ والا! ان ۸۰۰۰ لاپتہ افراد میں سے ۳۰۰۰ امریکہ میں پکڑے گئے ہیں ان میں سے صرف ۴۰ پر مقدمہ کیا گیا ہے۔ پانچ سو، ساڑھے پانچ سو گوانتاناموبے میں ہیں۔ جہاں انھیں پانچ سال گزر گئے ہیں اور ابھی تک چار کو سزا ہوئی ہے۔ یہ انسان سولی پر لٹکائے ہوئے ہیں، کیا انسانیت اور انسانی حقوق اسی کا نام ہے؟

بیرونی اعتراضات اور ان کے اہداف

جنابِ والا! ہمارے قوانین پر بیرونی سیاستدانوں اور میڈیا کو اس طرح کے اعتراضات کرنے کا کیا حق ہے؟ اقوام متحدہ کا ۱۹۴۸ء کا انسانی حقوق کا چارٹر صاف کہتا ہے کہ انسانی حقوق ایک آفاقی قدر ہے لیکن ان کا نفاذ اور احترام ہر ملک میں اس کی مذہبی اور ثقافتی اقدار کی مناسبت سے کیا جائے گا۔ امریکہ کی سپریم کورٹ کے ایک اہم فیصلہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ایسا عمل جو شہریوں کی اکثریت کے مذہبی عقائد کو مجروح کرنے والا ہو، جرم کے زمرے میں آتا ہے۔

جنابِ والا! آپ اتفاق کریں یا اختلاف کریں، ہمارا اپنا دین ہے، ہمارا اپنا نظام قانون اور ہماری اقدار ہیں۔ قرآن پاک نے کچھ اعمال کو جرم اور گناہ قرار دیتے ہوئے ان کے لیے سزا مقرر کی ہے۔ حدیث میں نبی ﷺ نے اس کی تشریح کی ہے اوراس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ یہ سب ہماری پوری تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ہمارے دین اور ہماری تہذیب کا حصہ ہے، اس پر ان کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ ان کے اپنے تضادات کا حال یہ ہے کہ اگر فرانس میں مسلمان عورت سر پر دوپٹہ لیتی ہے تو وہ قانون بناتے ہیں کہ تم یہ نہیں کر سکتیں۔ اور دوسری جانب آج یورپ سمیت دنیا کے ساٹھ ممالک میں یہ قانون موجود ہے کہ اگر کوئی شخص خواہ علمی انداز میں ہولوکاسٹ[1] کا انکار کرتا ہے تو یہ ایک مجرمانہ حملہ قرار پاتا ہے، جس پر اسے قید کی سزا جرمانے کے ساتھ دی جاتی ہے۔

---

[1] ہولوکاسٹ، امریکی نقطۂ نظر کے مطابق جرمنی کی نازی حکومت نے ہٹلر کی قیادت میں ۴۵-۱۹۴۱ء کے دوران ۶۰ لاکھ یورپین یہودیوں کو قتل کیا۔ اس قتل کی وجہ یہ تھی کہ جرمن ان یہودیوں کو پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۸-۱۹۱۴ء) میں جرمنی کی شکست اور جرمنی کی معاشی، سیاسی اور سماجی بدحالی کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس قتل عام کو ہولوکاسٹ کا نام دیا گیا۔

۳۹-۱۹۳۸ء کے دوران جرمنی نے آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور چیک علاقوں پر قبضہ کے بعد ۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اس دوران یورپ کے بڑے علاقے اور روس کے مغربی علاقے پر قبضہ کے ساتھ اس کا اٹلی، ہنگری، رومانیہ اور بلغاریہ سے بھی اتحاد ہو گیا۔ اس عرصہ میں ہی دو نئی ریاستیں سلوویکیا اور کروشیا وجود میں آئیں جو جرمنی کی حامی تھیں۔ دوسری جانب اس اتحاد میں جاپان بھی شامل ہو گیا۔ امریکیوں کا کہنا ہے کہ ساٹھ لاکھ یہودیوں کا قتل عام جرمنوں اور ان کے اتحادیوں نے کیا۔

امریکی جدید قدامت پسندوں کی حکمت عملی: جناب چیئر مین! جو عناصر ہم پر زبان طعن دراز کرتے ہیں، انہیں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے۔ ہمارے قوانین کا دفاع ہمارا فرض ہے۔ علمی طور پر وہ جو بھی تنقید ان قوانین پر کریں، سر آنکھوں پر۔ لیکن کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ایک خود مختار قوم کی قانون سازی کے نظام میں سیاسی مداخلت کرے یا دباؤ ڈالے۔ ایسے عناصر جنابِ والا! ملک میں بھی ہیں لیکن اس سے زیادہ بیرونی ممالک میں ہیں۔

جنابِ والا! یاددہانی کے لیے میں متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے جدید قدامت پسندوں نے بنیادی طور پر پانچ چیزوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے اہداف تشکیل دیے ہیں۔ پہلی یہ کہ اسلام، اگر صرف عبادات ہوں، جسے وہ صوفی اسلام کہتے ہیں، تو وہ بہت خوش ہیں۔ لیکن اگر اسلام کے معنی اجتماعی زندگی ہے، قانون ہے، سیاست ہے اور استحصال کے خلاف جنگ ہے تو یہ ان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سیاسی اسلام، انتہا پسند اسلام، حرکی اسلام کی اصطلاحات وضع کی ہیں یہی نہیں بلکہ امریکی صدر بش نے اگست ۲۰۰۶ء میں اپنی ایک تقریر میں یہاں تک کہا ہے کہ جو کچھ دہشت گردی ہو رہی ہے، اس کی وجہ اسلام و فاشزم ہیں۔ اسی طرح ٹونی بلیئر نے آسٹریلیا میں تقریر کی ہے، اس میں یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ اس کے پیچھے برے نظریات ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیز مدرسہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مدرسہ کی صورت میں دینی تعلیم کا یہ سلسلہ مسلمانوں کو اپنی شناخت کو قائم رکھنے میں مدد دے رہا ہے۔

جنابِ والا! اس کے بعد تیسرا ہدف مسلمان عورت ہے۔ مسلمان عورت کے حقوق، اس کی آزادی، امت کے استحکام اور ترقی میں اس کا کردار، یہ ہماری بنیادی اقدار ہیں لیکن یہ لوگ مسلمان عورت کو ٹارگٹ کر کے ایک تصادم کا ماحول پیدا کر رہے ہیں۔ یورپ میں عورت اور مرد کے تصادم کے نام پر جو رواج پروان چڑھا ہے وہ یہاں پر پیدا کرنا چاہ رہے ہیں۔ چوتھی چیز جنابِ والا! اسلامی قوانین ہیں جن میں نام لے کر حدود، ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کا قانون اور ختم نبوت ﷺ کے قانون کو ٹارگٹ کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر پچاسیوں مضامین

میری نگاہ سے گزرے ہیں یہ میرے پاس موجود بھی ہیں لیکن اس میں سب سے اہم چیز خود ۹/۱۱ کمیشن کی رپورٹ اور ترقیاتی حکمت عملی ۲۰۰۴ء ہے جسے امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل نے پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے ۲۰۰۳ء کی امریکہ کی انسانی حقوق رپورٹ بھی قابل ذکر ہے جو ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں کہ جب تک ان ممالک میں حدود قوانین ہیں خاص طور پر پاکستان میں اس وقت تک وہاں پر اور پوری دنیا میں کوئی میانہ روی نہیں آسکتی۔ یہ میانہ روی اور روشن خیالی کے خلاف ہے۔ اسی طریقے سے وہ دستوری ترمیم چوتھا ہدف ہے جو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلوانے کے لیے ۱۹۷۴ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں قومی اسمبلی اور سینیٹ نے متفقہ طور پر پاس کی تھی۔ پانچویں چیز جنابِ والا! ہمارا تصور جہاد ہے جو کسی کے بھی خلاف جارحیت نہیں لیکن بلاشبہ وہ یہ اصول ہے کہ ظلم کے خلاف جدوجہد میں مزاحمت ہمارا حق ہے۔ نام لے کر کہا گیا کہ یہ ہمارے اصل ٹارگٹ ہیں۔

جنابِ والا! اس پسِ منظر میں میری نگاہ میں یہ بل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کا ثبوت میں یہ دیتا ہوں کہ جنرل مشرف صاحب نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سیکولرازم اور کمال ازم کا بار بار اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ یہاں پر اسی نظام کو لانا چاہتے ہیں انھوں نے ایک بار نہیں، دس بار کوشش کی ہے کہ حدود قوانین کو ہدف بنائیں لیکن ایک قدم آگے بڑھاتے تھے اور عوامی دباؤ کی بناء پر دو قدم پیچھے جاتے تھے۔ یہ کشمکش پورے سال رہی۔ ان کی کتاب ''In the Line of Fire'' میں تین مقامات پر حدود قوانین کے بارے میں لکھا ہے کہ میں اس کے اوپر بے حد پریشان رہا ہوں۔ دراصل یہ ان کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحفظ نسواں کے نام سے یہ چھوٹا سا قانون دباؤ کے تحت قومی اسمبلی میں پاس کرایا گیا ہے۔ یہ میں ثابت کروں گا جنابِ والا! سارے دستوری آداب، جمہوری روایات، پارلیمانی نظام کے بنیادی اصول کو ترک کر کے اب اسے سینیٹ میں پاس کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن جنابِ والا! مجھے یاد دلانے دیجیے کہ ہمارا دستور وفاق کی علامت ہے، وہ کسی پارٹی کا نہیں ہے۔ پارلیمنٹ مجموعی طور پر وفاق کی نمائندگی کرتی ہے اور اس نے

ابھی اس ترمیم کو پاس ہی نہیں کیا۔ ابھی تو صرف ایک ایوان یعنی قومی اسمبلی نے پاس کیا ہے۔ ابھی تو اس نے سینیٹ میں آنا ہے۔ اگر وزیراعظم یا وزیرِ قانون یہ اعلان کرتے تو چلیے اس کو بھی ایک پہلو سے قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صدر کو کیا حق ہے کہ وہ اس طریقے سے ٹی وی پر آکر اس کا دفاع کرے۔ دفاع ہی نہیں اس کا پرچار کرے۔ پرچار ہی نہیں اس کے ذریعے ملک میں 'آزاد خیال' اور 'بنیاد پرستوں' کے درمیان ایک جنگ کا اعلان کردے اور یہ کہے کہ یہ آزاد خیالی اور روشن خیالی کی فتح ہے۔ اب ملک میں یہ دو قوتیں ہیں اور وہ عوام سے اپیل کریں کہ میرے ہمنواؤں اور میرے ساتھیوں کی مدد کرو اور ووٹ دو۔

اصل مقصد: جنابِ والا! یہ تحفظ خواتین کا بل نہیں، یہ دراصل لادینیت پر مبنی مہم کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس بل کے آنے کے بعد سب سے زیادہ خوشی جس کو ہوئی ہے وہ وائٹ ہاؤس ہے جس کے ترجمان نے بڑے ہی جوش کے ساتھ کہا ہے کہ یہ بڑا ہی صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ اور پھر ساتھ ہی زور دے کر کہا ہے کہ ابھی صرف یہ پہلا قدم ہے۔ پھر جس طرح ان کا طریقہ ہے وہ شاباش دینے کے ساتھ ساتھ مسلسل جنرل صاحب کا بازو مروڑتے ہیں۔ کہ تم نے یہ کام تو کر دیا، شاباش شاباش، لیکن اب اور کرو۔ (Do more)۔ بعینہ وہی چیز انہوں نے یہاں اختیار کی اور اس بیان میں بھی یہی بات کہی گئی۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی وزیرِاعظم ٹونی بلیئر (۱۹ نومبر ۲۰۰۶ء) یہاں آئے ہوئے تھے۔ مجھے بھی ان سے ملنے کا موقع ملا۔ ہم نے انہیں اپنا موقف کُھل کر بتایا۔ لیکن اپنی پریس کانفرنس میں انہوں نے اس قانون کا بڑا خیر مقدم کیا۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ابھی یہ پہلا قدم ہے۔ ابھی آپ کو بڑے شب خون مارنے ہیں۔ بہت ضربیں لگانی ہیں۔ دوسری جانب واشنگٹن ٹائمز (۱۸ نومبر ۲۰۰۶ء) نے اداریے میں لکھا ہے:

> بدھ کو پاکستان کے ایوان زیریں نے عصمت دری کے قانون میں جو ترامیم کی ہیں وہ حقوق نسواں اور سیکولر قانون کے غلبے کے لیے ایک پیش رفت ہے۔ پوری مسلم دنیا میں اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

مزید لکھتا ہے کہ:

مسلم دنیا کے دیگر ممالک کے لیے بشمول ایران اور سعودی عرب، جہاں حدود آرڈیننس جیسے قوانین ہیں پاکستان کی اس پیش رفت میں غیر معمولی اہمیت کا سبق موجود ہے۔

اسی طرح انٹر نیٹ پر اور بہت سامواد موجود ہے۔ آپ دیکھیے کہ کس طرح مخصوص لابیز کی جانب سے خوشیاں منائی جارہی ہیں، یہاں بھی ان نام نہاد روشن خیال طبقات کی جانب سے اس قانون کی اسمبلی سے منظوری پر مٹھائیاں تقسیم کی گئی ہیں۔ یہ دراصل ایک سیاسی جھگڑا اور حقیقت میں بین الاقوامی سازش اور کھیل کا ایک حصہ ہے اور اس میں جنرل پرویز مشرف ایک کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ درحقیقت انھوں نے اپنا ذاتی اثر، وردی کا اثر، اور دوسرے درجے کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اسے اسمبلی سے پاس کروایا ہے۔

جنابِ والا! اس میں اصل ہدف یہ قانون نہیں ہے بلکہ اصل ہدف اسلام، اسلام کا قانون اور حدود اللہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو سنجیدگی کے ساتھ لے رہے ہیں اور لیں گے ان شاء اللہ۔ جس لڑائی کا انہوں نے اعلان کیا ہے اور جس مبازرت کی انھوں نے دعوت دی ہے ہم اس کا بھرپور مقابلہ پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ کے باہر کریں گے۔ پوری قوم ہمارے ساتھ ہو گی اور ہم دیکھیں گے کہ کس طرح اس ملک سے اسلامی قوانین کو مٹانے کا کام کوئی انجام دے سکتا ہے۔

جنابِ والا! اسلام کا یہ اصول ہے کہ انسان کمزور ہے، گناہ گار ہے غلطی ہو سکتی ہے اور توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے اور غفار ہے، گناہ ایک چیز ہے اور اللہ کے احکام کا انکار ایک چیز ہے۔ گناہ گار ہونے کے معنی ہیں کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور اس کی سزا ہے۔ انکار کے معنی ہیں کہ آپ دعوت دے رہے ہیں اللہ کے عذاب کو۔ اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہہ رہے ہیں وہ نعوذ باللہ غلط ہے۔ اس کے مقابلے میں

جو میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو انسان کو کفر کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو اللہ کے غضب کو دعوت دیتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہماری دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کرنے والی ہے۔ جنابِ والا! اگر آپ کسی ایک حکم یا کسی ایک آیت کا انکار کرتے ہیں تو یہ انکار اللہ سے انکار اور یوں اللہ کے قائم کردہ اصولوں سے انکار کے مترادف ہے اور یہ انسان کو اسلام کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔

اب کیا کیا جائے؟

اراکین سینیٹ سے اپیل: جنابِ والا! میں بڑے ادب اور بڑی دل سوزی کے ساتھ سینیٹ میں اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں سے کہوں گا کہ خدا کے لیے اس بل کو دوسری بہت سی چیزوں کی طرح محض ایک سیاسی چیز نہ سمجھیے۔ سیاست وہ چمکا رہے ہیں جو مغرب کو خوش کر کے وہاں سے سرٹیفکیٹ اور تائید لینے کے لیے اور اپنی سیاہ کاریوں اور فوجی وردی کو تحفظ دینے کے لیے اللہ کے دین کو استعمال کر رہے ہیں اور اللہ کے دین کو ضرب لگا رہے ہیں۔ ان کی سیاست کفار کو خوش کرنے کے لیے ہے۔ لیکن بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم پارٹی ڈسپلن نہیں بلکہ اپنے ضمیر اور ایمان کے مطابق پوری دیانت داری کے ساتھ اکٹھے رہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی چیز دین کے خلاف نہیں ہے تو آپ کا حق ہے لیکن بہرحال اللہ کے سامنے آپ جوابدہ ہوں گے لیکن اگر یہ شریعت اور قرآن کے خلاف ہے اور آپ محض دباؤ کی بنا، پر اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو بہت بڑے خطرے سے دوچار کر رہے ہیں۔

میں ایک اور پہلو بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھیے اگر اس ملک میں حدود قوانین نہ ہوتے اور ۱۹۷۷ء تک نہیں تھے تو یہ ایک کمزوری تھی اور شاید یہ گناہ بھی تھا ہمارے لیے شرمندگی کی بات تھی لیکن اب جب یہ قوانین کتاب قانون کا حصہ بن چکے ہیں تو کتاب قانون سے اسے مٹانا، حذف کرنا اور نکالنا یا اس کی تنسیخ، جنابِ والا! یہ اس سے بڑا جرم ہے۔ یہ صرف گناہ نہیں یہ اللہ کے ساتھ بغاوت ہے اور یہ اللہ کے غضب کو دعوت

دینے والی چیز ہے۔ یہ ہر مسلمان کے لیے ناقابل قبول ہو گی۔ اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال دینا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص روزہ نہ رکھے تو اس پر گناہ ہے لیکن اگر روزہ رکھ کر بلا عُذر توڑ دیتا ہے تو پھر اس کو سخت سزا ہے۔ خدارا مغرب کو اور نام نہاد روشن خیال، آزاد روالابی کو خوش کرنے کے لیے اللہ کے قانون کو بدلنے کی غلطی نہ کیجیے۔

صدر مملکت سے اپیل: جنابِ والا! ہم نے جناب مفتی محمد تقی عثمانی، سابق جج فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ اپیلیٹ بنچ کی ایک تحریر آپ کو دی ہے۔ اس کے علاوہ چوہدری شجاعت حسین [حکمران جماعت پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ] کے ساتھ جن علماء کی کمیٹی بنائی گئی تھی، اس کمیٹی کے ارکان، شیخ الحدیث مولانا سمیع الحق، جسٹس تقی عثمانی، مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد حسن جان، مولانا ڈاکٹر محمد عبد الرزاق، مولانا محمد حنیف جالندھری نے مشترکہ بیان دیا ہے[1]۔ جس میں یہ صاف کہا ہے کہ صدر مملکت پرویز مشرف کی نشری تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ وہ حدود آرڈیننس کے بارے میں محض یک طرفہ پریزنٹیشن سے متاثر ہو کر شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی مظلوم خاتون کو بلاوجہ قید کر دینا یقیناً بہت بڑا ظلم ہے جس کی کوئی بھی غیرت مند شخص حمایت نہیں کر سکتا۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا حدود آرڈیننس کے تحت کبھی ایسا ہوا کہ محض چار گواہ نہ ہونے کی وجہ سے کسی مظلوم خاتون کو قید کر دیا گیا ہو اور اگر بالفرض کہیں ایسا ہوا ہے تو وہ حدود آرڈیننس کی خامی کی وجہ سے تھا یا کسی اور وجہ سے۔ نیز کیا یہ صورتحال اس وجہ سے جواز پیدا کرتی ہے کہ زنا بالجبر پر قرآن و سنت نے جو سخت سزا حد کی صورت میں مقرر کی ہے اس کو بالکل ختم کر دیا جائے؟ کیا اس قسم کے کسی مبہم خطرہ کا سدباب کسی اور طریقے سے نہیں کیا جا سکتا؟ افسوس ہے کہ ان معاملات میں صدر مملکت نے صرف یکطرفہ مؤقف سنا اور دوسرے مؤقف کو سُنے بغیر ایک رائے قائم کر لی ہے۔ جس کے نتیجے میں زنا بالجبر کی ترمیم سے قرآن و سنت کے مطابق مقرر کی ہوئی حَد، سزا بلاوجہ ختم کر دی گئی ہے۔ ہم صدر مملکت سے مطالبہ کرتے ہیں

---

[1] مشترکہ خط اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ کیجیے۔

کہ اس بل پر دستخط کرنے سے پہلے ہمیں وضاحت کا ایک موقع دیں۔ تاکہ ہم اپنی معلومات اور تجربے کی روشنی میں صحیح صورت حال بیان کر سکیں۔

زنا بالجبر کے مرتکب کے لیے سزا: جنابِ والا! یہ بیان کسی ایک نکتہ نظر کا اور مکتب فکر کا نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام اہل علم جنہوں نے اس موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے ان کی عظیم اکثریت زنا بالجبر کے مرتکب کو حَد کی سزا کا مستحق قرار دیتی ہے۔ یہ صورتحال دوسری صدی سے لے کر آج تک کے فقہاء اور اہل علم کی ہے، مجھے معلوم ہے کہ ایک محدود درائے اختلاف کے ساتھ بھی موجود ہے لیکن وہ بھی یہ نہیں کہ حَد نہیں ہے بلکہ وہ یہ ہے کہ کیا اس کی سزا زنا کی حَد ہو گی یا حرابہ کی حَد ہو گی۔ جو اجماع ہے وہ یہی ہے کہ زنا بالرضا اور زنا بالجبر دونوں جرم ہیں۔ بلا شبہ ان کی نوعیت میں فرق کے باوجود دونوں صورتوں میں چار گواہ کی شرط ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جیسا کہ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ کیسے بے ضمیر لوگ ہوں گے جو زنا بالجبر ہوتے ہوئے دیکھیں اور گواہی دینے کے لیے انتظار کریں اور ان بندوں کو نہ روکیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا بالجبر کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ عورت کے اوپر زیادتی کی جا رہی ہے، ظلم کیا جا رہا ہے، تشدد کیا جا رہا ہے تو وہ روئے گی، چیخے گی، مدد کے لیے لوگوں کو پکارے گی۔ مدد کے لیے پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ آئیں گے۔ زنا بالرضا کے اندر تو رازداری ہے اور اسی لیے اس کے لیے سزا رکھی ہے کہ جب فحاشی اس وسعت پر ہو کہ وہ کھلے طور اس طرح کی جا رہی ہے کہ چار لوگ دیکھنے والے ہوں وہ موجب سزا ہے ورنہ سزا نہیں۔ لیکن زنا بالجبر کے ساتھ تو معاملہ کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ چیخے گی اور مدد کے لیے لوگوں کو پکارے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شہادت ہونی چاہیے۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ اگر کسی واقعہ میں ایسی شہادت نہیں ہے، اور بلا شبہ اس کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں تو حدود آرڈیننس کے تحت قطعاً مظلوم عورت زنا کی مرتکب قرار نہیں دی جاتی۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ جس کے ساتھ جبراً یہ زیادتی ہوئی ہے اس پر حَد نہیں ہے وہ معصوم ہے اور جنہوں نے یہ حرکت کی

ہے ان پر سزا ہے۔ اگر ان کی سزا چار گواہوں کی صورت میں ثابت نہ ہو سکے تب بھی اگر قرائن موجود ہیں اور واقعاتی و طبعی شہادتیں موجود ہیں تو ان کو تعزیراً سزا دی جائے گی۔ حَد اور تعزیر پورے نظامِ قانون کا بیک وقت حصہ ہیں۔

جنابِ والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ زنا بالجبر کا مرتکب اسی طریقے سے گناہ کا ذمہ دار اور اسی طریقے سے مجرم ہے اور اسی طریقے سے ایک حَد کا مستحق ہے جس طرح زنا بالرضا کا مجرم ہے لیکن اس قانون میں سے اسے نکالا جا رہا ہے۔

اسلام کے خلاف ایک عالمگیر جنگ کا حصہ

جنابِ والا! بیرونی اعتراضات اور اہداف کی روشنی میں جن کی جانب میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں میری نظر میں اپنے جوہر کے اعتبار سے یہ مجوزہ قانون حدود اللہ پر ایک حملہ ہے۔ اگر میں اسے انہدامِ حدود اللہ قانون کہوں تو غلط نہیں ہوگا اور یہ دراصل اسلام پر حملہ کا عنوان ہے۔ اسلام کے سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظام پر حملہ کا اور یہ ہمارے ملک کے لادین عناصر، نام نہاد لبرل عناصر لیکن اس سے زیادہ بڑھ کر امریکہ اور مغرب کی اس وقت اسلام کے خلاف ایک عالمگیر جنگ کا حصہ ہے۔ اس جنگ میں ان کے پانچ اہداف ہیں۔ پہلا یہ کہ اسلام کو ایک دین، ایک اجتماعی نظام، ایک نظامِ معاشرت، ایک تہذیب کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے بلکہ صرف عبادات اور اخلاقیات کے مجموعے کے طور پر لیا جائے جسے وہ 'صوفی اسلام' کہتے ہیں۔ دوسرا تعلیم خصوصاً دینی تعلیم، یہ ان کی نگاہ میں سارے فساد کی اصل جڑ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک دینی تعلیم موجود ہے، مسلمان مسلمان رہے گا اور جب تک کہ اس تعلیم کو کسی نہ کسی طرح زہر آلود نہ کر دیا جائے، وہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔

تیسرا ہدف مسلمان عورت ہے وہ مسلمان ماں جس نے ہماری تہذیب کی سب سے زیادہ حفاظت کی ہے اور جو اس کی امین رہی ہے۔ درحقیقت خاندان وہ قابلِ بھروسہ ادارہ ہے کہ جب ہر محاذ پر ہم پٹ گئے، تب بھی خاندان نے ہمیں بچایا۔ ماں (عورت) کے کلیدی

کردار سے ہی خاندان کا ادارہ وجود میں بھی آتا ہے اور مستحکم بھی رہتا ہے چنانچہ ان کا ہدف عورت ہے۔ چوتھی چیز، اسلامی قوانین اور اس میں خاص طور پر حدود کے قوانین، ناموسِ رسالت ﷺ کا قانون اور ختم رسالت ﷺ کا قانون ہے۔ نام لے لے کر، پوری مغربی تصانیف میں انھیں ہدف بنایا گیا ہے۔ پانچویں چیز جہاد ہے۔ تصور جہاد مسلمانوں میں مزاحمت اور مدافعت پیدا کرتا ہے اور ظلم سے ٹکر لینے کے لیے وہ تیار ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے کچھ مہربان اپنی سادگی یا مفادات کی خاطر اس جنگ میں ان کے اہداف کی تکمیل کے لیے شریک ہو گئے ہیں۔ یہ بل اس کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے بڑی اہمیت دے رہے ہیں۔

مجوزہ قانونی بل پر اعتراضات

اس طرح جنابِ والا! خالص شرعی اور دینی مرکز کی طرف سے اس بل پر چھ موٹے موٹے اعتراضات ہیں اور اس سلسلے میں وہ علماء کمیٹی جس سے مشاورت ہو رہی تھی، اس کا بیان بھی واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔ جسٹس (ریٹائرڈ) مولانا تقی عثمانی نے اپنے مضمون میں جسے ہم نے یہاں تقسیم بھی کیا ہے۔ شرعی دلائل کے ساتھ مؤقف پیش کیا ہے۔ میں یہاں ان کے دلائل دہراؤں گا نہیں لیکن ان کی جانب اشارہ ضرور کروں گا۔

حد اور تعزیر میں فرق: پہلی چیز حد اور تعزیر کے تصورات سے متعلق ہے۔ زنا بالجبر اسلام میں گناہ بھی ہے اور جرم بھی ہے اور یہ جرم ایک 'حد' ہے۔ 'حد' نام ہے اس سزا کا جو متعین جرائم کے لیے شریعت نے مقرر کی ہے۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی انسان نہیں کر سکتا۔ باقی تمام جتنی بھی چیزیں ہیں، ان کا تعلق تعزیر سے ہے۔ اس لیے 'حد' اور تعزیر ہمارے دو مستقل کلاسیکل تصورات ہیں۔

'حد' کا تصور ایک بڑا ہی نازک اور خوبصورت تصور ہے اور جنابِ والا! اسلامی شریعت کے مقاصد سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ مسلمان فقہاء اور ماہرین نے ان مقاصد کو پانچ

بڑے عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے دین کی حفاظت کہ ایمان سب سے اہم ہے۔ دوسرا عقل کی حفاظت کہ اس کے بغیر آپ کوئی چیز سمجھ نہیں سکتے، اس کے تقاضے پورے نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد جسم و جان یعنی نفس کی حفاظت کہ ان سب کے لیے آپ کو نفس کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد پھر نسل اور مال کی حفاظت۔ یہ پانچوں ضروریات ہیں اوران پانچوں ہی کی حفاظت کے لیے ہمارا فوجداری قانون ہے۔ اور آپ جانتے ہیں جنابِ والا! کہ تعریف کے مطابق قانون تعزیرات کسی معاشرے کی اقدار کا محافظ ہوتا ہے۔ تو شریعت نے بہت لمبا چوڑا فوجداری قانون نہیں بنایا، جس طرح دنیا کے بہت سے ممالک میں ہوتا ہے۔ یہاں صرف حدود ہیں اور وہ صرف پانچ ہیں۔ اور دین کی، عقل کی، نفس کی، نسل کی اور مال کی حفاظت کے لیے ہیں باقی تمام تعزیرات ہیں۔

ان کے بعد جتنے بھی آپ کے ضوابط ہیں، جتنے بھی آپ کے جرائم ہیں، ان کی جو بھی سزائیں ہیں، ان پر آپ مشاورت سے اور شریعت کے اصولوں کی روشنی میں تعزیرات کا نظام بنالیں لیکن ان حدود کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا نہ ہی ان پر کسی قسم کی کوئی مصالحت کر سکتا ہے۔ قرآن پاک نے اس سلسلے میں صاف الفاظ میں سورۃ نور[1] میں یہ کہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ 'حَد' ہے اور اس 'حَد' پر عملدرآمد کے لیے تم میں کوئی نرمی نہ آئے۔ اللہ رحیم و رحمٰن ہے۔ اللہ جانتا ہے کہاں رحم چاہیے اور کہاں سختی چاہیے۔ تم نہیں جانتے۔ تمہارا کام اللہ کی حدود کو نافذ کرنا ہے، ان سے فرار، ان کا مٹانا، ان کو ختم کرنا نہیں ہے۔

جنابِ والا! اس بل میں جو سب سے پہلا جرم کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سے جو بغاوت کی گئی

---

[1] اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ (النور ۲:۲۴)

زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامنگیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اُن کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔

ہے، وہ زنا بالجبر کو حَد کے دائرے سے نکال کر اسے ایک عام تعزیری سزا بنا دیا گیا ہے۔ یہاں میں آپ کو یاد دلاؤں کہ شریعت نے زنا کے سلسلے میں بلا شبہ دو معاملات میں تفریق کی ہے۔ ایک زنا بالرضا، دوسرا زنا بالجبر۔ دوسری یہ کہ زنا کرنے والا غیر شادی شدہ ہے یا شادی شدہ ہے۔ محسن اور غیر محسن یہ دو تفریق کی ہیں۔ اور ان دونوں میں سزا مختلف ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ جو شادی کے باوجود یہ کام کرتا ہے اس کو سزا سخت دی جائے لیکن جبر اور رضا میں بھی 'حَد' مقرر ہے۔ فرق یہ ہے کہ رضا میں حَد دونوں طرف مرد اور عورت، زانی اور زانیہ پر جاری ہوتی ہے لیکن جبر کی صورت میں صرف جبر کرنے والے پر ہوتی ہے۔ جو مجبور اور مظلوم ہے اس پر نہیں ہوتی۔ نبی پاک ﷺ نے صاف کہا ہے کہ زنا بالجبر میں جس نے زنا کیا ہے اس پر 'حَد' جاری ہو گی اور عورت جو مظلوم ہے وہ پاک ہے اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں یہ بھی آپ سے عرض کر دوں کہ صرف ایک عورت کی گواہی کو بھی اس معاملے میں قبول کیا گیا ہے۔ در حقیقت اس نوع کے واقعات کی روشنی میں وہ اعتراض بھی بے معنی ہو جاتا ہے جو عورت کی گواہی کے بارے میں اٹھایا جاتا ہے۔ یعنی شرعی پوزیشن یہی ہے کہ متاثرہ عورت کے اوپر اس معاملے میں کوئی تعزیر ہے نہ 'حَد' ہے۔ وہ مظلوم ہے چنانچہ وہ رحم اور عزت کی مستحق ہے۔ ہمارا سارا کا سارا غصہ اور سزا اس شخص کے لیے ہے جو اس جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ اسلام کا فریم ورک ہے۔ اس کے برعکس بل میں زنا کی جملہ صورتوں میں 'حَد' کو نکال کر تعزیر میں لے رہے ہیں۔ یہ قرآن اور حدیث کے اوپر، اسلامی قانون کے اوپر اور اسلامی روایات پر ایک ضرب ہے۔ یہ نا قابل برداشت ہے۔

اسلامی و مغربی قانون میں زنا کا تصور: جنابِ والا! دوسرا اعتراض زنا کی تعریف کے حوالہ سے ہے۔ مغرب کے تصور قانون میں زنا جو ہے وہ ایک فرد کے خلاف جرم ہے۔ اس لیے انگریزی قانون کے اندر زنا اور زنا بالجبر یہ دو جرم ہیں۔ چنانچہ وہاں زنا کے لیے استعمال ہونے والے لفظ adultery کا مطلب ہے کہ شادی شدہ خاتون کے ساتھ شوہر کی اجازت کے بغیر زنا کیا جائے۔ یعنی جرم یہ ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر زنا کیا جائے اور اگر عورت کی رضا

کے بغیر زنا کیا جائے تو یہ زنا بالجبر ہے اور بلاشبہ اس میں عورت مظلوم ہے کیونکہ اس میں وہ راضی نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ راضی ہے تو پھر یہ جرم نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے مقابلے میں زنا ایک گناہ ہے، زنا ایک جرم ہے۔ یہ حدود اللہ ہے اور اس کے معنی ہیں یہ صرف ایک فرد کے خلاف جرم نہیں، یہ معاشرے کے خلاف جرم ہے۔ اس کے برعکس اس بل میں یہ کہا گیا ہے کہ زنا کو پبلک لاء کی بجائے یعنی معاشرے کے خلاف جرم کی بجائے مغرب کے تصور قانون کے مطابق فرد کے خلاف جرم سمجھا جائے۔ یہ تنزل کی جانب بہت بڑا قدم ہے جو اسلام کے پورے تصور قانون سے متصادم ہے۔

حد کی سزا میں تخفیف نہیں: جنابِ والا! تیسری بات یہ ہے کہ حد کی سزا کے بارے میں شریعت کا واضح حکم ہے کہ اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ نے بھی چوری کی ہوتی تو اس پر بھی 'حد' جاری ہوتی۔ یہ ہمارا مسلمہ اصول ہے کہ 'حد' میں تخفیف کرنے کا اختیار حاکم وقت کو نہیں ہے۔ اس ترمیم کے ذریعے سے صوبائی حکومتوں کو 'حد' کی سزا میں بھی تخفیف کا اختیار دیا جا رہا ہے۔ یہ تیسری چیز ہے جو بل میں اسلامی قانون کے خلاف ہے۔

حدود قوانین کی بالاتر حیثیت کا خاتمہ: جنابِ والا! چوتھی اہم چیز حدود آرڈیننس کی دفعہ تین سے متعلق ہے۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ حدود آرڈیننس ملک کے باقی تمام قوانین کے اوپر فائق تر مقام پر ہے۔ کسی بھی دوسرے سول اور فوجداری قانون کے ساتھ اس میں کوئی تضاد ہے تو حدود بالاتر ہیں یعنی خدا کا قانون بالاتر ہو گا۔ یہ بڑا بنیادی اصول ہے اور یہ بالکل قرآن کا فیصلہ ہے کہ جس چیز کو اللہ اور رسول ﷺ طے کر دیں اس کے بعد پھر اختیار نہیں رہتا کہ تم اس کے برعکس کوئی فیصلہ کرو۔ جنابِ والا! زیر بحث بل میں یہ شق ختم کی گئی ہے اور دو الگ الگ خانے بن گئے ہیں۔

دو متضاد قوانین: پانچواں اعتراض جنابِ والا! یہ ہے کہ بیک وقت دو متصادم قوانین رائج کیے جا رہے ہیں۔ اسلام میں بلاشبہ تعزیر کا تصور موجود ہے اور تعزیر ہمارے قانون کا لازمی حصہ

ہے۔ اصول فقہ کی کتابیں دوسری صدی سے لے کر آج تک پڑھ لیجیے، حدود کے بعد تعزیر کا ذکر آتا ہے۔ اور یہ دونوں مل کر ایک مجموعی نظام بنتے ہیں۔ لیکن اب انہوں نے دو علیحدہ خانے بنا دیے ہیں۔ اور یوں لادین اور مذہب کی تقسیم کی ہے۔ اس کے بڑے اہم ضمنی مفہوم ہیں، تصوراتی تو ہیں ہی جیسے میں نے آپ کو بتائے ہیں، شرعی بھی ہیں جو میں نے آپ کو بتائے ہیں لیکن عملی بھی ہیں۔ میں ایک مثال دیتا ہوں مسلم فیملی لاء کی۔ تمام علماء نے اور اسلامی نظریاتی کونسل نے اسے خلاف اسلام قرار دیا تھا حتٰی کہ اس پر لاء ڈویژن کی سمری بھی موجود ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ فیملی لاء کی فلاں فلاں دفعات قرآن و سنت کے خلاف ہیں لیکن اس کے باوجود جنرل ضیاء الحق کی جانب سے اسے تحفظ دیا گیا۔ اب ان دو قوانین کی موجودگی میں اگر ایک عورت کی طلاق ہو جاتی ہے اور شوہر اس طلاق کو رجسٹر نہیں کرواتا اور وہ عورت طلاق کے بعد شادی کر لیتی ہے تو پہلا شوہر اگر عورت کو مفلوج کرنا چاہے، تنگ کرنا چاہے تو اس کے پاس یہ موقع موجود ہے کہ چونکہ طلاق ریکارڈ نہیں ہوئی ہے تو اس کی دوسری شادی کو زنا قرار دلوایا جائے۔

جنابِ والا! میں کوئی تخیلاتی بات نہیں کر رہا۔ درحقیقت اس قانون کے جو غلط استعمال ہوئے ہیں ان میں خاصی تعداد ان کیسوں کی ہے جہاں خاتون کے پہلے شوہر نے اپنی بیوی کو تنگ کرنے، اسے زچ کرنے اور اس کی تحقیر کرنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا۔ حدود قانون کی یہ دفعہ سابقہ شوہروں کے اس اقدام کی راہ میں رکاوٹ بنی اور سینکڑوں عورتوں کو اس کی بنا پر تحفظ ملا کہ وفاقی شرعی عدالت نے اس پر غور کے بعد واضح کیا کہ دوسرا کوئی قانون بھی ہو لیکن ہمارے قانون کے تحت تمہاری شادی باقاعدہ تھی اور چونکہ ایک باقاعدہ شادی تھی اس لیے تمھارے نئے تعلق کو زنا نہیں کہا جا سکتا۔ نتیجتاً، سینکڑوں عورتوں کو پریشانی سے نجات ملی۔ تاہم نئے نام نہاد تحفظ نسواں قانون میں اب یہ باقی نہیں رہے گا اس لیے کہ زیرِ بحث بل میں 'حد' کے قانون کی دیگر قوانین پر بالا حیثیت کی یہ تحریر ختم ہو گئی ہے اور اب دوسرے قوانین عورتوں کے مزید استحصال کا اور ان کو تکلیف پہنچانے کا ذریعہ بنیں گے۔

ایک ہی جرم کے دو مختلف تصورات: اس کے بعد جنابِ والا! میرا اعتراض یہ ہے کہ ایک ہی جرم کے دو مختلف تصورات بنا دیے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ کہا کہ 'زنا جو حَد نہیں'۔ یہ تصور آرڈیننس میں موجود نہیں ہے۔ پہلے اس کو فحاشی کہہ کر ضابطہ فوجداری میں لایا گیا لیکن اب آخری وقت میں ایک ترمیم کے ذریعے فحاشی کو جنسی تلذذ میں بدل دیا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ زنا اور جنسی تلذذ میں کیا فرق ہے، اس کو کہیں واضح بھی نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی جرم کے دو مختلف تصورات وجود میں آ گئے ہیں۔ ایک زنا بالرضا اور ایک جنسی تلذذ، اور دونوں کی دو مختلف سزائیں ہیں۔

جنابِ والا! مجھے اس بات کا علم ہے کہ جرائم کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور اچھا قانون وہی ہوتا ہے جو تمام شکلوں کا احاطہ کرے۔ مثال کے طور پر آپ کو یہ پتا ہو گا کہ انسان کے ہاتھوں انسان کے قتل کی سات قسمیں ہیں، کچھ اس میں معقول ہیں اور کچھ قابل تعزیر اور عدالت کی عملداری میں ہیں۔ اسی طریقے سے سرقہ ہے، زنا ہے۔ اسی لیے اسلامی قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر 'حَد' کی شرائط پوری نہیں ہوتی ہیں تو پھر جرم جتنا ہو اس کی مناسبت سے تعزیر دی جائے۔ اب جنسی تلذذ کو ایک جرم بنا کر اس کے بعد پھر اس کی رجسٹریشن کے لیے جو چیز بنائی گئی ہے۔ وہ صرف سیشن جج کے سامنے دو گواہیاں ہیں۔ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ پولیس کی مداخلت کے بارے میں میرا ہی نہیں معاشرے کی اکثریت کا احساس ہے کہ اس کا کردار گھناؤنا ہے اور پنپ رہا ہے اسی لیے ان مسائل کا حقیقی حل بھی پولیس کی اصلاح میں ہے۔ حل اس میں نہیں ہے کہ آپ اس ملک کے دیہات کی عورتوں کو جو اس ظلم کا نشانہ بنتی ہیں ان سے توقع کریں کہ وہ بیس بیس، چالیس پچاس میل دور جہاں سیشن کورٹ ہو گی وہاں جا کر کیس رجسٹر کروائیں اور دو گواہیاں لے کر جائیں۔ اس کے صاف معنی ہیں کہ آپ نے زنا کے جرم کو قانون کی گرفت میں لانا مشکل بنا کر اسے آسان بنا دیا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر یہ برائیاں پھیلیں گی۔ قانون دیکھتا رہے گا اور کچھ نہیں کر سکے گا۔

جنابِ والا! ان چھ موٹی موٹی چیزوں کی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ قانون شرعی اعتبار

سے اور عمومی قانونی اعتبار سے بھی ناقابل قبول ہے۔ اللہ کے خلاف یہ اعلان بغاوت ہے اور اس میں جو بھی شریک ہوتا ہے۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے تمام احکام کو جان کر اور دیکھ کر اس کی خلاف ورزی میں شریک ہوتا ہے تو وہ اللہ کے سامنے اپنا جواب سوچ لے۔

تحفظ نسواں آرڈیننس کی منظوری کا طریقہ

جنابِ والا! جس طرح اس قانون کو اسمبلی سے پاس کرایا گیا ہے یہ ایک بڑا ہی مکروہ عمل ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ یہ قانون ۱۹۷۹ء میں وجود میں آیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں انتخابات ہوئے، ۱۹۹۰ء میں انتخابات ہوئے، جمہوری حکومت بنی، کسی حکومت نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جس طرح سے ماضی میں آرٹیکل ۷۰-اے اس کے بعد ۲۰۸-اے اور ۲۰۷-اے کے تحت مختلف قوانین کو قانونی جواز مہیا کیا گیا اس طرح آٹھویں ترمیم کے ذریعے سے اس قانون کو بھی جواز دیا گیا۔ اب یہ دوسرے قوانین سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کے بعد کی منتخب حکومتوں نے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی حالانکہ اس میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ دونوں دو دو بار حکومت میں آئی ہیں۔ لیکن یہاں اقتدار میں پرویز مشرف صاحب کے آتے ہی کمال ازم اور سیکولر ازم کے شوق میں ان قوانین کو ہدف بنانے کی کوشش کی گئی۔ پہلی کوششوں میں وہ ڈور ڈال کر واپس کھینچ لیتے تھے۔ اس وقت جو یہ کام کیا گیا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام کے باب میں انتہا پسندی کے نام پر بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے کیا جارہا ہے۔ فوجی حکمراں کی جانب سے یہ کھیل اپنی وردی کو بچانے اور اس کے لیے بیرونی حمایت حاصل کرنے کے لیے کھیلا جارہا ہے۔

پھر دیکھیے اس بڑے سیاسی و اخلاقی جرم کے لیے کیا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس پارٹی کو جو سرکاری پارٹی ہے، اسے استعمال کیا گیا ہے، سوچے سمجھے اقدامات کے لیے بار بار اجلاس ہوئے اور بار بار چیزوں کو تبدیل کیا گیا ہے۔

میں امتیاز عالم صاحب جو سینئر صحافی ہیں ان کا تجزیہ آپ کو پڑھ کر بتاتا ہوں۔ وہ لکھتے

ہیں:

حدودِ قوانین میں ترمیم کی کوششوں کو حکمراں جماعت مسلم لیگ(ق) کے اپنے اراکین اور ملّاؤں کی جانب سے شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ بجائے اس کے کہ ملّاں خواتین کی حیثیت سے متعلق قومی کمیشن کے مشورے پر عمل کرتے، جس میں زنا آرڈیننس کو منسوخ کرنے کی سفارش کی گئی تھی، حکمراں جماعت نے پوری کوشش کی کہ علماء کمیٹی کی سفارشات کے حق میں سلیکٹ کمیٹی کے بل کو ترک کر دیا جائے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ:

صدر پرویز مشرف نے حکمران جماعت مسلم لیگ(ق) پر دباؤ (بازو مروڑ کر) ڈال کر سلیکٹ کمیٹی کے بل کو آگے بڑھایا۔

جنابِ والا! یہ ہے وہ ریکارڈ جس پر آپ نے یہ سارا کام کیا ہے اور اگر میں اس پر اعتراض کرتا ہوں تو یہ میرا حق ہے۔ یہ کوئی سیاسی بیان نہیں۔ جنابِ والا! میں کہنا چاہتا ہوں کہ جس طریقے سے یہ پورا کام کیا گیا ہے وہ شدید قابل مذمت ہے اور وہ ثابت کرتا ہے کہ یہ پورا کام بدنیتی پر مبنی ہے۔

اصل مسئلہ: حدود پر مبنی نظام اور مغرب کا پروپیگنڈہ

جنابِ والا! اس کے بعد آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کچھ اور پہلوؤں کو واضح کر کے یہ بتاؤں میری نگاہ میں اصل مسئلہ کیا ہے۔ جہاں تک معاملہ عورتوں پر مظالم، ان کے حقوق کا تحفظ اور جو زیادتیاں ان پر ہو رہی ہیں ان کی اصلاح کا ہے، خدا گواہ ہے ہم دل و جان سے اس کو کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی حد تک ہم نے اس پر کام بھی کیا ہے۔ جس علماء کمیٹی کو انہوں نے بلانے کے بعد رد کیا ہے اس کی بھی رائے اس ضمن میں بالکل واضح ہے ان چھ کے چھ علماء نے اسی پس منظر میں اپنی سفارش کی ہے۔ اس سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل نے ایک بار نہیں

بار بار یہی بات کہی ہے۔ اسی تسلسل میں ان تمام معاملات پر نجی بل اس ایوان میں بھی اور ایوان زیریں میں بھی پیش ہوئے ہیں۔ لیکن میری نگاہ میں اصل مسئلہ وہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ حدود کو تبدیل کرنے کا ہے۔

آیئے اس پر دو ٹوک بات کرتے ہیں۔ جہاں تک حدود اللہ کا تعلق ہے جیسا میں نے عرض کیا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ ہیں اور وہ لوگ جو ان کو وحشیانہ کہتے ہیں ہماری نگاہ میں وہ غیر مہذب ہیں۔ یہ حدود اللہ کا حکم ہیں اور انسانیت کی فلاح کے لیے بہترین ذریعہ ہیں۔ ان کے بارے میں یہ قابل اعتراض الفاظ جو بھی استعمال کرتا ہے وہ میری نگاہ میں مغرب کے پروپیگنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے اور ہمارے خلاف ہتھیار اور ان کا آلہ کار بنتا ہے۔ یہاں ایک امریکن مصنف پروفیسر چارلس کنیڈی کی کتاب Islamization of Laws & Economy صفحہ ۷۴ سے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ خود ہمارے بعض سیاسی لیڈر (بے نظیر بھٹو) بھی اس ضمن میں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ کیا ہیں:

> حدود آرڈیننس جمہوریت مخالف، رجعت پسندانہ، وحشیانہ، خواتین مخالف اور غیر قانونی طور پر تھوپے گئے ہیں۔

جنابِ والا ! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حدود قرآن و سنت کی طے کردہ ہیں اور وہ مہذب ترین طریقہ ہے ان جرائم کو روکنے کا اس کے بارے میں ہمارے کوئی تحفظات نہیں، ہم نے ہمیشہ حدود کا دفاع کیا ہے۔ حدود آرڈیننس میں جو کچھ خامیاں ہیں طریقہ کار کی، زبان کی اس کو ٹھیک کرنے کے لیے اور ان کی اصلاح کے لیے ہم ہر وقت تیار ہیں لیکن اللہ کی حدود پر کوئی مصالحت ہم نہیں کریں گے۔

جنابِ والا! میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں اور جن حضرات نے قانون کا مطالعہ کیا وہ جانتے ہیں کہ Jurisprudence قانون کی بڑی بنیادی کتاب ہے۔ اس کتاب میں قانون اور سزا اور سزاؤں کے فلسفہ پر بڑی اہم بحث کی گئی ہے ۔ Sir John William

Salmond KC اپنی اس کتاب میں کہتے ہیں:

”سزا جرم کے خلاف تمام اقدامات میں پہلی رکاوٹ ہے اور جرم کے قانون کا سب سے بڑا انجام بھی، تا کہ برائی کرنے والوں کو اس جیسے کردار کے حامل لوگوں کے لیے ایک تنبیہ اور مثال بنا دیا جائے۔ اگر انسان، انسانیت کی محبت اور معاشرتی جبلت سے عاری ہو تو اس کے لیے عقل عام کے مطابق، فیصلہ یہ نہیں کہ اس کے ساتھ عام مجرم کی طرح نرم سلوک کیا جائے اور یہ بھی درست نہیں کہ معاشرہ اسے ایک اچھا شہری بنانے کی امید میں اس کے ساتھ لاڈ پیار کا برتاؤ کرے بلکہ جرم و سزا کے نظام کے ذریعے اسے خود اپنے اور دوسروں کے لیے انتباہ اور دہشت بنا دیا جانا چاہیے“۔

جنابِ والا! یہ ہے اس قانون کا فلسفہ۔ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کی توجہ دلاؤں گا کہ آپ کے سابق چیف جسٹس پاکستان، جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلیس[1] حدود کے معاملے میں کیا بات کہتے ہیں۔ ہمیں شرم آتی ہے قرآن اور سنت کی سزاؤں کا دفاع کرتے ہوئے لیکن دیکھیے کارنیلیئس کیا کہتے ہیں۔

... آسٹریلیا میں اپنے ایک اہم خطبے کے اندر پہلے تو وہ قید کی سزا کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کتنی غیر مؤثر رہی ہے۔

”اگرچہ یہ کہنا کچھ زیادہ ہی ہو کہ سزا اور قید نے جرائم کی تحدید کے سلسلے میں اپنے اثرات کھو دیے ہیں سوائے (شاید) سیاسی جرائم کے۔ لیکن اگر جیلوں کی دیکھ بھال، اعلیٰ معاوضوں پر جیلوں میں مامور اسٹاف، رہائش، مناسب خوراک، دیکھ بھال اور دیگر سہولیات کے باوجود۔ اور وہ بھی ایک ایسے فرد کے لیے جو

[1] جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلیس (۱۹۹۱-۱۹۰۳ء) پاکستان کے ماہر قانون، فلسفہ قانون کے عالم اور جج تھے۔ آپ دس برس (۱۹۷۰-۱۹۶۰ء) سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس رہے۔ علاوہ ازیں (۱۹۷۱-۱۹۶۹ء) وزیر قانون رہے۔ جسٹس کارنیلیس صاحب اپنے خطبات کی بناء پر پاکستان میں اسلامی نظام عدل کے وکیل کے طور پر مشہور ہیں۔

ثابت شدہ سماج مخالف / دشمن ہے۔ اگر متبادل طریقے دستیاب ہوں جو غیر مؤثر نہ ہوں، سستے بھی ہوں اور جو سزا، جزاء اور اصلاح کے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں مؤثر ہوں تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ مذکورہ بالا بوجھ سے منصفانہ طور پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے''۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ:

''یہ حالت در حقیقت اس وجہ سے ہے کہ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جس کی سزا فوری اور عوام کے سامنے دی جاتی ہے، اور یہ جرم کی اس شکل کے خلاف ایک انتہائی مؤثر روک تھام ثابت ہوئی ہے، حالانکہ اس کا اطلاق مقدمات کی ایک بہت کم تعداد میں ہوا ہے''۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ جرم معاشرے (خواہ قدیم ہو یا جدید) کی حیاتیاتی حقیقت ہے یہ معاشرتی ماحول سے پروان چڑھتا ہے اس کی عِلتوں اور اسباب کی انتہائی محتاط جانچ پڑتال کے بغیر صرف تفتیش، مقدمہ اور سزا کے مروجہ طریقے جرائم میں اضافہ کو روکنے کے لیے مؤثر نہیں ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جرائم کو روکنے کے لیے تمام پہلوؤں پر نئے سرے سے سوچنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس عمل میں یہ بہتر ہو گا کہ ان اصولوں اور تکنیکوں کو فرسودہ سمجھ کر مسترد نہ کیا جائے جو قدیم زمانے میں اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ انھیں استعمال کیا جا سکتا ہے اور یقیناً مشرقی ممالک میں یہ مؤثر ہو نگے۔

اس کے بعد پھر وہ کہتے ہیں:

سب سے زیادہ عمومی بحث کا معاملہ 'حد' لگتا ہے جو (کسی بھی جرم کی) زیادہ سے

زیادہ سزا ہے۔ اس کی پوری تشریح میرے نزدیک یہ ہے کہ فیصلہ کی بنیاد قرآن و حدیث سے لینی چاہیے۔

پھر وہ کہتے ہیں:

چوری کی سزا قرآن پاک میں بیان کی گئی ہے، یعنی ہاتھ کاٹنا، ایسا جرم جس کا ارتکاب کرنا آسان ہے اور اس لیے اس کا پھیلاؤ اور عام ہونا دونوں طرح سے ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بطور قانون ساز یہ سزا صرف اس وقت لگائی جب چوری شدہ مال کی قیمت چوتھائی درہم سے زیادہ تھی۔

پھر کہتے ہیں:

ایسے جرائم کے مقدمات جن کا بدلہ متاثرہ شخص کو ادا نہیں کیا جاسکتا؛ عزت دار خواتین کی عزت کو پامال کرنا، شاہراہ پر ڈکیتی کرنا، بے حیائی کا جھوٹا الزام لگانا، ان کے لیے 'حد' کی سزا مناسب تھی۔

جنابِ والا! آخر میں وہ کہتے ہیں کہ:

ایک استثنیٰ زنا کا جرم ہے جس کے لیے سورۃ نور میں مجرموں کو سو کوڑے عوام کے سامنے مارنے کا حکم دیا گیا ہے اور مجرموں پر ترس کھانے سے منع کیا گیا ہے۔

ایک غیر مسلم چیف جسٹس اپنے ملک میں نہیں مغرب کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ جنابِ والا! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی سپریم کورٹ کے ہندو جج اور ہندو فوجداری قانون کے ماہرین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر این آر مداوا جو انڈین فوجداری قانون کے ماہر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

اسلام غیر ازدواجی تعلقات کو برا سمجھتا ہے اور زنا کے جرم میں سر عام سنگین سزائیں تجویز کرتا ہے ان دنوں خواتین کے خلاف ہر طرح کے جرائم، اجتماعی

عصمت دری حتیٰ کہ نابالغ لڑکیوں کے ساتھ بھی معمول بن گئے ہیں ہمیں خواتین کی حفاظت کے لیے اور معاشرے میں عمومی سطح پر شائستگی واپس لانے کے لیے اسلامی قانون سے سبق سیکھنا چاہیے۔

جنابِ والا! یہ ایک ہندو جج کہہ رہا ہے۔

ہندوستان کی سپریم کورٹ کا ایک اور جج کہتا ہے:

”یہ جرم (زنا) کسی بھی مرد کی جانب سے کسی عورت کی بدترین تذلیل ہے جس سے وہ جسمانی اور نفسیاتی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ یہ جرم ایسے ہی ہے جیسے اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔ اور ایسے جرم کی بہترین سزا کوڑے ہیں“۔

اس نے یہ بات ٦ مارچ ١٩٨٠ء کو کہی تھی اور ایک سال بعد سپریم کورٹ کا جج ہو گیا تھا۔

جناب والا! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ حَد کے معاملے میں کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ مغرب اگر اس پر ناخوش ہے تو ہزار بار ناخوش رہے۔ جو قانون، جو حَد، جو سزا اللہ نے مقرر کی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں، اس پر ہمارا یقین ہونا چاہیے۔ لیکن اس بل کے ذریعے سے آپ ایک حَد کو ختم کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے یہ جرم اور بغاوت نہ کیجیے۔

حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا جائزہ

اب میں اس سے آگے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حدود آرڈیننس میری نگاہ میں آج اس ملک کی کتاب قانون کا مظلوم ترین قانون ہے۔ اس کے اوپر نہایت کمزور حوالوں کے ساتھ ایسے ایسے اعتراضات کیے جا رہے ہیں جو کسی طرح بھی حقیقت نہیں ہیں۔ پروپیگنڈہ کی بنیاد پر فضا کو منفی بنا کر اسے ہدف تنقید بنانے اور بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ایک جھوٹا عمل ہے۔ اگر آپ مجھے مثال دینے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ یہ بالکل اسی طرح کا جھوٹا عمل ہے جس طرح امریکی صدر بش نے عراق کے معاملہ میں کیا تھا۔ ایک بڑے واضح

جھوٹ کی بنیاد پر کہ وہاں پر وسیع تر تباہی کے ہتھیار پائے جاتے ہیں، جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ یہ جھوٹ ہے، غلط ہے، اس نے حملہ کیا اور چھ لاکھ سے زیادہ انسان وہاں پر ہلاک ہو چکے ہیں[1]۔ بعینہ یہی طریقہ یہاں پر ان قوانین کے ساتھ اختیار کیا جارہا ہے۔ میں آپ کو اپنے یہاں جاری بحث کے حوالہ سے چند مثالیں دے کر بتاتا ہوں۔

قانون فردِ واحد نے بنایا: پہلی بات جنابِ والا! یہ کہی جاتی ہے کہ یہ قانون غیر آئینی فوجی ڈکٹیٹر نے اپنے ذاتی ذوق اور سیاسی مفادات کی خاطر تبدیل کیا۔ جنابِ والا! مجھے آپ اجازت دیں کہ میں یہ بات کہوں کہ بلا شبہ ڈکٹیٹر کی طرف سے قانون آیا، یا جس طرح آج یہاں صدارتی نوٹیفکیشن کے ذریعے سے قوانین آتے ہیں، پارلیمنٹ ہونے کے باوجود یہ اچھا نہیں ہے۔ جب پارلیمنٹ ہو تو پارلیمنٹ ہی کو بحث کر کے قوانین بنانے چاہییں۔

لیکن جناب چیئرمین! ہمیں پورے سیاق و سباق میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔ حدود آرڈیننس جو فروری ۱۹۷۹ء میں نافذ ہوا تھا اس کے بارے میں آج جو غلط بیانیاں اور اعتراضات کیے جارہے ہیں اور جس انداز میں اس کی یہاں مذمت کی جارہی ہے وہ تمام چیزیں بیرونی ذرائع ابلاغ، بیرونی صحافی اور ملک کے لبرل نام نہاد لکھنے والے دہرائے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ جنرل مشرف صاحب کی اپنی کتاب میں بھی انہی الفاظ میں ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ آرڈیننس ایک فرد واحد نے اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر کچھ مقاصد کے لیے درآمد کیا۔ اس کا تعلق اس بل سے نہیں اس کا تعلق فروری ۱۹۷۹ء کے آرڈیننس سے ہے۔

میں پہلی بات تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بات صحیح ہے کہ ۱۹۷۹ میں اس وقت ملک میں

---

[1] ۱۹ مارچ ۲۰۰۳ء کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے مشرق وسطیٰ کے تیل سے مالامال ملک عراق پر مسلح جارحانہ حملے کے لیے ایک جھوٹ گھڑا تھا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں اور عراقی صدر صدام حسین کے القاعدہ سے تعلقات ہیں جس سے امریکہ کو خطرہ ہے۔ صدر بش کے اس دعوے کو سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ۲۰۱۶ء میں ساؤتھ کیرولینا میں صدارتی مباحثے کے دوران جھٹلایا اور بتایا کہ عراق پر فوجی حملہ غیر قانونی تھا۔ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی وہاں موجودگی کے بارے میں جھوٹ پھیلایا گیا۔

فوج کی حکمرانی تھی کوئی پارلیمنٹ نہیں تھی اور اس طرح فطری طور پر یہ بل کسی پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نافذ ہوا۔ لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے آٹھویں دستوری ترمیم کے حصہ کے طور پر پارلیمنٹ نے اس کی منظوری دی ہے۔ اور اس طرح یہ کوئی پہلی مثال نہیں تھی اس سے پہلے خواہ وہ ایوب خان کا زمانہ ہو یا یحییٰ کا زمانہ ہو یا بھٹو کا زمانہ ہو اور پھر بعد کے ادوار ہوں دستور میں کسی بھی دور کی تمام چیزوں کو مسترد نہیں کیا گیا ہے۔ یہی نہیں ۱۹۸۵ میں آٹھویں ترمیم کے بعد پارلیمنٹ ۱۹۹۹ء تک موجود رہی اور اب ۲۰۰۲ء سے بھی موجود ہے۔ ۱۹۸۵ء سے لے کر آج تک کسی بھی وزیر اعظم نے اس میں کسی شق کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بنا پر آٹھویں ترمیم کی منظوری کے بعد یہ کہنا کہ یہ محض ایک فرد واحد کا معاملہ ہے کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

جناب چیئرمین! آپ کے غور و فکر کے لیے ایک اور قانونی نکتہ بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ پوری اسلامی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ کسی بھی قانون کے جواز کے لیے اور کسی بھی نظام کی قبولیت کے لیے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کیا وہ شریعت پر مبنی ہے اور اس کے مطابق ہے۔ دوسرا کیا عوام اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟ ماوردی کی تمام کتابیں اٹھا لیجیے۔ شاہ ولی اللہ کی کتابیں لے لیجیے آپ پر واضح ہوگا کہ پوری تاریخ اس پر مبنی ہے۔ حدود اگر ہیں تو وہ شریعت کا حصہ ہیں۔ اس کا تعلق کسی فرد سے نہیں اور شریعت کو جو بھی نافذ کرے وہ منتخب نمائندہ ہو، غیر منتخب ہو، اس کا قانونی جواز شریعت کا حصہ ہونے کی بناء پر آتا ہے۔ اس بناء پر نہیں آتا کہ وہ کس طریقہ سے آیا ہے۔ اس لیے اس بناء پر بھی یہ سوال اٹھانا میری نگاہ میں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ کسی خراب نیت سے نہیں آیا بلکہ وہ ایک فرد نے اپنی ذاتی کاوش کے ذریعہ متعارف کرایا، اب ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ یہ حدود حضور ﷺ کے زمانے سے لے کر اور جب تک مغربی استعمار نے آکر ہمارے نظام قانون کو درہم برہم نہیں کیا، ہماری کتابِ قانون کا حصہ تھیں۔ اس ضمن میں آپ کو ہندو مؤرخین کے حوالے بھی دے سکتا ہوں جو ہندوستان کے بارے میں ہیں تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ یہ تسلسل ہے۔

پروفیسر ودیادھر مہاجن The Muslim Rule in India میں کہتا ہے کہ:

"جرائم کے تین گروپ ہیں: خدا کے خلاف جرائم، ریاست کے خلاف جرائم اور انسانوں کے خلاف جرائم۔ سزاؤں کی بھی تین قسمیں ہیں: حدود، تعزیر اور قصاص۔ حدود خدا کے خلاف جرائم کی سزائیں ہیں۔ تعزیر میں مجرم کو سرکاری طور پر سخت سزاؤں کے ذریعے عوامی ملامت کا نشانہ بنایا جاتا ہے جبکہ قصاص انتقام کی ایک نوعیت ہے"۔

پھر آگے کہتا ہے:

"قرآن ہی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر اسلام کا فوجداری انصاف کا نظام قائم ہے حتیٰ کہ (مغل بادشاہ) اکبر نے بھی اسلامی قانون پر مبنی فوجداری انصاف کے نظام میں مداخلت نہیں کی"۔

میرے پاس بیسیوں دوسرے اقتباسات اور حوالے موجود ہیں کہ تمام مورخین نے یہ بات کی ہے کہ حدود کے حوالہ سے ہمارے فوجداری قانون میں پورا تسلسل رہا حتیٰ کہ سامراج نے اسے بدل دیا۔ چنانچہ ان قوانین کو نافذ کرنے کا جو کام ۱۹۷۹ء میں ہوا وہ کسی کا ذاتی کام نہیں تھا بلکہ جو چیز ہماری پوری تاریخی روایت اور ہمارے قانون کا حصہ تھا اور جس پر ہم عمل بھی کرتے رہے تھے وہ دوبارہ قابل عمل بنایا گیا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ یہ ایک فرد کا معاملہ ہے یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ قانون کچھ سعودیوں نے ڈرافٹ کیا اور وہاں سے یہاں آ گیا۔ جناب والا! میں پوری ذمہ داری سے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سعودی قانونی نظام کا مطالعہ کر لیجیے۔ وہاں شریعت کے معاملات تحریری قانون کی صورت میں نہیں وہاں کوئی منظور شدہ قانون نہیں، وہاں Judge made law کام کر رہا ہے اور اس حیثیت سے ان کے پاس کوئی ڈرافٹ تھا ہی نہیں۔ دوسری جانب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ قانون بنا اس میں

سب قابل ذکر افراد اور ادارے شریک تھے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے سب سے پہلے مسودہ تیار کیا اور یہ کونسل وہ تھی جس کے چیئرمین جسٹس افضل چیمہ تھے جس کے اندر اے کے بروہی ممبر تھے اگرچہ بعد میں وہ کابینہ میں آنے کی وجہ سے مستعفی ہوگئے تھے۔ اس میں خالد اسحاق ایڈووکیٹ تھے۔ اس کے اندر مولانا تقی عثمانی، جسٹس کاکاخیل، مولانا یوسف بنوری، جناب جعفر حسین مجتہد، مولانا ظفر احمد انصاری، اس وقت سیکرٹری قانون جسٹس خواجہ محمد احمد صمدانی تھے، سب نے اس کو تیار کیا ہے اور اس وقت جس کابینہ نے اس کو منظور کیا ہے اس میں اے کے بروہی، شریف الدین پیرزادہ، غلام اسحاق خان، خواجہ محمد صفدر، چوہدری ظہور الٰہی اور محمد خان جونیجو، جیسے لوگ موجود تھے اور میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ اس میں میرا بھی کردار تھا۔

جہاں تک بیرونی مشیروں کا تعلق ہے تو بلاشبہ تین افراد نے اس میں مدد دی۔ جس کا ذکر اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ میں موجود ہے۔ ڈاکٹر معروف الدوالیبی، ان کا کوئی تعلق سعودی عرب سے نہیں تھا وہ شام کے سابق وزیراعظم تھے اور شام میں یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر مصطفٰی احمد زرقا، وہ بھی ایک ماہر تھے اور تیسرے ڈاکٹر حسن ترابی جو سوڈان کے اٹارنی جنرل تھے ان لوگوں نے ضرور مدد کی۔ سیاسی پارٹیوں کے اعتبار سے مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام پاکستان، جمعیت علماء پاکستان، نوابزادہ نصر اللہ کی پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی ان سب نے اس کی حمایت کی۔ جو طریقۂ کار اس وقت موجود تھا یہ قانون اس کے مطابق بنا ہے اور پھر پوری قوم نے اس کو قبول کیا ہے اور یہ ستائیس سالوں سے ہماری قانون کی کتاب کا حصہ ہے یہ کہنا کہ کسی فرد واحد کی چیز ہے یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

حدود اور حدود قوانین میں فرق: جنابِ والا! دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ حدود اور حدود قوانین کے درمیان فرق کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا اس لیے قانون میں کسی ترمیم کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بڑی بددیانتی کی بات ہے۔ ہم پہلے دن سے حدود میں

اور حدود قوانین میں فرق کرتے ہیں۔ حدود قوانین کے دو حصے ہیں۔ حدود کا ایک مستقل قانون ہے اور ایک عدالتی طریقۂ کار کے لیے اس کی زبان ہے جو اس وقت کے قانونی ماہرین نے مرتب کی ہے اگرچہ اس میں بھی بہتری کی ضرورت ہے، 'حَد' کے تصور اور 'حَد' کے احکام پر مصالحت کیے بغیر۔ درحقیقت اس پر کسی کو بھی اعتراض نہیں۔ طریقۂ کار کے معاملات کے اندر جب ترمیم کی ضرورت ہو لازماً کی جائے اور کی جانی چاہیے طریقۂ کار میں خامیاں رہی ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اسی تناظر میں اس عرصے میں کم از کم پانچ بار اس میں ترمیم ہو چکی ہے۔

میں ان ترامیم کی تفصیل آپ کو سناتا ہوں: ۱۹۸۰ء میں زنا آرڈیننس میں دفعہ ۲۰ میں پہلی ترمیم ہوئی اور اس ترمیم کے ذریعے سے جو مقدمات سنے جانے والے تھے وہ مجسٹریٹ سے لے کر سیشن جج کو دیے گئے۔ دوسری ترمیم ۱۹۹۷ء میں ہوئی جس میں دفعہ ۱۰ کی ذیلی شق تین کو تبدیل کیا گیا ہے اور اس میں زنا بالجبر کے جرم میں کم از کم چار سال قید کا اضافہ کیا گیا۔ تیسری ترمیم ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔ چوتھی ترمیم ۲۰۰۴ء میں ہوئی اس کے علاوہ وفاقی شریعت کورٹ نے ۱۹۹۸ء میں اپنے ایک فیصلے میں اس کی تین دفعات کے بارے میں کہا ہے کہ یہ فلاں فلاں چیز صحیح نہیں ہے اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور اگر یہ اصلاح حکومت نہیں کرتی ہے تو پھر یہ اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔ حکومت نے بجائے اس کے کہ وفاقی شریعت کورٹ کے فیصلے کو نافذ کرتی اس پر عمل کرتی، اپیل کر دی اور وہ اپیل آج تک سولہ سال ہو گئے ہیں التواء کا شکار ہے[1]۔ اس لیے اس دعویٰ میں کوئی حقیقت نہیں کہ کسی حقیقی، ضرورت کے لیے بھی ہم ترمیم کے لیے تیار نہیں ہیں۔

حدود آرڈیننس کے بعد جرائم میں اضافہ ہوا ہے: جنابِ والا! ایک اور بات یہ کی جاتی ہے کہ اس قانون کے بعد جرائم میں اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ ہزاروں عورتیں جیلوں میں پڑی ہوئی

[1] تحفظ نسواں قانون کی منظوری کے بعد صورتِ حال تبدیل ہو گئی۔

ہیں اور ہزاروں کو تعزیر کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ جنابِ والا! مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ حقائق سے ہٹ کر جذباتی باتیں ہیں جو زبان زد عام وخاص کر دی گی ہیں حتٰی کہ خواتین کمیشن کی رپورٹ میں سرکاری طور پر بھی اس بات کو لکھ دیا گیا ہے۔

جنابِ والا! میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں تحقیق بہت واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۸ء تک یعنی اس قانون کے بننے سے پہلے تک جنسی جرائم میں شامل جو دو شقیں تھیں ان کی بنیاد پر زنا بالجبر اور زنا کی وارداتیں ۱۹۴۷ء میں ۳۰۴ تھیں جو ۱۹۸۰ء میں آبادی کے کے تناسب سے بڑھ کر ۸۳۹ ہو گئیں۔ اس کے بعد پھر آبادی میں اور بھی اضافہ ہوا اور دوسری جانب زنا بالرضا جو پہلے جرم نہیں تھا حدود آرڈیننس کی رو سے وہ اب جرم بن گیا۔ اس صورتِ حال میں جرائم کی تعداد میں تو اضافہ ہونا ہی تھا۔ اس کے باوجود اگر آپ دیکھیں تو تعداد میں اضافہ کے بعد بھی جرائم کا تناسب وہی رہا ہے۔ ۲۰۰۴ء تک جو اعداد و شمار موجود ہیں ان کے مطابق ۲۰۰۴ء میں کل جنسی جرائم ۲۳۶۵ ہیں جس میں زنا کی ہر شکل شامل ہو گئی ہے۔ یہ کہنا کہ ہزاروں عورتین جیلوں میں پڑی ہوئی ہیں۔ کسی بھی طرح حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد میں آپ کو اعداد و شمار کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء کے عشرے میں اوسطاً ایک لاکھ پر ایک اعشاریہ ایک (۱ء۱) جنسی جرائم ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں یہ بڑھ کر ۴ء۱ ہو جاتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں یہ بڑھ کر ۵ء۱ ہو جاتا ہے۔ یعنی اسی تناسب سے اضافہ ہوا ہے اور ۲۰۰۴ء کے جو اعداد و شمار ہیں وہ ۶ء۱ ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ زنا کے جرم کے اندر حقیقتاً کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا ہے اگر ہوا ہے تو اس معنی میں تناسب میں کمی ہے کہ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جو نئے جرم بنے ہیں، جو اس سے پہلے نہیں تھے اب وہ بھی ریکارڈ میں آرہے ہیں۔

اس کے مقابلے میں جنابِ والا! اگر دنیا کے دوسرے ممالک کے اعداد و شمار دیکھیں

تو امریکہ میں یہ تناسب ایک لاکھ میں ۱ء۳۴ ہے[1]۔ انگلستان کے بارے میں جو ابھی حالیہ سروے رپورٹ آئی ہے وہ بتاتی ہے کہ آبادی کا ۷ء۹ فیصد زنا کا شکار ہو چکا ہے ہندوستان میں ہر آدھے گھنٹے میں ایک زنا ہو رہا ہے اور ہمارے ہاں سے ان کا تناسب کئی گنا زیادہ ہے۔ یہاں میں یہ بھی کہہ دوں کہ ہندوستان میں آج بھی فوجداری قانون کے اندر وہی چیز موجود ہے جو ہمارے ہاں ۱۹۷۸ء تک تھی، تو معلوم ہوا کہ حدود آرڈیننس کے بعد جرائم کے اندر کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس حوالہ سے کیا جانے والا پروپیگنڈہ محض ایک ڈھونگ ہے۔

زنا کے معاملات میں عورت کی گواہی: کہا جاتا ہے کہ عورت کو زنا کے معاملات میں گواہی کا حق نہیں ہے۔ جنابِ والا! یہ بات غلط ہے۔ میں آپ کے سامنے وفاقی شرعی عدالت کا ایک فیصلہ پیش کرتا ہوں جس میں انہوں نے صاف یہ بات کہی ہے کہ تعزیر کے معاملات میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے اور حَد کے معاملے میں بھی جو حقیقی اطلاعات ہیں ان کی بنیاد پر خواہ وہ لیڈی ڈاکٹر ہو یا ملوث عورت ہو یا گواہ ہو، ان تمام میں عورت کی گواہی کو شامل کیا گیا ہے۔ اسی پسِ منظر میں ایک نہیں دسیوں ایسے مقدمات ہیں جن میں ایک عورت کی گواہی پر بھی سزا دی گئی ہے۔

جنابِ والا! عورت کی گواہی کے سلسلے میں محمد علی بنام سرکار کے مقدمہ پر نظر ڈالیے: زنا بالجبر کا ارتکاب ہوتا ہے صرف خواتین کی عینی گواہیوں کی بنیاد پر ایک ملزم کو عمر قید، ایک لاکھ روپے جرمانہ اور تیس کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔ ایک اور مقدمہ محمد اقبال عرف بالا بنام سرکار(PLD 2002 P.Cr. LJ 1169) ہے جس میں زنا بالجبر کا ارتکاب تیرہ سالہ بچی کے ساتھ ہوا اور اس کی دس سالہ سہیلی کی گواہی پر ملزم کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ اسی طرح ایک اور مقدمہ ظفر نعیم بنام سرکار(PLD 2004 PCrLJ 716) میں چھٹی

---

[1] امریکی این جی او RAINN (Rape, Abuse & Incest National Network) کی رپورٹ ۲۰۲۰ء کے مطابق ۱۷ء۷ فیصد امریکی عورتیں زنا بالجبر کا شکار ہو چکی ہیں جن میں سے ۸۲ فیصد پر جنسی تشدد کیا گیا، ۹۰ فیصد بالغ ہیں، ۱۸ تا ۲۴ سال کی عورتوں پر کم از کم تین بار جنسی تشدد کیا گیا۔

جماعت کی طالبہ کی گواہی پر تین ملزموں کو ۲۵،۲۵ سال قید بامشقت اور تیس تیس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ اسی طرح عبید الرحمٰن بنام سرکار (PLD 1984 FCS 128) میں تیرہ سالہ لڑکی سے زنا کا ارتکاب ہوتا ہے، ایک اکیلی عورت کی گواہی پر ۲۵ سال قید بامشقت اور اسٹیڈیم میں سرِعام تیس کوڑوں کی سزا دی گئی اور عدالت اپنے فیصلے کے اندر یہ بات لکھتی ہے کہ خصوصی حالات میں اگر کوئی واقعہ بشمول حدود و قصاص کا ارتکاب صرف خواتین کی موجودگی میں ہو اور کوئی مرد موجود نہ ہو، ان کی تعداد مطلوبہ نصاب شہادت کے مطابق نہ ہو، یا واقعہ اندرون خانہ رونما ہوا تو ان صورتوں میں خواتین کی شہادت کا روکنا یا ان کی گواہی کو شمار نہ کرنا اور یا ایسے مقدمات کو سرے سے قصاص و دیت نہ ٹھہرانا، قرآن کے عمومی احکام سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کی مثال نظام عدل یا اسوۂ حسنہ اور عہد رسالت ﷺ کے شواہد سے بھی ملتی ہے۔ خاص طور پر جب جرائم کا ارتکاب ان اداروں میں ہو جہاں پر صرف خواتین کام کرتی ہوں یا رہائش پذیر ہوں، مثلاً گرلز ہاسٹل، نرسنگ ہوم، وومن سنٹر یا ان اوقات میں ہو جب مرد گھروں میں موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں اس واقعہ کی روک کا کیا طریقہ ہو گا؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ ایسے مقامات جہاں پر صرف عورتیں ہی گواہ ہوں یا صرف غیر مسلم موجود ہوں تو اس جرم کے ارتکاب کی شہادت دینے کون آئے گا؟ ہمارے نزدیک ان حالات میں خواتین کی گواہی تعزیر ہی کے لیے نہیں بلکہ حدود و قصاص سمیت سب معاملات میں لی جا سکتی ہے۔

جنابِ والا! یہ حقائق واضح کر رہے ہیں کہ عورتوں کی گواہی کے قبول نہ کیے جانے کے متعلق یہ جھوٹ پھیلایا جاتا ہے۔ یہاں سارا ریکارڈ موجود ہے اور اسوہ حسنہؐ سے مزید رہنمائی بھی لی جا سکتی ہے۔ اس سے زیادہ بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ آپ اس معتبر قانون کو دھوکہ، جھوٹ اور غلط بیانی کی بنیاد پر ہدف بنائیں اور اس کے بعد یہ کہیں کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ اگر کہیں حقیقی بنیادوں پر تبدیلی کی ضرورت ہے تو ضرور کیجیے ہم بھی آپ کا ساتھ دیں گے لیکن براہِ کرم اس کے ساتھ یہ بدسلوکی آپ نہ کریں۔

کیا یہ عورتوں کے لیے امتیازی قانون ہے: ایک اور بات یہ کہی جاتی ہے کہ یہ قانون عورتوں کے لیے امتیازی ہے اور یہ غلط بیانی تو اس قدر دہرائی گئی ہے کہ گوئبلز بھی اپنی قبر میں چھپ رہا ہو گا۔ لیکن جنابِ والا! جو تحقیق اس معاملے میں ہوئی ہے وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اور یہ بھی میں بڑے دکھ سے کہتا ہوں کہ تحقیق کا یہ کام پاکستانیوں نے نہیں کیا بلکہ باہر کے محققین نے کیا ہے۔ پروفیسر چارلس کینیڈی نے پانچ سال کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا ہے[1]۔ یہ اعداد و شمار جیلوں سے بھی اور فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ سے بھی لیے گئے ہیں۔ ان اعداد و شمار کے بعد جس نتیجے پر وہ پہنچا ہے وہ میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں:

> حدود آرڈیننس کے جس پہلو کو سب سے زیادہ تفصیلی طور پر زیر غور لایا گیا وہ یہ ہے کہ اس طرح کی "قانون سازی کے مبینہ طور پر خواتین کے حقوق پر کیا اثرات ہیں۔ کئی حالیہ تحقیقی مطالعات میں یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ضیاء کا نظام مصطفیٰ، بطور خاص حدود آرڈیننس خواتین کے لیے امتیازی قانون ہے۔ اگرچہ خواتین کی حیثیت پر اسلامائزیشن پروگرام کے اثرات پر تحقیق اس مضمون کے دائرہ کار سے باہر ہے لیکن ہماری تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ پاکستان میں بالخصوص حدود آرڈیننس کے نفاذ سے خواتین کے خلاف امتیازی تعصب کے حوالے سے کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے"۔

وہ مزید کہتا ہے:

> "حقیقت میں اگر کچھ ہوا ہے تو وہ یہ ہے کہ مردوں کے خلاف تھوڑا بہت صنفی امتیاز برتا گیا ہے حدود آرڈیننس کے تحت ضلعی اور سیشن عدالتوں سے سزا پانے والوں میں ۸۴ فیصد مرد ہیں اور جن سزاؤں کو وفاقی شرعی عدالت نے برقرار رکھا ہے ان

1 Islamization of Laws and Economy Case Studies on Pakistan by Charles Kennedy. IPS. 1996, Page 61.

میں سے ۹۰ فیصد مرد ہیں۔ بدکاری (شادی شدہ افراد کی اپنے زوج کے علاوہ کسی سے جنسی تعلق قائم کرنا)، تعزیر کے حوالے سے زیادہ قابلِ ذکر تحقیق ہے۔ بدکاری / زنا کے جرم کے ہونے میں عورت یا مرد کا امتیاز نہیں رہتا۔ لیکن ضلعی اور سیشن عدالتوں سے سزا پانے والوں میں ۵۶ فیصد مرد تھے اور وفاقی شرعی عدالت سے سزا پانے والوں میں ۷۰ فیصد مرد تھے۔ انیتا ایم ویز (Anita M. Weiss) کے دعوؤں (جن کا پاکستان اور مغربی پریس میں عمومی طور پر حوالہ دیا جاتا ہے) کی جن کے مطابق پاکستان میں بدکاری کے مقدمات میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کو سزائیں دی گئی یہ تحقیق ویز کے ان دعوؤں کی تردید کرتی ہے۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے کسی کو جائز طور پر اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ حدود آرڈیننس میں خواتین کے خلاف صنفی امتیاز برتا گیا ہے یہ غلط ہے"۔

پھر اس کے بعد وہ پانچ سال کے اعداد و شمار دکھلاتا ہے اور میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں جنابِ والا! کہ اس مطالعے کے اندر ضلع کی سطح پر دفعہ ۱۰(۲) جو زنا بالرضا کے سلسلے میں ہے، اس میں ان پانچ سالوں میں ۱۴۵ مرد اور ۱۱۴ عورتوں کو سزا دی گئی۔ جبکہ زنا بالجبر پر ۱۶۳ کو سزا ملی۔ بعد ازاں سپریم کورٹ اور وفاقی شرعی عدالت میں یہ مقدمے گئے اور وہاں ان کا نظر ثانی ہوا۔ نظر ثانی کے بعد ان ۱۴۵ میں سے تقریباً نصف یعنی ۷۰ مردوں کو سزا ملی، باقی کو چھوڑ دیا گیا اور ۱۱۴ عورتوں میں سے صرف ۳۰ کو سزا ملی اور باقیوں کو چھوڑ دیا گیا۔ زنا بالجبر کے مقدمات میں ۱۶۳ مردوں میں سے ۵۹ کو سزا ہوئی جبکہ دو عورتیں جن کو زنا بالجبر کے سلسلے میں سزا دی گئی تھی، انہیں رہا کر دیا گیا۔ ایک بھی عورت زنا بالجبر کے سلسلے میں اس قانون کے تحت نہ سزا یافتہ ہے اور نہ اسے سزا دی گئی ہے۔ حالانکہ شور یہ ہے کہ زنا بالجبر میں جو ثابت نہیں کر سکتی ہے اس کو پھر زنا بالرضا کے جرم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ اور اس سے بڑی غلط بیانی کوئی نہیں۔

اس کے بعد پھر وفاقی شرعی عدالت کے جج محترم جسٹس محمد تقی عثمانی نے جو ۱۷ سال

جج رہے ہیں گواہی دی ہے[1] کہ میرے سترہ سال کے دور میں کوئی ایک مقدمہ ایسا نہیں ہے جس میں زنا بالجبر کی خاتون کو زنا بالرضا کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہو چہ جائے کہ سزا دی گئی ہو لیکن یہ بات افسوسناک طور پر دن رات پھیلائی جا رہی ہے۔ لہٰذا جنابِ والا! میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں یہ ایک ایسا مظلوم قانون ہے کہ جس پر یلغار ہے اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی اور اس یلغار کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے اور آگے بڑھیے۔

اصل مسئلہ کیا ہے؟

پولیس کا طرزِ عمل: جنابِ والا! اصل مسئلہ آپ کی پولیس ہے یہاں مجھے اجازت دیں کہ میں وفاقی شرعی عدالت کے ایک فیصلے سے آپ کو تھوڑا سا حصہ پڑھ کر سنا دوں۔ یہ بڑا مخصوص مقدمہ تھا غلام نبی کاٹھیو بنام سرکار۔ اس سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جرم اگر دفعہ ۱۰(۳) کا ہے تو اس کو دفعہ ۱۰(۲) کے تحت درج کیا جاتا ہے اور یہ پولیس کی مسلسل کارروائی ہے۔ میرے پاس اس بارے میں اعداد و شمار موجود ہیں۔ ان کے مطابق جتنی خواتین گرفتار کی گئی ہیں وہ غیر قانونی ہیں۔ اس لیے کہ اس بارے میں قانون کی متعلقہ دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ کوئی مرد اگر عورت کو کسی گناہ کے لیے ورغلاتا ہے اس میں عورت ملزمہ ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس کے باوجود اگر پرچہ کٹا ہے اور عورتیں گرفتار ہوئی ہیں اور جیلوں میں رہی ہیں تو اس کی ذمہ داری حدود آرڈیننس پر نہیں ہے۔ اس کی ذمہ داری پولیس اور عدالت کے نظام پر ہے۔ اس کی ذمہ داری ان بااثر افراد پر ہے جو اپنی کھال بچانے کے لیے عورتوں پر یہ ظلم کرتے ہیں لیکن الزام آپ دیتے ہیں حدود آرڈیننس کو۔

دیکھیے غلام نبی کاٹھیو بنام سرکار میں عدالت عالیہ کا فیصلہ کیا ہے: ”ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ پولیس کا رویہ حیران کن اور متعلقہ جج کا رویہ اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے۔ ایک

---

[1] 'حدود قوانین موجودہ بحث اور آئندہ لائحہ عمل' مصنف جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، جولائی ۲۰۰۶ء، صفحہ نمبر ۱۹

سینئر جج جو سیشن جج کے مرتبے پر فائز ہے پورے حیدر آباد ڈویژن کی انسداد دہشت گردی کی عدالت کا جج ہے، اس سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی جو اس نے کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فاضل جج جناب عبد الغفور حسین نے شہادت کے مندرجات تک کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ ان پر صورتحال واضح ہو جاتی۔ ملزم چونکہ غریب آدمی تھا، وکیل کرنے کی استعداد نہ رکھتا تھا لہٰذا، اس کی سماعت وکیل کے بغیر ہوئی، وہ چونکہ غیر تعلیم یافتہ اور ان پڑھ تھا لہٰذا اپنا دفاع بھی نہ کر سکا۔ دیکھیے! یہ عدالت ملزم کو کیا انصاف فراہم کرتی ہے۔

پولیس افسر سے جب اس بات کی وضاحت طلب کی گئی کہ اس نے حسن کی بجائے غلام نبی کو کیوں گرفتار کیا تو اس نے کہا کہ حسن اصل میں غلام نبی کا بھائی تھا اور مدعی نے مقدمے میں غلطی سے غلام نبی کی بجائے اس کے بھائی حسن کا نام لکھوا دیا لیکن وہ یہ محسوس نہ کر سکا کہ جس فرد کا نام ایف آئی آر میں ہے وہ غلام نبی کا بھائی نہیں ہو سکتا کیونکہ حسن، محرم کا بیٹا ہے اور اس کی ذات جونیجو ہے جبکہ غلام نبی میرو کا بیٹا ہے اور اس کی ذات کاٹھیو ہے۔ مختلف ذات اور ولدیت کے افراد آپس میں بھائی کیسے ہو سکتے ہیں؟"

دوہرا نظام: دوسری وجہ یہ ہے جنابِ والا! کہ آپ نے چند حدود کو ایک پورے کے پورے نوآبادیاتی نظام انصاف کے اوپر ڈال دیا ہے۔ یوں اب ان کے درمیان ایک دہرا نظام چل رہا ہے۔ حالانکہ ملک کا دستور یہ کہتا تھا کہ سات سال کے اندر تمام قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے تین ہزار قوانین کے بارے میں اپنی رپورٹ دی ہے، مشترکہ عدالتی کمیشن سات آٹھ سو قوانین کے بارے میں اپنی رائے دے چکا ہے لیکن نہ اس پارلیمنٹ کو اور نہ کسی حکومت کو یہ توفیق ہوئی کہ اس آمیزے کو ختم کرے۔

اصلاح کیسے ممکن ہے؟

جنابِ والا! یہ بات بھی آپ یاد رکھیں کہ اسلامی قوانین اور تعلیمات کا نفاذ کسی ایک شعبے میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے پورے نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کہ

آپ پولیس، عدلیہ کے نظام، قانون، سیاست، تعلیم اور آگہی، پولیس کی اور ججزاور وکلاء کی تعلیم کا انتظام نہ کریں، ان سب کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تو اصل خرابی ان قوانین میں نہیں، اصل خرابی اس نظام کے اندر ہے۔ اس کی اصلاح کیجیے اور اس کے ساتھ ساتھ جو مظالم عورتوں کے ساتھ ہو رہے ہیں ان کے لیے قانون سازی بھی کیجیے، تعلیم بھی دیجیے اور سیاسی ذرائع کو بھی استعمال کیجیے۔ بااثر سرمایہ دار، زمیندار، نام نہاد پنچایت اور ان کو تحفظ دینے والی سول انتظامیہ اور فوج، جب تک ہم ان کی اصلاح نہیں کریں گے، حالات نہیں بدلیں گے۔

میری نگاہ میں یہ تحفظ نسواں بل نہیں یہ انہدام حدود بل ہے اور اس کے ذریعے عورتیں مزید عدم تحفظ کا شکار ہو جائیں گی۔ جو لوگ آج ظلم کر رہے ہیں ان کو اس کے ذریعے مزید کھلی چھٹی ملے گی اور جو تھوڑا بہت تحفظ اس حدود آرڈیننس میں حاصل تھا خواتین اس سے محروم ہو جائیں گی۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور یہ چھلانگ نہ لگائیے۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کے لیے خسارے کا سودا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس ایوان کو اور اس قوم کو اللہ کی حدود اور اللہ کے احکام سے روگردانی اور بغاوت سے محفوظ رکھے اور اللہ کی نافرمانی اور اس کے عذاب کو دعوت دینے کے لیے جو کام ہو رہا ہے اس سے اس ملک کو بچائے۔ (۲۲نومبر ۲۰۰۶ء)

- ۲ -

حدودِ قوانین اور پاکستان کے معاملات میں بیرونی مداخلت

جناب چیئرمین! آج کے نوائے وقت میں جب میں نے یہ سرخی پڑھی تو جنابِ والا! میں چونک اٹھا۔ سرخی کے الفاظ ہیں: 'تحفظ نسواں بل، صدر مشرف علماء کمیٹی کی تجاویز لے کر امریکہ گئے ہیں' مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ سرخی صرف سنسنی پھیلانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ تفصیل دیکھی تو معلوم ہوا کہ ایک نجی ٹیلی ویژن پر چوہدری شجاعت حسین نے یہ بات کہی ہے۔ چوہدری صاحب بڑے ذمہ دار فرد ہیں، سابق وزیر اعظم ہیں اور مسلم لیگ کے صدر بھی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس مسئلے پر ان کا رویہ فوجی حکمرانوں کے رویے

سے مختلف رہا ہے اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ افہام و تفہیم کے ذریعے کوئی راستہ نکلے۔ تاہم ان کے بیان کا متن غیر متوقع ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”تحفظ حقوق نسواں بل قومی اسمبلی کے سامنے پیش کرنے میں پندرہ دن کی تاخیر ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ صدر علماء کمیٹی کی نئی تجویز امریکہ لے کر گئے ہیں۔ اس بل پر حکومتی اتحاد کے بھی تحفظات ہیں“۔ ان کا لفظ بہ لفظ یہ بیان ٹی وی پر آیا ہے، خبر اس کی رپورٹ پر مبنی ہے۔

جنابِ والا! میں نے مزید تحقیق کی کوشش کی۔ میں نے پھر بین الاقوامی مذہبی آزادی رپورٹ ۲۰۰۶ء دیکھی جو امریکہ کی ایک سرکاری دستاویز ہے۔ امریکہ کی حکومت کی جاری کی ہوئی بائیس صفحے کی اس رپورٹ کے اندر یہ بات کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

> توہینِ رسالت ﷺ کے قانون اور حدود آرڈیننس کے غلط استعمال کے حوالے سے وسیع پیمانے پر جو خدشات ظاہر کیے گئے ان پر گفتگو کرنے کے لیے مختلف این جی اوز کے زیر اہتمام متعدد سیمیناروں میں شریک ہونے والے اراکین پارلیمنٹ سرکاری افسران، مختلف وزارتوں کے حکام اور متعلقہ گروپوں سے امریکی سفارت خانہ متواتر اپنی تشویش ظاہر کرتا رہا ہے۔

جنابِ والا! امت مسلمہ ہند نے بڑی قربانیاں دے کر قائد اعظم کی قیادت میں سامراج سے آزادی حاصل کی تھی اور یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ اب یہ فوجی حکمران اس آزادی کو غلامی میں بدل رہے ہیں۔ ہمارے فیصلے پارلیمنٹ میں نہیں ہوتے بلکہ اسے معطل کیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ہمارے درمیان اختلافات ہیں۔ حزب اختلاف اور حکومت کے درمیان اختلافات تو معمول ہے لیکن اس معاملے میں خود حکومت کی پارٹی کے درمیان بھی اختلافات ہیں اور اپوزیشن پارٹیوں کے درمیان بھی اختلافات ہیں۔ ایسے میں راستہ وہی ہے کہ مذاکرات اور دلیل سے پارلیمنٹ طے کرے کہ ہمارا قانون کیا ہونا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن و سنت کیا ہے، شریعت کیا کہتی ہے اور حقوق نسواں کیا ہیں، ان کا فیصلہ کون کرے گا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کریں گے، یہ پارلیمنٹ یا امریکہ۔

یہ واضح دستاویز جس میں مسلم لیگ کے سربراہ کا بیان ہے کہ مشرف صاحب ان تجاویز کو امریکہ لے کر گئے ہیں، اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک سرکاری رپورٹ ہے جس کے لیے امریکی سفارتخانہ کے افسران، پارلیمنٹ کے ارکان اور حکومت کو مجبور کرتے ہوئے یہ ایک مخصوص ایجنڈا آگے بڑھا رہے ہیں۔ جنابِ والا! پھر اسے آپ ذرا سا اور پھیلا دیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ یہ محض ایک معاملہ نہیں ہے۔ بلا شبہ ہمارے سیاسی حکمرانوں نے بھی کمزوری دکھائی لیکن تاریخ بتاتی ہے ایوب خان کا زمانہ ہو یا یحییٰ خان اور ضیاءالحق کا زمانہ یا مشرف کا دور اور حتیٰ کہ سیاسی دور میں بھی امریکہ نے اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے پاکستانی فوج کی قیادت کو استعمال کیا ہے۔ دو اور دو چار کی طرح میں دستاویزی حقائق بھی پیش کر سکتا ہوں۔

روائیداد خان نے جو پاک امریکن دستاویزات[1] شائع کی ہیں، ان کو پڑھ لیجیے۔ ہر موقع کے اوپر حتیٰ کہ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء لگنے سے پہلے بھی اس وقت کے امریکی سفیر کا کردار سامنے آجاتا ہے۔ اس نے جو رپورٹ بھیجی ہے اور اس کے علاوہ اس کے سارے خطوط بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اور آگے بڑھیے ایمل کانسی کو یہاں سے (۱۵جون۱۹۹۷) بھیجا گیا ہے اس کے حوالہ سے آپ ایڈمرل زینی کی یادداشتیں (The Battle for Peace) پڑھ لیجیے۔ وہ چھپ گئی ہیں اس میں اس نے صاف کہا ہے کہ جب ہم نے طے کیا کہ ہم نے ایمل کانسی کو یہاں لانا ہے تو ہم نے وزیر اعظم یا صدر کو ٹیلیفون نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ ہم نے چیف آف سٹاف [جنرل جہانگیر کرامت] کو ٹیلیفون کیا اور اس نے اسے (ایمل کانسی کو) ہم تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد جنابِ والا! اس دور میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب سے زیادہ تباہ کن ہے۔ ابھی مجھے بتایا گیا ہے میں خود تو نہیں پڑھ سکا ہوں۔ سینیٹر سعدیہ عباسی نے کہا ہے کہ جسونت سنگھ نے کارگل کے واقعہ بارے میں جو نقطۂ نظر

[1] The Amercian Papers: Secret and Confidential India-Pakistan-Bangladesh Documents 1965-1973.

پیش کیا ہے، اس میں اس وقت کے کور کمانڈر کے بارے میں صاف کہا ہے کہ وہ کس طرح کام کر رہا تھا۔

جنابِ والا! یہ سب کچھ سامنے رکھتے ہوئے میں کہنا چاہتا ہوں کہ صورتِ حال نہایت ابتر بنا دی گئی ہے۔ سیاست ہو، قانون سازی ہو یا حتّٰی کہ شریعت کے امور، اب اس کا فتویٰ جو ہے وہ علماء نہیں دیں گے اور نہ دستور کے مطابق اس کو پارلیمنٹ طے کیا کرے گی بلکہ اس پر راہنمائی جنرل صاحب امریکہ سے لے کر آئیں گے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کو سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں پوری قوم کو بھی آپ کے ذریعے سے مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ آنکھیں کھول کر دیکھو، کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کیا ہم بیرونی سامراج کے کارندے بننے کے لیے تیار ہیں اور کیا اس طرح اس آزادی کو ہم قربان نہیں کر رہے ہیں جو بڑی قربانیاں دے کر اور بڑی جدوجہد کرنے کے بعد حاصل کی گئی۔ آج وہ آزادی، ہمارا ایمان اور ہماری عزت ہدف بنی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے اٹھیے اس آزادی کے تحفظ کے لیے قربانی دیجیے۔

جنابِ والا! اس کے ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ پارلیمنٹ کو ہی فیصلہ کرنا چاہیے، یہ اس کا اختیار ہے۔ میں اس وقت بھی امریکہ کی رپورٹ اور یہ بیان حوالے کے بغیر پیش نہیں کر رہا ہوں۔ بیرون ملک پاکستانیوں سے ضرور مشورہ کیجیے لیکن فیصلہ یہاں ہونا چاہیے۔ آپ نے سینیٹ کا اجلاس اس لیے بلایا تھا کہ آپ وہاں (امریکہ) سے وہ بل منظور کروا کر یہاں لانا چاہتے تھے۔ آپ کے پاس اور کچھ نہیں تھا لیکن آپ وہ نہیں کر سکے اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم اس کو لے کر امریکہ جا رہے ہیں۔ آپ کی اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے کہ آپ امریکہ میں وہاں کے پاکستانیوں سے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے جا رہے ہیں؟ وہاں کے پاکستانیوں کو نہیں، آپ وہاں کی حکومت کو خوش کرنا چاہ رہے ہیں اور جیسا کہ اس رپورٹ سے صاف ظاہر ہے کہ امریکہ کی حکومت اور امریکی سفارت خانہ اس میں ملوث ہے اور ہمارا اعتراض یہی ہے۔

(۱۹ ستمبر ۲۰۰۶ء)

- ۴۳ -

جناب چیئر مین! قواعد کے تحت تیسری خواندگی کے مرحلے پر پورے بل کے بارے میں رائے دینے کا اور تقریر کرنے کا میرا حق ہے۔ اس لیے کہ اب ہم نے پورے بل کو پاس کرنا ہے یا مسترد کرنا ہے۔ میں لمبی تقریر نہیں کروں گا لیکن اس موقع پر اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر آپ کو یاد دلاؤں کہ اس بل میں آپ قرآن وسنت کے واضح احکام کے خلاف قانون سازی کر رہے ہیں جو کہ دستور اور ہمارے ایمان کے خلاف ہے۔ خدا کے لیے اس سے احتراز کیجیے۔

میں دلائل دینے کی بجائے صرف یہ کہتا ہوں کہ کیا کیا چیزیں قابل اعتراض ہیں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ زنا بالجبر اور زنا بالرضا دونوں اسلام کی نگاہ میں گناہ بھی ہیں، جرم بھی اور دونوں کے لیے حَد ہے۔ جو آپ کا آرڈیننس ہے میں چاہوں گا کہ آپ اس کی دفعہ ۴ کو دیکھیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ اس میں کہا جاتا ہے کہ:

> زنا:-جب ایک مرد اور عورت نکاح کے بغیر باہمی رضامندی سے ہمبستری کریں تو وہ زنا کا ارتکاب کرتے ہیں۔
>
> اب اس کے بعد پھر سیکشن ۵ میں زنا بالرضا اور سیکشن ۶ میں زنا بالجبر ہے۔ اس میں جو سیکشن ۷ سے ہے میں آپ کو پڑھ کر سنتا ہوں۔
>
> - زنا بالجبر کی سزا 'حَد' ہے اگر یہ سیکشن ۵ کی ذیلی دفعہ (۱) کے میں بیان کردہ حالات کے مطابق واقع ہو۔
> - جو بھی زنا بالجبر کا مرتکب ہے اس پر اس آرڈیننس کی دفعات کے تحت 'حَد' نافذ ہو گی۔

تو یہ صاف چیز موجود تھی آپ اب سیکشن ۶ اور ۷ کو حذف کر رہے ہیں جس کے معنی

یہ ہیں کہ زنا بالجبر کو بحیثیت حَد آپ نے ختم کر دیا ہے۔ اب زنا بالجبر یا عصمت دری کے بارے میں جو آپ نے نیا قانون بنایا ہے اس میں آپ نے حَد اور حَد کی سزا کو نہیں رکھا۔ اس سے زیادہ دیدہ دلیری آپ نے یہ کی ہے کہ آپ نے اس قانون کے جو مقاصد بیان فرمائے ہیں اور جسے وزیر محترم نے اپنی تقریر میں درست قرار دیا ہے۔ اس کے بارے میں صفحہ ۱۴ پر لکھا ہوا ہے کہ:

زنا بالجبر (زنا بالجبر) کی کوئی 'حَد' نہیں۔ یہ تعزیر کا جرم ہے۔

زنا بالجبر جو قرآن و سنت کی رو سے، سورۃ نور کی واضح آیت کی رو سے حَد ہے۔ آپ نے اس کو بحیثیت حَد اب ختم کر دیا ہے یہ پہلا جرم ہے جو قرآن و سنت کے خلاف اس میں آپ کر رہے ہیں۔ دوسری شق یہ ہے کہ اسلام میں زنا ایک فرد کے خلاف جارحانہ اقدام بھی ہے اور معاشرے اور ریاست کے خلاف جارحیت بھی ہے اسی لیے اس کو حدود اللہ کہا گیا ہے۔ آپ نے اس قانون میں اسے صرف ایک فرد کے خلاف جارحیت رکھا ہے معاشرے کے اور ریاست کے خلاف جارحیت نہیں رکھا ہے یہ دوسری آپ نے زیادتی کی ہے۔ تیسری چیز آرٹیکل جس کا سیکشن ۳ ہے وہ واضح کہتا ہے کہ باقی تمام سول قوانین کا جہاں کہیں بھی حدود آرڈیننس سے تصادم ہو گا اس میں حدود آرڈیننس کو بالادستی ہو گی آپ نے اس شق کو بھی نکال دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اب اللہ کا قانون اور انسان کے بنائے قانون برابر ہیں اور جن معاملات کے اندر آپ تعزیر لے کر آ رہے ہیں یا کوئی بھی چیز لے کر آ رہے ہیں اگر کہیں کوئی تصادم ہے تو اب خدا کا قانون برتری/ بالادستی کا حامل نہیں ہو گا۔ یہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ کے بھی خلاف ہے اور یہ ہمارے ایمان کے بھی خلاف ہے۔

چوتھی چیز حَد اور تعزیر کے معاملہ کو گڈمڈ کرنا ہے۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں اور اسلامی قانون کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں حَد اور تعزیز دونوں اسلامی قانون کا حصہ ہیں۔ قاضی جو ان کا فیصلہ کرنے والا ہے وہ شریعت کے مطابق معاملات کو طے کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حدود آرڈیننس میں تعزیر کی سزاؤں کو بھی ضابطہ فوجداری سے نکال کر اس کا

حصہ بنایا گیا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پھر یہ طے کر دیا گیا کہ ان کی اپیل فیڈرل شریعت کورٹ میں جائے گی، عام عدالت میں نہیں جائے گی۔ اب آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ نے اسے دوبارہ علیٰحدہ کر دیا ہے۔ در حقیقت آپ نے دوبارہ نو آبادیاتی قانون کو زندہ کیا ہے اور تعزیر کو آپ تعزیرات میں لے گئے ہیں۔ اس صورت میں اب وہ شریعت کورٹ کے دائرہ اختیار سے باہر ہو گئی ہے۔ اب عام کورٹ اس کو سزائیں دے گی اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ آپ نے اس پورے نظام کو دوبارہ ختم کر دیا ہے۔ یہ آپ کی چوتھی خلاف ورزی ہے۔

جنابِ والا! حَد نا قابل مصالحت اور نا قابل تخفیف ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی یہ کہا ہے کہ حدود کے معاملہ میں کوئی مداخلت، کوئی سفارش، کوئی چیز قابل قبول نہیں ہے [ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش، قبیلۂ بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہ بنت اسود کے معاملے میں جس نے چوری کی تھی، کافی فکر مند ہوئے، وہ کہنے لگے: اس کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے کون گفتگو کرے گا؟ لوگوں نے جواب دیا: رسول اللہؐ کے چہیتے اسامہ بن زید کے علاوہ کون اس کی جرأت کر سکتا ہے؟ چنانچہ اسامہ نے آپ سے گفتگو کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک 'حَد' کے بارے میں سفارش کر رہے ہو؟ پھر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا: لوگو! تم سے پہلے کے لوگ اپنی اس روش کی بنا پر ہلاک ہوئے کہ جب کوئی اعلیٰ خاندان کا شخص چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور جب کمزور حال شخص چوری کرتا تو اس پر 'حَد' جاری کرتے، اللہ کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو میں اس کا (بھی) ہاتھ کاٹ دیتا][1] آپ نے حدود کی سزاؤں میں صوبائی اور وفاقی حکومتوں کو معافی اور تخفیف دونوں اختیار دے دیے ہیں۔ یہ پانچویں خرابی اور پانچویں خلاف ورزی ہے۔

چھٹی خرابی یہ ہے جنابِ والا! کہ اسلام میں لعان جو ہے اس میں بلا شبہ صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر شوہر بیوی پر تہمت لگاتا ہے تو اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ دونوں سے حلف

---

[1] بحوالہ جامع ترمذی، حدیث ۱۴۳۰

لو۔ اگر دونوں قرآن اٹھالیتے ہیں تو یہ گویا کہ دونوں کے اوپر ایک لعنت کی صورتحال پیدا ہوتی ہے اور اس صورت میں طلاق ہو جاتی ہے[۱]۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ دونوں حلف نہ اٹھائیں تو جو سزا اسلامی قانون نے اس کی مہیا کی ہے کہ آپ ان کو سرزنش کیجیے، اور آپ ان کو قید کیجیے حتیٰ کہ وہ اعلان کر دیں۔ آپ نے اسے ختم کر دیا ہے جس کا معنی ہے آپ کی نگاہ میں یہ صرف طلاق کا مسئلہ ہے۔ جبکہ اسلامی قانون اور قرآن کی نگاہ میں صرف طلاق کا نہیں بلکہ زنا کا معاملہ بھی ہے اور اگر اس پر کوئی فریق اعتراف کر لیتا ہے تو اس کے اوپر حد ہے۔ اسے بھی آپ نے منسوخ کیا ہے۔ قرآن وسنت اور اسلامی قانون کے خلاف یہ چھ کھلی شقیں آپ اس قانون میں ڈال رہے ہیں۔ ہم نے کھل کر اور وضاحت کے ساتھ بات کی ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف آپ یہ کام کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود آپ یہ کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کیجیے لیکن یہ یاد رکھیے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بری الذمہ کرے جو افراد اس کے حق میں ووٹ دیتے ہیں، جوابدہی ان کی ہے ہماری نہیں[۲]۔

(۲۳نومبر ۲۰۰۶ء)

---

۱ اور جو لوگ اپنی بیویوں پر الزام لگائیں [شریعت کی اصطلاح میں اس کو لعان کہتے ہیں۔ یہ لعان گھر بیٹھے نہیں ہو سکتا بلکہ عدالت میں ہونا چاہیے۔ لعان کا مطالبہ مرد کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور عورت کی طرف سے بھی۔ الزام لگانے کے بعد لعان سے اگر مرد پہلو تہی کرے، یا عورت قسمیں کھانے سے اجتناب کرے تو اس کی سزا حنفیہ کے نزدیک قید ہے جب تک مجرم لعان نہ کرے۔ اور دونوں طرف سے لعان ہو جانے کے بعد عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے حرام ہو جاتے ہیں] اور ان کے پاس خود اُن کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں تو اُن میں سے ایک شخص کی شہادت (یہ ہے کہ وہ) چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (اپنے الزام میں) سچا ہے اور پانچویں بار کہے کہ اُس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنے الزام میں) جھوٹا ہو۔ اور عورت سے سزا اِسی طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر شہادت دے کہ یہ شخص (اپنے الزام میں) جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اُس بندی پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر وہ (اپنے الزام میں) سچا ہو۔ تم لوگوں پر اللہ کا فضل اور اس کا رحم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا التفات فرمانے والا اور حکیم ہے تو (بیویوں پر الزام کا معاملہ تمہیں بڑی پیچیدگی میں ڈال دیتا)۔ (سورۃ النور ۲۴:۶-۱۰)

۲ تحفظ نسواں کا قانون بالآخر جنرل مشرف کے دباؤ پر حکومتی پارٹی (ق لیگ اور اتحادی) نے اکثریت کی بناء پر منظور کرالیا جو آج بھی نافذ العمل ہے۔

ضمیمہ: خط اور تجاویز منجاب علماء کرام و مشائخ عظام

"باسمہ تعالیٰ"

محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاج گرامی!

گذارش ہے کہ ایک اہم ملی و قومی مسئلہ کی طرف آنجناب کو توجہ دلائی جارہی ہے امید ہے کہ آپ پوری توجہ کے ساتھ اس پر غور فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

کافی عرصہ سے ملک میں حدود آرڈیننس کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کی مہم جاری ہے اور قرآن و سنت میں صراحت کے ساتھ موجود حدود شرعیہ کو مسلسل ہدف تنقید بنایا جارہا ہے۔ حالانکہ پاکستان کا قیام اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے عمل میں لایا گیا تھا اور دستور پاکستان میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ قرآن و سنت کے قوانین کی عملداری کا اہتمام کیا جائے گا اور پاکستان کے معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنانے کے لیے پورے وسائل بروئے کار لائے جائیں گے۔ مگر اس کے برعکس ہمارے معاشرہ کی اسلامی اور مشرقی اقدار کو پامال کر کے مغرب کی مادر پدر آزاد معاشرت کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

حدود آرڈیننس میں مجوزہ ترامیم اور قومی اسمبلی میں پیش کیا جانے والا "تحفظ حقوق نسواں بل" اسی سلسلہ کی ایک کڑی دکھائی دے رہے ہیں اور ملک کے سرکردہ علماء کرام نے اس سلسلہ میں اپنے تحفظات کا اظہار کر کے اس بل کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے تجاویز و سفارشات پیش کر دی ہیں، جو اس عریضہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں بھجوائی جارہی ہیں۔

آنجناب سے گذارش ہے کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ فرمائیں اور (۱) قرآن و سنت کے واضح احکام (۲) دستور پاکستان کے تقاضوں اور (۳) اسلامی و مشرقی معاشرت کی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے تحفظ حقوق نسواں بل کو علماء کرام کی سفارشات کی روشنی میں قابل قبول بنانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں تاکہ ہم اپنے ملی اور دستوری فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکیں اور آقا نامدار محمد ﷺ کے حضور قیامت کے دن پیش ہوتے ہوئے شرمساری اور ندامت سے بچ سکیں۔

امید ہے کہ ہماری معروضات، آپ کی سنجیدہ توجہ کی مستحق قرار پائیں گی۔ شکریہ

والسلام

علماء کرام و مشائخ عظام پاکستان

۱۷ ستمبر ۲۰۰۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قومی اسمبلی میں "تحفظ حقوق نسواں" کے عنوان سے حدود آرڈیننس میں ترامیم کا جو بل زیر بحث ہے اس کے بارے میں پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین اور قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ملاقات میں طے کی جانے والی خصوصی علماء کمیٹی کا اجلاس آج اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا حسن جان مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری،ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی، مولانا زاہد الراشدی، مولانا اخلاق احمد اور حافظ محمد عمار یاسر نے شرکت کی جبکہ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کے ہمراہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی، سردار نصر اللہ دریشک اور وزارتِ قانون کے بعض ذمہ دار حکام نے شرکت کی۔

چوہدری شجاعت حسین نے علماء کرام سے کہا کہ "تحفظ حقوق نسواں" بل کے بارے میں یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے منافی باتیں بھی شامل ہیں اس لیے ہم نے آپ حضرات کو زحمت دی ہے کہ آپ حضرات بل کا جائزہ لے کر قرآن و سنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں۔ کیونکہ ہم کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے جو حدود شریعہ اور قرآن و سنت کے منافی ہو بلکہ ہم ایسا سوچنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں۔ اس پر علماء کرام اور ماہرین قانون نے بل کی متعدد دفعات کا ایک اجلاس میں تفصیلی جائزہ لیا جو ۱۰ ستمبر ۲۰۰۶ء بروز اتوار صبح ۹ بجے سے کھانے اور نماز کے وقفے کے ساتھ رات تین بجے تک جاری رہا اور اگلے روز ۳ بجے سہ پہر تک بھی یہ مشاورت جاری رہی اور متعدد اصولی امور پر اتفاق رائے ہو گیا جس کے مطابق مندرجہ ذیل معاملات طے پائے۔

۱) زنا بالجبر اگر حَد کی شرائط کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس پر حَدِ زنا جاری کی جائیگی۔

۲) حدود آرڈیننس میں زنا موجب تعزیر کی بجائے "فحاشی" کے عنوان سے ایک نئی دفعہ کا تعزیرات پاکستان (PPC) میں اضافہ کیا جائے گا جس کا متن درج ذیل ہے۔

A man and a woman are said to commit lewdness if they willfully have sexual intercourse with one another and shall be punished with imprisonment which may extend to five years and shall also be liable to fine

۳) زنا آرڈیننس کی دفعہ تین کی جگہ مندرجہ ذیل دفعہ تحریر کی جائے گی۔

In the interpretation and application of this Ordinance the injunctions of Islam as laid down in the Holy Quran and Sunah shall have effect notwithstanding any thing contained in any other law for the time being in force

اجلاس میں شریک علماء کرام نے کہا کہ حقوق نسواں بل کے بارے میں قرآن و سنت کے حوالے سے اصولی امور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اور اب اس بل میں قرآن و سنت کے منافی کوئی بات باقی نہیں رہی تاہم بعض ذیلی امور پر اگر ہمیں مزید وقت دیا گیا تو تفصیلی سفارشات پیش کر دی جائیں گی۔ اجلاس میں علمائے کرام نے عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں بعض اہم سفارشات پیش کی ہیں جو منسلک ہیں۔

۱-مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
۲-مولانا مفتی منیب الرحمٰن
۳-مولانا حسن جان
۴-مولانا زاہد الراشدی
۵-ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی
۶-مولانا مفتی غلام الرحمٰن
۷-مولانا قاری محمد حنیف جالندھری
۸-مولانا اخلاق احمد
۹-حافظ عمار یاسر

۱-چوہدری شجاعت حسین
۲-چوہدری پرویز الٰہی
۳-سردار نصر اللہ دریشک

باب نمبر ۳

قدرتی آفات، تباہی اور بحران سے نمٹنے کا قومی نظام

قدرتی آفات آنے کا عمل فطری ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں سیلاب، زلزلے، وبائیں، آتش فشاں پھٹنے کے واقعات برسوں سے ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ایک حد تک یہ ممکن بنا دیا ہے کہ ایسی کسی آفت کی قبل از وقت معلومات مل جائیں لیکن اس ترقی کے باوجود بہت سے مواقع پر متعین پیش گوئی کرنا اور کئی صورتوں میں ان آفات کے برپا ہونے سے پیدا ہونے والی صورتحال سے نمٹنا انسانی بس میں نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود حکومتیں چاہے وہ مرکزی ہوں یا مقامی وہ جب متاثرین کی مدد کے لیے میدان میں آتی ہیں تو انسانی فطرت کے مطابق متاثرین مطمئن ہوتے ہیں کہ کچھ کیا جارہا ہے کچھ بہتری کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد کی زیرِ نظر تقاریر پاکستان میں اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے، جولائی-اگست ۲۰۰۷ء کی بارشوں اور بڑے پیمانے پر سیلاب، ۲۰۰۸ء میں کوئٹہ میں زلزلے اور اگست ۲۰۱۰ء میں پورے ملک میں تباہ کن سیلاب کے موقع پر سینیٹ آف پاکستان میں کی گئی ہیں۔

یہاں یہ تمام تقاریر زمانی ترتیب سے پیش کی گئی ہیں۔

- ۱ -

۲۰۰۵ء کا زلزلہ

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس اہم مسئلہ کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا ہے۔

۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کا زلزلہ ایک دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔ بلاشبہ یہ ایک قومی سانحہ

ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ تقریباً سو سال کے دوران اس علاقے میں اتنی بڑی تباہی نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر اس ایوان اور قومی اسمبلی کا غور کرنا، میری نگاہ میں ایک اہم ترین ذمہ داری ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ ہم ایک مہینے کے بعد اس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اولین اہمیت پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کو دی جانی چاہیے تھی تاکہ پورے طور پر اس پر سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔ یہ تاخیر ایک تکلیف دہ عمل ہے اور اس کا اظہار بھی ہوا۔ جنابِ والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ سب اس بات کی گواہی دیں گے کہ حزبِ اختلاف نے پہلے دن سے اسے ایک قومی مسئلے کی حیثیت سے لیا اور حکومت کو بھرپور تعاون پیش کیا۔ آل پارٹیز کانفرنس کی تجویز اپوزیشن کی طرف سے آئی۔ اپوزیشن ایک تحریک چلا رہی تھی، اسے اس نے ملتوی کیا۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ جس قومی یکجہتی کی اس ملک کو سب سے زیادہ ضرورت تھی اس کے لیے کوشش کی جاتی، لیکن میں دکھ کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اس تاریخی موقع کو ضائع ہونے دیا گیا۔

قومی جذبہ اور قابل فخر کردار: اس کے باوجود یہ ہم پر اللہ کا کرم اور قوم کی زندگی اور اس کے احساس کا ثبوت ہے کہ سب ہی طبقات نے مل کر حالات کا مقابلہ کیا۔ عوام نے اپنے دکھی بھائیوں اور بہنوں کی مدد کی۔ تباہ شدہ گھرانوں کو پناہ دینے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے میں لوگوں نے ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ اس موقع پر ہماری قوم میں خیر کا جو جذبہ تھا وہ اُبھر کر سامنے آیا اور بلا تخصیص کراچی سے خیبر تک اور قومی زندگی کے تمام شعبوں سے امدادی قافلے آئے۔ بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت سب نے اس معاملے میں اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی۔ بلا شبہ چند ناخوشگوار واقعات بھی ہوئے اور ان پر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی خیر غالب رہا اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اعتراف بیرونی میڈیا نے بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں، میں آپ کے سامنے ایک برطانوی صحافی کی رپورٹ پیش کرنا چاہتا ہوں:

یہ برطانوی رپورٹر لکھتا ہے: امریکہ میں سمندری طوفان کترینہ کے بعد (۲۰۰۵ء) نیو اورلینز میں جب حکومتی مدد نہیں پہنچی تھی، مسلح لٹیرے سڑکوں پر گھومتے تھے اور بچ جانے والوں کو حفاظت کے لیے اکٹھے ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں لوگ امدادی کاموں میں مدد کے لیے پورے ملک سے پہنچ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی نوکریاں چھوڑیں اور اپنی زندگی کو خطرات میں ڈال کر وادی کی ٹوٹی پھوٹی، گھومتی ہوئی سڑکوں پر چھوٹی بسوں اور ٹرکوں پر لٹک کر سفر کیا۔ بعض نے چمکتی دھوپ میں پہاڑیوں کے پار گھنٹوں پیدل سفر کیا اور چونکہ رمضان میں مسلمان روزہ رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے پانی بھی نہ پیا۔

اخلاقی اور نظریاتی پہلو: تو جنابِ والا! یہ اس قوم کی صلاحیت تھی۔ بلاشبہ اس میں غیر معمولی خیر، جذبہ اور قوت پوشیدہ ہے جسے اگر ٹھیک سے ہم آہنگ کیا جائے تو ہم بہت بڑی قوت بن سکتے ہیں۔

جنابِ والا! اس اعتراف کے بعد میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس پورے مسئلے پر غور کرنے کا ایک خاص اسلوب ہے۔ قرآن پاک میں اور نبی پاک ﷺ نے ہمیں سوچنے، حالات کا تجزیہ کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جو تعلیم دی اور حکمت سکھائی ہے اس میں اور اس رویہ میں جو خدا کی ہدایت اور راہنمائی سے ناآشنا قومیں اختیار کرتی ہیں، بنیادی فرق ہے۔ خدا ناآشنا رویہ یہ ہے کہ ہم اپنے معاملات میں صرف فطری طبعی پہلو دیکھیں اور اس سے آگے نگاہ نہ اٹھائیں۔ اسلام میں یہ ہے کہ طبعی پہلو کو لازماً دیکھا جائے، اسے ہم نے نظر انداز نہیں کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے جو اخلاقی نظریاتی اور روحانی پہلو ہیں ان کو بھی لازماً دیکھا جائے۔ اس لیے قرآن نے صاف یہ کہا ہے کہ ہم نے زندگی اور موت کو اس لیے بنایا کہ تمھیں آزمایا جائے۔ چنانچہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب ہمارے لیے ایک آزمائش کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کی حیثیت انتباہ کی بھی ہے۔

جنابِ والا! اس پہلو سے میں سب سے پہلے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ بحیثیت ایک

مسلمان قوم کے جہاں اس دکھ اور درد کو اور اس تکلیف کو ہم اپنی نس نس میں محسوس کر رہے ہیں، وہیں ہمیں اس کے اخلاقی اور نظریاتی پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے، اپنا جائزہ لینا چاہیے، اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ ہم اللہ کے کتنے وفادار ہیں، جو وعدے اور عہد ہم نے اس سے کیے ہوئے ہیں اسے ہم کہاں تک پورا کر رہے ہیں اور کہاں تک ہم ایک دوسرے کے حقوق ادا کر رہے ہیں؟ اگر ہم اس معاملے میں کوتاہی کریں گے تو اللہ کی ناراضگی کو دعوت دیں گے جس کے طبعی اظہار کی مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں۔ اس پہلو سے ہمارے سوچنے کا انداز اور زلزلہ زدگان کی مدد کے ساتھ ساتھ اللہ سے توبہ، اس سے رجوع، اس سے مدد طلب کرنا اور اس سے رحمت اور خیر طلب کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

حکومتی کوتاہیاں: جنابِ والا! دوسرا نکتہ یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اولین ایام میں حکومت اور مقتدر قوتوں کی طرف سے بڑی بھیانک کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ البتہ ان کی طرف آنے سے پہلے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ بعد میں حالات کو سنبھالنے کے لیے جو بھی کام ہوا ہے، رضاکاروں کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتیں، دینی جماعتیں، جہادی تنظیمیں، بین الاقوامی امدادی اداروں، این جی اوز، حکومت کی مشینری اور ہماری افواج، ان سب نے جو کچھ کام کیا ہے ہم اس کی قدر کرتے ہیں، اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اسی بات کو صحیح سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک مشترک مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ لیکن دکھ کے ساتھ یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ ہم اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کریں گے، اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں کہ اتنا بڑا سانحہ ہوا لیکن ہم کسی طرح بھی اس کے لیے تیار نہ تھے۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ ہمارے پاس اس طرح کی آفات کے بارے میں خبردار کرنے کا کوئی نظام نہیں۔ متعلقہ محکموں کے بارے میں جو رپورٹیں آئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ ہمارا بجٹ اتنا کم ہے کہ ہم معدنی ذخائر کی دریافت کا کام بھی انجام نہیں دے سکتے ہیں چہ جائیکہ زلزلے کا نقشہ بنایا جاسکے۔ اس وقت پاکستان میں زلزلہ کا ایک بھی تربیت یافتہ ماہر نہیں ہے۔ محکمہ موسمیات کے پاس جو ایک یا دو افراد ہیں وہ عام جیالوجسٹ ہیں جن کو محض ایک آدھ سال کی ڈپلوما تربیت کہیں سے دلوائی

گئی ہے۔

جنابِ والا! یہ ایک شدید قومی کوتاہی ہے اور یہ اس وقت ہے جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ زلزلے کے چار زون ہوتے ہیں اور پاکستان کے بیشتر علاقے بشمول اسلام آباد تیسرے اور چوتھے زون میں آتے ہیں جہاں زلزلے آنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود آج تک ملک کا کوئی باقاعدہ زلزلہ پیما نقشہ نہیں بنا۔ جو نقشہ موجود ہے اسے اپ ڈیٹ نہیں کیا جاتا۔ یہ بہت بڑی کوتاہی ہے جتنا جلدی اس کا تدارک ہو سکے کیا جائے۔

دوسری چیز جنابِ والا! قیادت کا ردِ عمل ہے۔ میں دکھ سے یہ بات کہتا ہوں کہ یہ واقعہ صبح ۸:۵۵ پر ہوا لیکن اس کے کئی گھنٹوں کے بعد بھی وزیر اطلاعات کا یہ تبصرہ پرائیویٹ ٹی وی چینلوں پر آرہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا ہے۔ زندگی کے معاملات اسی طرح چل رہے ہیں، بازار کھلے ہوئے ہیں اور یہ بیان محض ایک بار نہیں آیا بلکہ بار بار نشر ہو رہا تھا۔

جنابِ والا! جنرل پرویز مشرف صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ انہیں اسلام آباد میں عمارت گرنے کی اطلاع تو مل گئی تھی لیکن ملک بھر میں کیا ہوا اس کا صحیح ادراک انہیں ۸ تاریخ کی شام کو ہوا یعنی زلزلے کے گیارہ گھنٹے بعد۔ جبکہ محکمہ موسمیات یہ کہتا ہے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد انہوں نے اس زلزلے کی سنگینی اور ۶ء۷ ریکٹر اسکیل پر ہونے کی وجہ سے اس کے جو نتائج پورے ریجن کے لیے تھے ان سے ٹیلیفون کے ذریعے پرائم منسٹر آفس اور آرمی ہیڈ کوارٹرز کو مطلع کیا تھا۔ یہ اتنی تاخیر کیوں ہوئی ہے؟ دو دن کے بعد یعنی دس تاریخ کو ایک کور کمانڈر کہتا ہے کہ پریس مبالغہ کر رہا ہے اور اموات ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔ ایسے میں یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ فوج کی موبلائزیشن فوری طور پر کیوں نہ ہو سکی۔ مجھے اس بات پر دکھ ہے کہ اگرچہ خود بارڈر پر ہماری فوجیں خاصی تعداد میں موجود ہیں اور ان کے علاوہ بھی متاثرہ علاقوں کے بہت قریب راولپنڈی ڈویژن ہے، پشاور ہے، ان تمام مقامات پر فوج موجود تھی۔ آخر اس کو متحرک کرنے میں تین دن کیوں لگے؟ جو فوج موجود بھی تھی اسے کیوں استعمال نہیں کیا گیا؟ کیا وجہ ہے کہ قریبی جگہوں سے متحرک کرنے کی بجائے

گوجرانوالہ ڈویژن سے منگوائی گئی جو ساڑھے تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور جس کو متحرک ہونے میں بھی دو دن لگ گئے۔

جنابِ والا ! یہ بڑے سنجیدہ سوالات ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی انکوائری ہونی چاہیے کس کی ذمہ داری ہے، اس کا تعین ہونا چاہیے، پارلیمنٹ کے سامنے تمام معلومات آنی چاہییں۔ جنابِ والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آج پانچواں ہفتہ ہے، لیکن دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک بھی صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ کتنے افراد شہید ہوئے، کتنے زخمی ہوئے، کتنے گھر تباہ ہوئے ہیں؟ جو کچھ آرہا ہے اس کی حیثیت تخمینہ کی بھی نہیں ہے اندازوں کی ہے۔ ابھی آپ کے سامنے وزیر تعلیم نے بتایا کہ نو ہزار سکول صوبہ سرحد میں اور سات ہزار آزاد کشمیر میں تباہ ہوئے ہیں۔ مجھے یہ بتایئے کہ اگر ان میں سے نصف بھی اس میں آتے ہیں جو مکمل تباہ ہوئے ہیں، دوسرے الفاظ میں اگر آٹھ ہزار سکول ایسے ہیں کہ جہاں بچے پڑھ رہے تھے اور عمارتیں بیٹھ گئی ہیں اور ان میں سے بڑی تعداد شہید ہو گئی ہے۔ ان کی تعداد کتنی ہو گی؟ جو تخمینے زیادہ سے زیادہ آئے ہیں وہ سترہ ہزار بچوں کے ہیں، کیا یہ خیال آرائی نہیں ہے؟ جس درجہ کی تباہی واقع ہوئی ہے صاف نظر آرہا ہے کہ اعداد و شمار اس کی صحیح تصویر کو پیش نہیں کر رہے۔ حقائق تلخ ہوں مگر سامنا کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس انفارمیشن آنی چاہیے تاکہ اس کی مناسبت سے اس کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔

استعداد کار کی کمی: جنابِ والا! ایک اور پہلو بھی دیکھیے ملک میں قدرتی آفات اور بحران سے مقابلہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کیا جاتا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا یاد ہے کہ ہمیں اسکول میں ابتدائی طبی امداد کی تربیت دی جاتی تھی، آگ لگ جانے کی صورت میں یا بم پھٹ جانے اور یا کسی اور ہنگامی صورت میں کیا کیا جائے، ہمیں اس کی تربیت دی جاتی تھی۔ اسکاؤٹس کی حیثیت سے ہم نے یہ ساری چیزیں سیکھیں۔ تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اندر قومی رضاکار تنظیم ہوا کرتی تھی، شہری دفاع کا ایک نظام تھا۔ وہ سب کہاں چلا گیا؟ کتاب قانون میں شہری دفاع کے لیے ۱۹۵۸ء کا ایک قانون موجود ہے، بحران اور تباہی پر قابو پانے کا

نظام، اس قانون پر کتنا عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب زلزلہ آیا تو وزیر اعظم کے دفتر میں 'بحران میں انتظامات' کا ایک سیل، قائم کیا گیا تھا۔ ۲۰۰۰ء میں وزارتِ داخلہ میں ایک کرائسس مینجمنٹ سیل بنایا گیا ہے اور آج بھی ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر اس کا سربراہ ہے۔ ان سب کی موجودگی میں ہم سب کہاں سو رہے تھے۔

یہ بات سامنے آئی کہ ہمارے فائر بریگیڈ کے پاس یہ صلاحیت ہے ہی نہیں کہ اس طرح کی عمارتیں گر جائیں تو وہاں سے بچنے والوں کو کیسے نکالا جائے۔ اس کے برعکس آپ نے دیکھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر ترکی، ایران، اٹلی، برطانیہ اور جاپان سے ایسے افراد آ گئے جو تربیت یافتہ بھی تھے اور جن کے پاس آلات بھی تھے۔ ہم ممنون ہیں ان کے جنہوں نے یہاں آکر ہماری مدد کی لیکن ہمارے لیے ان کی حیثیت محض آئینے کی ہے۔ ہم کہاں تھے؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہ تو زلزلہ تھا اگر خدانخواستہ دشمن حملہ کرے اور اس کے نتیجے کے طور پر آپ کا کوئی شہر تباہ ہو جاتا ہے، آپ کی سڑکیں بند ہو جاتی ہیں تو آپ کے پاس کیا انتظام ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے؟ فوج کی سیکورٹی کا ہم بہت ذکر کرتے ہیں، کیا سیکورٹی کا یہ پہلو نہیں ہے؟ عالم یہ تھا کہ فوجی بیلچوں سے کام کر رہے تھے۔ ٹھیک ہے میں ان کی ہمت کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ننگے ہاتھوں سے اور بیلچوں سے لوگوں کو نکالا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف ہم اتنا خرچ کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہماری منصوبہ بندی کا حال یہ ہے کہ اس قسم کی تباہی خواہ جنگ کی صورت میں پیدا ہو یا امن کی حالت میں پیدا ہو، ہمارے پاس نہ اس سے نمٹنے کی تربیت ہے اور نہ ہی تکنیکی صلاحیت ہے۔ ہمارے پاس کوئی نظام نہیں جو استعمال کر سکیں یا جو ایسی ہنگامی حالت میں ہمارے کام آسکے۔

جنابِ والا! ہماری منصوبہ بندی اور ہمارے نظام میں، یہ بہت ہی بھیانک خلا ہے اس واقعے سے ہماری آنکھیں کھلنی چاہییں اور ہمیں فوری طور پر توجہ کرنی چاہیے۔ جنابِ والا! میں کہتا ہوں کہ آپ کے پاس مرسڈیز کے بیڑے کے بیڑے ہیں، آپ نے بلٹ پروف کاروں پر اربوں روپیہ خرچ کیا لیکن افسوسناک حقیقت یہ سامنے آئی کہ آپ کے پاس ہیلی کاپٹر

نہیں ہیں جن سے آپ ایسی صورت حال میں لوگوں کی جان بچاسکیں۔ یہ کیسی منصوبہ بندی ہے ؟ ہمیں ان تمام باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے اور متبادل انتظام بنانے کی ضرورت ہے اس لیے کہ جب تک آپ انتظام نہیں بناتے ہیں آپ نہ قوم کو تیار کرسکتے ہیں اور نہ ایسے حالات کا مقابلہ کرسکیں گے۔ یہ زلزلہ ایک بہت بڑی وارننگ ہے، اگر ہم نے اب بھی اس کو نظر انداز کیا تو مجھے معاف رکھا جائے اگر میں یہ کہوں کہ پھر ہم اس سے زیادہ بڑی تباہی سے نہیں بچ سکیں گے۔

فیصلہ سازی میں پارلیمنٹ کا کردار: جنابِ والا ! اس پہلو کے ساتھ میں اس طرف آنا چاہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس پورے زمانے میں جو سب سے بڑی حماقت تھی وہ پارلیمنٹ کو اور سول نظام کو نظر انداز کرنا ہے۔ سول نظام کو روندنے کے نتیجہ میں ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ جس میں ایک فرد واحد تمام فیصلے کرتا ہے۔ قوم کے منتخب نمائندوں کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ چار بڑے فیصلے اس زمانے میں ہوئے ہیں، ریلیف کمشنر کا تقرر، مقتدرہ برائے امداد وبحالی زلزلہ زدگان کا قیام (ERRA)، لائن آف کنڑول کا کھولنا، نیٹو کی افواج کو امدادی کارروائیوں کے نام پر یہاں آنے کی اجازت دینا۔ کیا ان فیصلوں میں کابینہ کو اعتماد میں لیا گیا تھا؟ کیا پارلیمنٹ کو اس میں اعتماد میں لیا گیا؟ اس میں کیا پارلیمنٹ کی تمام پارٹیوں کو اعتماد میں لیا گیا تا کہ اس بارے میں اتفاق رائے ہو سکے ؟ جناب والا ! ایسا نہیں کیا گیا۔

مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس اہم اتھارٹی (ERRA) کا قیام اچانک کیا گیا ہے۔ ایسے ادارے پارلیمنٹ کی قانون سازی کے ذریعے بنتے ہیں اور اگر پارلیمنٹ کا اجلاس نہ ہو تو ماشاءاللہ ہمارے ہاں آرڈیننس جاری کرنے کا شوق ہے لیکن یہ بھی نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اس کے لیے انتظامی حکم کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ انتظامی حکم سے ایسے دوررس نتائج کے حامل ادارے نہیں بنائے جاتے۔ انتظامی حکم سے آپ ایک ایسا ادارہ بنا رہے ہیں جو امداد اور بحالی کا پورا معاملہ نپٹائے گا اور اگر یہ پانچ ساڑھے پانچ ارب ڈالر جو میری نگاہ میں کم تخمینہ ہے

اس کے ذریعے خرچ ہونے ہیں تو یہ تین سو ارب روپے سے زیادہ کا بجٹ بن جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے کل قومی بجٹ کا ایک تہائی تقریباً اس ایک ادارہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس کے پاس صوابدیدی اختیارات ہوں گے لیکن اس کے احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ اس کے اقدامات کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا نہ ہی اس کی کوئی رپورٹ پارلیمنٹ میں آئی کہ کیا طریقہ کار ہو گا؟ درحقیقت اس طرح کے اقدامات سے آپ سول نظام کو مسلسل پامال کر رہے ہیں۔

جنابِ والا! فیصلوں کا یہ طریقۂ کار عسکری بالادستی اور پورے نظام کو ایک طرح سے آرمی کے تحت لے آنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس زمانے کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ بلاشبہ آرمی کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے قومی سانحات کے مواقع پر اپنا کردار ادا کرے۔ دستور کا آرٹیکل ۱۴۵ صاف کہتا ہے کہ کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو تو سول نظام آرمی کی مدد لے گا۔ دنیا بھر میں یہ ہوا ہے۔ پاکستان میں بھی اس سے پہلے ہوا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ سول نظام کو نظر انداز کر دیں، پارلیمنٹ کو نظر انداز کریں اور کابینہ کوئی فیصلہ نہ کرے۔ آپ ایسے ادارے بنائیں جو مخصوص لوگوں کے ہاتھ میں ہوں اور اس میں بھی کیا تعلیمی قابلیت ہے، کیا تجربہ ہے، کوئی چیز سامنے نہیں آتی۔ جنابِ والا! یہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ میں اس کو اصولی انحراف سمجھتا ہوں اور یہ اصولی انحراف ملک کے لیے بڑا خطرناک ہے۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک آپ سول اداروں کو مستحکم نہیں کرتے اس طرح کی ہنگامی صورتحال کا مقابلہ کرنے کی استعداد پیدا نہیں ہو گی۔ سول اداروں میں مقامی حکومتیں بھی شامل ہیں، لیکن یہاں مقامی حکومتیں بالکل غائب ہیں، ان کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ صوبائی حکومت اور مرکز کی سول حکومت کا ذکر بھی برائے نام ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے اور یہ بات صرف ہم ہی نہیں کہہ رہے بلکہ دنیا بھر میں نوٹ کی جا رہی ہے۔ جناب چیئرمین! مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو اس سلسلے میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ International Herald Tribune ۱۲ اکتوبر کے اپنے ایک مضمون میں جو Ian

Bremer کا لکھا ہوا ہے بڑی اہم بات کہتا ہے، وہ کہتا ہے:

''یونان، ترکی، انڈونیشیا میں بعض بنیادی مشترکات ہیں کہ وہ جمہوریتیں ہیں۔ ان کے لیڈر عوام کی رائے کے مطابق چلتے ہیں جبکہ پاکستان کے صدر جنرل مشرف کوئی مقبول قانونی جواز نہیں رکھتے ایک ایسی ریاست میں جہاں فوج حکومت کرتی ہے وہ ایک فوجی جنرل ہیں جن کے پاس تمام انتظامی اختیارات ہیں''۔

یہ وہ تاثر ہے جو ہم خود پوری دنیا کو دے رہے ہیں جنابِ والا! یہ فوج کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔ بلاشبہ ہنگامی حالات میں فوج کا ایک اہم کردار ہے اور انہوں نے وہ ادا کیا ہے اور ادا کر رہے ہیں۔ اس پر ہم ان کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں لیکن خدا کے لیے تعمیر نو کے کاموں میں انھیں شامل کر کے وہ حالات پیدا نہ کریں کہ جن کے نتیجے کے طور پر فوج عام لوگوں کی تنقید اور غیض و غضب کا نشانہ بنے۔ فوج کو محفوظ رکھیے، وہ ملک کے دفاع کے لیے ہے۔ تعمیر نو اور بحالی کی ساری ذمہ داری سول نظام پر اور منتخب نمائندوں کی ہونی چاہیے۔ بلاشبہ اس نظام میں کمزوریاں ہیں لیکن اچھا یا بُرا، ٹھیک یہی ہے کہ اگر ناکامی بھی ہے تو اس کی ذمہ داری سول نظام پر ہونی چاہیے تاکہ عوام ہمارا احتساب کریں۔ لیکن ہمیں یقینی بنانا چاہیے کہ لوگ فوج کو گالی نہ دیں۔ فوج کی عزت، احترام اور جو اعتبار ہے وہ مجروح نہ ہو۔ بدقسمتی سے آپ جو راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان کوارڈی نیشن اور مقامی حکومتوں کا کردار: جنابِ والا! میں یہ بات بھی صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ایک اور نازک مسئلہ جو ہمارے سامنے آیا ہے وہ مرکز اور صوبوں کا تعلق اور تعاون ہے۔ جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے اس سے نہ صرف اس پورے عمل کی عسکری قالب میں تبدیلی ہوئی ہے بلکہ ایسی مرکزیت بھی ہوئی ہے جس میں دستوری ادارے یعنی صوبے اور مقامی حکومتیں نظر انداز ہو گئے، یہ بڑا ہی اہم مسئلہ ہے اور اس کے بڑے اور دور رس اثرات رونما ہوں گے۔ آپ اس بارے میں اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ سارا کام مرکز اور صوبوں کے تعاون سے لوکل نظام کو شامل کر کے کیا جانا چاہیے۔

اگر آپ نے اس کو نظر انداز کر کے یہ کام کیا تو جنابِ والا! مجھے ڈر ہے کہ یہ وفاق کے لیے نہایت خطرناک ہو گا۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ وفاق کے بارے میں کیا کیا مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ خدا کے لیے اس کو نظر انداز نہ کیجیے بلکہ ایک ایسا راستہ نکالیے جو نئے مسائل اور نئی پیچیدگیوں کا اضافہ نہ کرے۔

بحالیات کا ادارہ ایک منتخب ادارہ ہونا چاہیے اور یقینی بنانا چاہیے کہ اس میں مرکز کے ساتھ تمام صوبوں کی قیادت موجود ہو اور سب مل کر فیصلے کریں۔ یہ سب قانون سازی پارلیمنٹ کے تحت ہو جس کا حکومت کو آج فیصلہ کرنا ہے۔ پارلیمنٹ کی با اختیار کمیٹی ہو جو تمام مالی معاملات کی نگرانی کرے اور کنٹرول کرے اور اس ادارے کی رپورٹ ہر تین مہینے بعد پارلیمنٹ کے سامنے آئے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں آخر اسٹیٹ بینک ہمیں ملکی معاشی حالت کے اوپر ہر تین مہینے بعد ایک رپورٹ دیتا ہے۔ اس نہایت اہم معاملہ میں اگر آپ پارلیمنٹ کو ایک طرف کر کے محض ایک فرد یا چند افراد تک فیصلوں اور اختیارات کو محدود کر دیں، تو اس سے بڑا ظلم اس ملک کے ساتھ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے جنابِ والا! کہ مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی اداروں کی فکر کی جائے۔ صوبوں کو فیصلوں میں شامل کیجیے، ان کو حق اور وسائل دیجیے اور ٹھیک سے نگرانی اور حساب کیجیے۔ ہر سطح کے اوپر احتساب اور شفافیت ضروری ہے، لیکن اس طرح فوج کے ہاتھوں پر ہر چیز کو رکھ دینا اور اس کے بعد پھر یہ توقع کرنا کہ باقی لوگوں کو بھیک دی جائے گی، میں سمجھتا ہوں یہ بڑا خطرناک اور غلط فیصلہ ہے۔

کیا کیا جائے؟

با اختیار پارلیمانی کمیٹی کا قیام: جنابِ والا! آگے کے لیے اب کیا کرنے کی ضرورت ہے؟ میری نگاہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ایک با اختیار پارلیمانی کمیٹی بنے، بلاشبہ وزیر اعظم اس کے سربراہ ہوں لیکن تمام اہم پارلیمانی پارٹیوں کے قائدین اس میں شامل ہوں۔ مالیاتی کنٹرول اور پالیسی ساز فیصلوں کا یہی ادارہ ہو اور یہ ادارہ بھی پارلیمنٹ کو اعتماد میں لے۔ اہم

امور پر بار بار مباحثہ ہو، بار بار رپورٹس آئیں اور جیسے میں کہہ رہا ہوں ایک تفصیلی رپورٹ ہر تین مہینے کے بعد پارلیمنٹ کے سامنے آئے۔

جامع منصوبہ کی تیاری: جنابِ والا! ایک جامع منصوبہ بندی میں تین سال نہیں، پانچ سال لگیں گے، اس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اداراتی تبدیلی کریں۔ ادارہ بحالیات عارضی نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی تنظیم نو کی جائے۔ یہ تنظیم نو پارلیمنٹ کے ذریعے کی جائے اور اس کے اندر مرکز، صوبوں اور آزاد کشمیر کی پوری پوری شرکت ہو۔

میں اس موقع پر آزاد کشمیر کے وزیر اعظم کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس عظیم سانحہ کے موقع پر ایک جرأتمندانہ کردار کا مظاہرہ کیا اور وہ خود متاثرین کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے ایک ٹینٹ میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے کہا کہ چاہے میری حکومت ختم ہو گئی ہو، میر انظام درہم برہم ہو لیکن میں یہاں آپ کے درمیان ہوں اور میں ہر مشکل میں آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ اسی جذبے کی ہر جگہ ضرورت ہے۔ چنانچہ جنابِ والا! دوسرا اہم کام اداراتی تبدیلی اور ان کی تنظیم نو ہے۔

اداراتی نظام اور تربیت یافتہ عملہ کی تیاری: تیسری چیز یہ ہے کہ بحران کے دوران موسمیاتی انتظام کا ادارہ بنایا جائے اور اس کے پاس تربیت یافتہ عملے اور فنی مہارت کا بھی فوری کارروائی کے لیے انتظام ہو۔ ہیلی کاپٹرز کا ایک بیڑا ہو اور وہ تمام آلات اور مشینری ہو جو ایسے مواقع کے لیے درکار ہیں وہ تمام چیزیں ہر وقت دستیاب اور تیار ہونی چاہییں۔

افراد کار کی تیاری کے ضمن میں ہی ایک اور (چوتھی) چیز جنابِ والا! یہ ہے کہ پرائمری اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک، شہری دفاع، اسکاؤٹس اور ان تمام شعبوں میں تربیت ہو جو ملک کی سخت ضرورتیں ہیں۔ ہمیں گانے بجانے اور اداکاری کی نہیں، ان مہارتوں کی ضرورت ہے جن کے نتیجہ میں ہماری قوم کا ایک ایک جوان اس لائق ہو کہ وہ اپنے زور بازو سے ایسے مشکل حالات کے اندر راستہ نکال سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب قیادت اس کی مثال قائم کرے اور اس کے لیے جو ضروریات ہوں وہ پوری کی جائیں۔

شفافیت اور محاسبہ کا نظام: پانچویں چیز جو نظر آرہی ہے وہ اس کام کی شفافیت اور اس کا محاسبہ ہے۔ ایک تخمینہ جو پچھلے دنوں اخبار میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی قوم نے صرف صدارتی فنڈ ہی میں نہیں بلکہ نجی وسائل سے بھی جو مدد کی ہے، وہ ۲۰، ۲۵ ارب سے زیادہ ہے۔ جو مدد آپ کو باہر سے مل رہی ہے اس کا ۷۶ فیصد مسلمان ممالک یا پاکستانی عوام اور دنیا بھر کے مسلم عوام نے آپ کو دیا ہے یہ آپ کی بہت بڑی سماجی قوت ہے۔ آپ اس کو سنبھالیے۔ جو ۲۴ فیصدی امداد آپ کو دوسروں سے ملی ہے، ہم اس کے بھی معترف ہیں اور جس نے جتنا کام کیا ہے ہم کو اس کا قدردان ہونا چاہیے اور شفافیت اور جہاں ضروری ہے وہاں احتساب کے ذریعہ یقینی بنانا چاہیے کہ اعتماد کا ماحول متاثر نہ ہو۔

ساتھ ہی ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے اور اس کا اظہار خود جنرل مشرف نے بھی کیا کہ یہ ایک نظر آنے والا امتیاز ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہوا کے رخ کو جانیں، زمینی حقائق کو سمجھیں اور اپنی خارجہ اور معاشی پالیسیاں ایسی بنائیں جو ان حقائق کے ادراک پر مبنی ہوں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اپنی آزادی، اپنی عزت، اپنے وسائل ان سب کو ہم داؤ پر نہ لگادیں۔

مالیاتی حکمت عملی: جنابِ والا! اگلی جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ ایک پائیدار اور دوررس مالیاتی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ جو مدد آپ کو مل رہی ہے وہ آہستہ آہستہ کم ہو گی، بڑھے گی نہیں۔ جو کچھ ملا ہے وہ آپ کی ضروریات کا مشکل سے ۱۵ یا ۲۰ فیصدی ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں سادگی ہو، اللّے تللّے اور تعیشات، چھوڑ دیے جائیں، حتّٰی کہ میں کہتا ہوں کہ خود سینیٹ اور اسمبلی اپنا پیٹ کاٹے اور بیرونی سفر، دعوتیں اور ایسے اخراجات جن کو روکا جاسکتا ہے ان کو روکا جائے۔ قائداعظم نے پاکستان بننے کے بعد اپنی پہلی تقریر لاہور میں کی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ان حالات میں، میں قوم کو سادگی کی دعوت دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ آج ہر سطح پر سادگی کی ضرورت ہے تاکہ سب سے پہلے ہم اپنے وسائل کا وہ حصہ نکالیں جو ہم ان علاقوں کی ترقی اور بحالی کے لیے استعمال کرسکتے

ہیں، ہم وہ حصہ ان کو دیں۔ پھر اس کے بعد مسلم دنیا اور دنیا بھر کے پاکستانی ہیں۔ وہ سب بے چین اور مضطرب ہیں انہیں صرف آپ یہ ضمانت دے دیجیے کہ جو پیسہ وہ دے رہے ہیں وہ صحیح استعمال ہو گا، وہ کرپشن کی نذر نہیں ہو گا یا ذاتی ضروریات کے لیے استعمال نہیں ہو گا بلکہ مستحقین میں پہنچے گا۔ یہ ضمانت آپ دے دیں وہ آپ کو اتنا دیں گے کہ آپ کو کسی اور سے مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن خدا کے لیے سمجھ لیجئے کہ اخلاق کا یہ مظاہرہ مالیاتی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے ساتھ ساتھ از بس ضروری ہے۔

متاثرین کو اپنے پاؤں پر کھڑا کیجیے: جنابِ والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک جو حکومتی اسکیمیں سامنے آئی ہیں ان میں مجھے یہ خطرہ نظر آرہا ہے کہ آپ امداد پر توجہ دے رہے ہیں اور توجہ دینی بھی چاہیے، لیکن امداد کی خاطر جو نظام آپ بنا رہے ہیں اگر وہ نظام مستقل ہو جاتا ہے تو یہ بڑا خطرناک ہے۔ خیمہ بستیاں فوری ضرورت ہیں لیکن خیمہ بستیوں میں لوگ لمبے عرصے تک نہیں رہ سکتے۔ جو پاکستان کی تہذیب اور ہماری اقدار کا بھی تقاضہ ہے اور ہمارے سامنے افغان کیمپوں اور فلسطینی کیمپوں کا تجربہ بھی ہے۔ ان تمام کی روشنی میں تعمیر نو کی طرف جلد از جلد بڑھنا چاہیے اور تعمیر نو بھی اس طریقے سے کہ جو متاثرہ افراد ہیں ان کو سہارا دیجیے، ان کو امید دلائی جائے، ان کو سہولتیں فراہم کیجیے اور انہیں اپنے ساتھ شامل کیجیے۔ وہ آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے مل جل کر دیواریں اٹھائیں گے، چھتیں ڈالیں گے اور ان تباہ شدہ علاقوں کو آباد کر دیں گے۔ وہ حکمت عملی بنایئے جن سے پناہ گزین اور خیمہ بستیاں مستقل نہ بنیں بلکہ جلد از جلد ہم بحالی مکمل کر سکیں۔

ان تمام علاقوں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے روزگار کا حصول بھی بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں جو پلان ۱۹ تاریخ کے لیے بنایا گیا ہے اور جو اخبارات میں آیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو اس سے صاف نظر آتا ہے کہ روزگار فراہم کرنے کے لیے رقوم مختص کی گئی ہیں وہ کسی مربوط منصوبہ بندی کی علامت نہیں ہیں۔ منصوبہ مربوط ہونا چاہیے تاکہ ان متاثرین کے گھر بھی بن سکیں اور تعلیمی ادارے بھی بن سکیں، ان کے لیے صحت کا انتظام ہو سکے، اور ہسپتال

کا نظام بن سکے اور ان کے لیے روز گار اور معاشی سرگرمیاں بھی ساتھ ساتھ وجود میں آسکیں۔ دوسری جانب یہ سب کام لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر آپ ان کو حوصلہ اور اختیار دے کر اٹھا دیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک بڑی قوت آپ کو دستیاب ہو گی۔ آپ ان کے لیے صرف سہولت کاری کیجیے بجائے اس کے کہ آپ کہیں کہ فوج جا کر فلاں فلاں کام اور تعمیرات کر دے اور وہ اس میں داخل ہو جائیں۔ یہ طرز عمل ہمارے کلچر، ہماری تاریخ، ہماری روایت اور ہماری ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غیر ملکی این جی اوز کے اپنے ماڈل ہیں جس پر انہوں نے دنیا بھر میں کام کیا ہے لیکن کہیں بھی کوئی دیرپا کامیابی نہیں ہوئی۔ خدا کے لیے ایک ایسا ماڈل بنایئے جو حقیقت سے مطابقت رکھتا ہو اور ہماری ضرورت اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔

اسی ضمن میں اگلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چند بنیادی اور اہم مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کے لیے قومی سطح پر کام کرنا ہو گا۔ اسکولوں کا قیام اور اسپتالوں کا قیام۔ زلزلہ سے آنے والی تباہی میں ہم اپنے بچوں، جوانوں، ڈاکٹروں، اساتذہ کی بڑی تعداد سے محروم ہو گئے ہیں۔ یہ اتنا بڑا خلا ہے کہ جب تک ہم فوری ضرورت کے لیے اور پھر بعد کی ضرورت کے لیے کوئی ہنگامی پروگرام نہیں بناتے یہ پُر نہیں ہو گا۔ پھر یہ کہ یتیم بہت بڑی تعداد میں ہیں، ان کے لیے دونوں قسم کے انتظامات کی ضرورت ہے۔ ایسے ادارے جہاں وہ عزت کے ساتھ کچھ کرنے کے لائق بن سکیں، تعلیم حاصل کر سکیں، کوئی ہنر حاصل کر سکیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ وہ نظام جس کی طرف سینیٹ نے بھی توجہ دلائی ہے ٹھوک بجا کر پوری تحقیق کر کے اچھے فعال اور قابل اعتماد اداروں یا اچھے گھرانوں میں جن کو جذب کیا جا سکتا ہے اسے ہماری ترجیح کا حصہ ہونا چاہیے۔ میں بالکل اس کے حق میں ہوں کہ عمومی طور پر گود لینے کی پالیسی اختیار نہیں کرنی چاہیے لیکن یتیموں کے لیے آپ کو کوئی خاص نظام بنانا پڑے گا۔ اسی طرح دوسرا مسئلہ ہے بیواؤں کا اور تیسرا مسئلہ ان افراد کا ہے جو معذور ہو گئے ہیں۔ میں ابھی ایک رپورٹ پڑھ رہا تھا کہ صرف پنڈی اور اسلام آباد کے ہسپتالوں میں جو آپریشن

ہوئے ہیں ان میں چھ سو افراد ایسے ہیں کہ جن کے جسم کا نچلا حصہ مکمل طور پر بے کار ہو گیا ہے۔ ان سب لوگوں کو آپ کسی طریقے سے اس لائق بنائیں کہ یہ باعزت زندگی گزار سکیں۔ کسی پر بوجھ نہ بنیں اور ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

جنابِ والا! یہ تمام وہ پہلو ہیں جن کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر، مناسب پلاننگ اور سب کو اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد دیانت اور خلوص کے ساتھ وسائل کو استعمال کرنا ہے در حقیقت اگر ہم نے دیانت کے ساتھ وسائل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دس گنا مسائل حل ہوں گے۔ لیکن اگر صوتحال یہ رہی جو ماضی میں رہی ہے تو ہم اس ملک اور عوام کے ساتھ بھی غداری کریں گے اور دنیا میں بھی ہمارا منہ کالا ہو گا اور کوئی ہم پر بھروسہ نہیں کرے گا۔ جنابِ والا! اس بات کی ضرورت ہے کہ اس قومی سانحہ کا قومی انداز میں ہر قسم کے تعصب اور ہر قسم کے مفادات سے بالاتر ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت تک حکوت کا رویہ اس معاملے میں مایوس کن ہے۔ تاہم ابھی وقت گیا نہیں ہے۔ آنکھیں کھولیے، وقت کا جو تقاضا ہے اس کو پورا کیجیے اور تمام مادی، معاشی، طبی، تہذیبی اور تعلیمی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اللہ کو یاد کیجیے، توبہ کیجیے اور اس سے مدد طلب کیجیے۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ انفرادی نہیں بلکہ ایسے حالات میں اجتماعی توبہ کرنی چاہیے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے ہم اس بحران سے نکل سکیں گے۔ (۱۴نومبر ۲۰۰۵ء)

- ۲ -

جنابِ والا! اکتوبر ۲۰۰۵ء میں جو زلزلہ آیا ہے اور جو تباہی اس سے مچی، اس کے بعد ہر طرف سے یہ بات کہی گئی کہ ملک میں کرائسز مینجمنٹ کا ایک مؤثر نظام ضروری ہے۔ زلزلہ کو اب ایک سال مکمل ہونے کو آرہا ہے لیکن ہم نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی۔ یہاں میں آپ کو یاد دلاؤں کہ مغربی ممالک میں تو خیر اس کا بہت مؤثر انتظام ہے لیکن ترکی اور ایران ہمارے دو برادر ممالک ہیں۔ ترکی میں جب چند سال پہلے خوفناک زلزلہ آیا

اس کے بعد سے انہوں نے بحران سے نمٹنے کا ایسا نظام بنایا ہے کہ ہر وقت پوری طرح تیار ہو اور جہاں کہیں کوئی واقعہ ہو وہ بروقت وہاں پہنچ سکیں۔ یہ وہی ٹیم تھی جس نے پاکستان میں آکر غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ بعینہ یہی کام ایران نے کیا۔ آخر ہم میں کیا خرابی ہے کہ یہ ساری مثالیں موجود ہیں لیکن ہم ان سے سیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ بڑے بڑے بروشر ہم بنا لیتے ہیں، اعلیٰ فوجی افسر بلا کر بٹھا دیتے ہیں لیکن زمینی حقائق بدل نہیں سکتے۔ اپنی سوچ اور پالیسی بدلنے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ متاثرہ علاقوں میں بہت سے مسائل ہیں۔ فوری ضرورت یہ ہے کہ ان علاقوں میں ہنگامی حالت نافذ کر کے سول اور فوجی، دونوں وسائل کو بھرپور طور پر امداد کے لیے استعمال کیا جائے۔ فوری امداد سب سے پہلی ضرورت ہے۔ دوسری ضرورت معاوضہ ہے اور تیسرا معاملہ بحالی کا ہے۔ یہ تینوں چیزیں فوری توجہ کی مستحق ہیں اور اس معاملے میں حقیقت یہ ہے کہ ہماری صوبائی حکومتیں یا مقامی حکومتیں کام کرنے کی اہل نہیں ہیں۔ نہ ان کے پاس وسائل ہیں، نہ صلاحیت ہے اور نہ افرادِ کار اور نہ ہی انتظامی ڈھانچہ ہے۔ مرکز کی مدد کے بغیر اور متعدد وسائل کو استعمال کیے بغیر ان کے لیے حالات سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ کراچی میں آپ کو معلوم ہے کہ ایک دن میں ۱۹ افراد ہلاک ہو گئے۔ ان چار، پانچ دنوں میں سرحد میں ۱۴۴ افراد کی موت کی خبر ہے۔ ہزاروں زخمی ہو گئے ہیں۔ بیس پچیس ہزار مکان منہدم ہو چکے ہیں۔ کئی لاکھ افراد بے گھر ہو گئے ہیں۔ یہ قومی سطح پر ایک تباہی ہے[1] اس کے لیے اگر آپ اپنے وسائل استعمال نہیں کریں گے یہ مسائل حل نہ ہوں گے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ ہماری ترجیحات آج بھی درست نہیں ہیں۔

---

[1] یہاں اشارہ ہے ۶ اگست ۲۰۰۶ء میں مانسہرہ، کرک، چارسدہ، بونیر اور صوبہ سرحد کے علاقوں سمیت اسلام آباد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے بعض علاقوں میں طوفانی بارشوں کے سبب سینکڑوں انسانی جانوں کی ہلاکت اور ہزاروں مکانات کی تباہی کے مسئلے پر اس حوالہ سے پروفیسر خورشید احمد نے دیگر سینیٹرز عبدالرحیم مندوخیل، گل نصیب خان اور ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کے ہمراہ سینیٹ میں مشترکہ تحریک التواء پیش کی تا کہ مسئلے پر گفتگو ہو اور مسئلے کی جانب حکومت کو توجہ دلائی جا سکے۔

آپ دیکھیے کہ ایک طرف کراچی کا یہ حال ہے اور دوسری طرف کراچی میں کئی ارب روپے خرچ کر کے ایک ایسا فوارہ بنایا گیا ہے جو جنیوا کے فوارے کا جواب تھا لیکن وہ آج تک نہیں چل سکا۔ پنڈی کا نالہ لئی، ساٹھ سال سے ہر سال اس کا نوحہ ہم سنتے ہیں، اس کے لیے پلان بھی بنتا ہے اور روپیہ بھی دیا جاتا ہے لیکن ہر سال پھر وہی تباہی مچتی ہے بلکہ تباہی کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ آپ کے ہاں کوئی مناسب منصوبہ نہیں ہے۔ سیلاب کے راستے ہیں، نالے ہیں، تعمیرات کے ذریعے سے کچرا ڈال کر، خاص طور پر پلاسٹک کے کچرے کی وجہ سے یہ راستے اور زیادہ بند ہو گئے ہیں۔ اب جو سیلاب آرہے ہیں وہ زیادہ تباہ کن ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے کہ ہم نے نکاسی آب کے قدرتی ذرائع کو بند کر دیا ہے اور اصلاح احوال کے لیے کوئی پلاننگ نہیں کی ہے۔ اس چیز پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جنابِ والا! میں یہ بھی کہوں گا کہ درمیانی اور طویل مدت کے منصوبے بنانا بہت ضروری ہیں۔ اس کا آغاز اسکولوں میں تعلیم سے ہونا چاہیے۔ جس میں شہری دفاع بھی شامل ہے جسے ہنگامی حالت میں استعمال کیا جائے۔

ان کاموں کے لیے ہمارے میڈیا بالخصوص ٹیلی ویژن کو بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ یہ آگہی پیدا کرنے کے لیے اور لوگوں میں احساس پیدا کرنے کے لیے کہ ہم تماشائی نہ بنیں۔ مجھے عبدالرحیم مندوخیل صاحب نے بتایا کہ مردان میں جو پل گرا ہے۔ اس میں مرنے والوں میں بہت زیادہ وہ لوگ وہ تھے جو تماشبین تھے۔ سیلاب آرہا ہے اور وہ کھڑے ہو کر تماشا دیکھ رہے ہیں۔ جنابِ والا! اس پر تعلیم اور تربیت اور آگہی کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد شہری دفاع اور رضاکار تنظیم کا کردار ہے۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے بعد صدر صاحب کے حکم سے ایک قومی رضاکار تنظیم بنی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ بحران اور تباہی کے وقت کہاں پر ہے۔ کیا وہ صرف صدر کا استقبال کرنے اور اخبارات میں خبریں چھپوانے کے لیے ہے۔ جنابِ والا! اس معاملے میں سنجیدہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ایک چیز مانیٹرنگ ہے جو سب سے پہلی ضرورت ہے پھر بحران کا انتظام اور تیسرا وہ جذبہ پیدا کرنا ہے جس کے

ذریعے سے جہاں کہیں بھی ہنگامی حالت پیدا ہو آپ فوری طور پر پہنچ سکیں۔

پچھلے دنوں میں اٹلی گیا ہوا تھا۔ موٹروے کے اوپر ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے دو منٹ کے اندر وہاں ہیلی کاپٹر پہنچ گئے۔ تین منٹ کے اندر فائر بریگیڈ پہنچ گئے اور پھر پولیس بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے دس منٹ میں ہر ضروری اقدام کر لیا۔ ہمارے ہاں حال یہ ہے کہ اگر کراچی کے اندر کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔ تو چھ چھ گھنٹے سڑکیں بند رہی ہیں، لوگ چیخ رہے ہیں لیکن کوئی راستہ نکلنے کا نہیں ہے۔ جنابِ والا! ان تمام چیزوں کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں ہے جس کی ہم پیش بینی نہیں کر سکتے۔ یہ حقائق ہیں۔ صرف اس کے لیے صحیح پلاننگ کی ضرورت ہے۔ ترجیحات درست ہونی چاہییں۔ یہ گالف کلب بنانا، یہ بڑے بڑے پارک بنانا، یہ جی ایچ کیو منتقل کرنا جس کے اوپر اربوں روپے خرچ ہونگے۔ یہ ہماری ترجیحات نہیں ہونی چاہییں۔ وسائل ہمارے پاس ہیں لیکن ہماری ترجیحات درست نہیں ہیں جس کی وجہ سے ہم ان وسائل کو وہاں پر استعمال نہیں کر رہے جہاں مسائل ہیں۔ جہاں پر ضرورت ہے۔ جہاں تباہی ہے۔ جہاں نقصانات ہو رہے ہیں اس کے لیے ترجیحات تبدیل کیے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جنابِ والا! یہ چند معروضات میں پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی یہ بات کہتا ہوں کہ میرے دوسرے ساتھیوں نے جو مشورے دیے ہیں ان کو محض ہوا میں تحلیل نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان تمام کو مرتب کر کے پلاننگ کمیشن، نیشنل کرائسز کمیشن اور ERRA جو آپ نے بنایا ہے، وہ محض کاغذی کارروائی نہیں بلکہ عملی اقدام کرے۔ فوری امداد اور فوری مدد کے بعد آئندہ کے لیے مناسب اقدام اور پیش بندی یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ (۸ اگست ۲۰۰۶ء)

- ۳ -

سیلاب اور بارشوں سے تباہی (۲۰۰۷ء)

جنابِ چیئرمین! بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے ملک میں آنے والے حالیہ سیلاب کے مسئلے پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا یہ ایک قدرتی آفت ہے اور بلاشبہ آفات سماوی و ارضی سے اس کا تعلق ہے۔ جنابِ والا! سیلاب کا آغاز ہوئے تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک کا ایک خاصا حصہ، خصوصیت سے بلوچستان، سندھ اور صوبہ سرحد، طوفان بادوباراں اور سیلاب کی لپیٹ میں ہیں۔

جنابِ چیئرمین! سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ تباہی کی شدت کا صحیح صحیح اندازہ کیا جائے۔ میرے علم کی حد تک، ابھی تک متعلقہ حکام کی طرف سے مستند، قابلِ اعتماد اور حقائق پر مبنی اعداد و شمار نہیں آئے۔ البتہ اخبارات میں جو باتیں آرہی ہیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان دو مہینوں میں تین سو چوبیس افراد جاں بحق ہوئے ہیں۔ اور دو سو چوبیس لاپتہ ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تقریباً ساڑھے پانچ سو افراد اپنی جان سے محروم ہو چکے ہیں۔ تقریباً ۸۰ ہزار مکانات، جن میں زیادہ بلوچستان میں ہیں، تباہ ہوئے ہیں۔ بیشتر کلی طور پر لیکن باقی بھی اتنے تباہ ہوئے ہیں کہ وہ اب رہنے کے قابل نہیں رہے اور کم از کم دو یونین کونسلیں تو ایسی ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک گھر بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں تقریباً ۲۵ لاکھ افراد بے گھر ہوئے ہیں اور اسی اندازے کے مطابق تقریباً ۸۰ ہزار افراد ایسے ہیں جو ابھی تک یا پانی میں پھنسے ہوئے ہیں یا چھت اور خیمے تک سے محروم ہیں۔

جنابِ والا! اس کے ساتھ ساتھ سڑکوں کا جو نقصان ہوا ہے اس کا اندازہ یہ ہے کہ صرف بلوچستان میں ۱۷۱۵ کلو میٹر سڑکیں قابلِ استعمال نہیں رہیں اور ان میں کوسٹل ہائی وے بھی شامل ہے۔ صوبے کی جو چاروں بندرگاہیں ہیں، پسنی، جیوانی، اورماڑہ اور گوادر، چاروں بری طرح متاثر ہوئی ہیں اور پندرہ کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے۔ جو جائزے

اخبارات میں آئے ہیں اور بین الاقوامی میڈیا نے دیے ہیں، ان کی رو سے بلوچستان میں ۱۲۳۰۰ سے زیادہ ہیکٹرز اور سندھ میں ساٹھ ہزار ہیکٹرز زمین پر کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں۔ بلوچستان میں ۲۰ فیصدی اور سندھ میں ۱۰ فیصدی تعلیمی ادارے تباہ ہوئے ہیں۔ یہ اس مسئلہ کی شدت ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پارلیمنٹ میں دو مہینے کے بعد اس پر اب بات چیت ہو رہی ہے۔

جنابِ والا! یہ ایک قومی آفت ہے، تین صوبے بری طرح متاثر ہیں، میری نگاہ میں یہ جتنی بڑی آزمائش ہے اس کے مقابلے میں کوئی پالیسی، کوئی اسکیم، کوئی لائحہ عمل ہمارے سامنے نہیں آرہا ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ مرکزی حکومت، صوبائی حکومت اور مقامی حکومتیں بھی کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہیں۔ فوج کے جوانوں نے بھی خدمات انجام دی ہیں اور نجی شعبے میں خدمت کے جو ادارے ہیں انہوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کچھ بین الاقوامی این جی اوز نے بھی کردار ادا کیا ہے لیکن اس سب کے باوجود جو اطلاعات مجھ تک پہنچ رہی ہیں اور جس حد تک میں عالمی ذرائع ابلاغ پرسن سکا ہوں اندازہ یہ ہے کہ نصف سے زیادہ افراد ابھی تک امداد سے محروم ہیں۔ جنابِ والا! یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔ ہم الزام تراشی میں نہیں جانا چاہتے، میں نے آغاز اس بات سے کیا ہے کہ یہ ایک قومی المیہ ہے، قومی مسئلہ ہے اور حکومت اور حزب اختلاف اور سرکاری و نجی بنچوں، سب کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ اس لیے میں چند تجاویز پر اپنی بات کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

فوری توجہ طلب مسائل: میری نگاہ میں تین پہلو ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ جو افراد متاثر ہوئے ہیں ان تک امداد پہنچائی جائے۔ ہم نے اس سے پہلے زلزلے کے موقع پر یہ بات اسی ایوان میں اٹھائی تھی کہ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ نیشنل کرائسز سیل موجود تھا لیکن اس کے پاس کوئی مہارت، صلاحیت، افرادی قوت اور موزوں نظام نہیں تھا۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کے بعد اسی ایوان نے قانون پاس کیا جس کے تحت ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی اس

کام کے لیے قائم کی گئی کہ وہ صلاحیت حاصل کرے، ایک ڈھانچہ بنائے، ایک رضاکار فورس تیار کرے کہ وہ جب اور جہاں ضرورت ہو کام آئے۔

میں یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا جنابِ والا! کہ ہم نے یہ قانون اس لیے پاس کیا تھا کہ ایک مستقل انتظام ہو اس لیے کہ ان آسمانی آفات کے بارے میں کسی کو پتا نہیں ہوتا کہ کب آئیں گی۔ اسی لیے دنیا کے سارے ممالک اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ڈھانچہ موجود رہے اور جہاں، جس وقت کوئی بڑا حادثہ ہو، کوئی اس قسم کی تباہی آئے تو فوراً مدد کے لیے پہنچا جاسکے لیکن ہم نے دیکھا کہ ۲۰۰۵ء کے زلزلہ کو دو سال گزرنے کے باوجود ہم وہ ڈھانچہ نہیں بنا سکے۔ بلکہ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے متاثرین بھی ابھی تک رو رہے ہیں۔ کہیں ۵۰ فیصد، کہیں ۶۰ فیصد، کہیں ۷۰ فیصد کام ہوا ہے اور باقی سب رُکا ہوا ہے۔ حالانکہ مقصد تو یہ تھا کہ نہ صرف وہ فوری درپیش کام کریں گے بلکہ مستقبل میں اگر کوئی آفات آتی ہیں تو ان کے لیے پہلے سے تیاری ہوگی۔ اس طرف جو ناکامی ہوئی اس کا اعتراف ہونا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کس طرح ہم اس ادارے کو فی الحقیقت مؤثر بنائیں۔

جنابِ والا! آپ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجیے کہ زلزلے کے موقع پر بڑے دھوم دھام کے ساتھ ایک قومی رضاکار فورس کا اعلان ہوا تھا اور اس کے لیے بڑی رقوم مختص ہوئی تھیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ رضاکار فورس کہاں گئی۔ اتنی بڑی تباہی آئی ہے لیکن وہ فورس کہیں نظر نہ آئی، وہ فورس کس جگہ ہے؟ جنابِ والا! میں درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں جھوٹے دعوے اور اس قسم کے تماشے نہیں کرنا چاہییں۔ ہمیں ان سے نکلنا چاہیے۔ متاثرین کی امداد کے لیے مرکزی حکومت، صوبائی حکومتیں، مقامی حکومتیں اور یونین کونسل پر مبنی چار تہہ والا نظام متحرک کیجیے اور ہر سطح پر رقوم مختص کیجیے۔ ہم اپنی عیاشیاں ختم کریں اور اخلاص کا راستہ اختیار کریں۔ کرپشن کے سوراخ سے ہمارے جو وسائل ضائع ہو رہے ہیں انہیں بچا کر اس طرف استعمال کیجیے۔ افسوسناک بات ہے کہ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل ہر سال جو جائزہ لاتی ہے اس میں ہماری پوزیشن اور نیچے گر جاتی ہے۔ اسی ہفتے دولت مشترکہ کے سیکرٹری جنرل نے جنوبی ایشیا

کے بارے میں جو رپورٹ دی ہے، اس میں کہا ہے کہ سب سے زیادہ کرپشن پاکستان میں ہے۔

جنابِ والا! وسائل کو ٹھیک سے استعمال کیجیے اور اس کام کے لیے مہیا کیجیے۔ مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اتنے بڑے سانحہ کے بعد جنرل مشرف صاحب جب بلوچستان گئے تو انہوں نے ایک متاثرہ خاندان کے لیے ۱۵ ہزار روپے کا اعلان کیا۔ یہ مدد نہیں بلکہ زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے۔ آپ کا اپنا کوئی مرتا ہے تو آپ اس کو پانچ لاکھ اور دس لاکھ دیتے ہیں اور اگر غریب انسان بے گھر ہو جاتے ہیں، خاندان روٹی کمانے والے سے محروم ہو جاتا ہے تو آپ پورے خاندان کو ۱۵ ہزار دیتے ہیں اور وہ بھی پتا نہیں کتنوں کو ملا ہو گا۔ اس پالیسی کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ پھر امداد پر بات رکنی نہیں چاہیے۔ بات تو بحالی تک جائے گی اور جانی چاہیے۔ مجھے پتا ہے کہ اس کے لیے کتنے وسائل کی ضرورت ہے لیکن جب تک ہم اپنے پیٹ پر پتھر نہیں باندھیں گے ہم اپنے مجبور بھائیوں اور بہنوں کی مدد نہیں کر سکیں گے۔

جنابِ والا! اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ متاثرہ علاقوں کے لیے کوئی فوری پیکیج ہونا چاہیے۔ اس طرح کے پیکج میں ان کو آفت زدہ علاقہ قرار دینا، ٹیکسوں کا معاف کرنا، مالیے معاف کرنا، بنکوں کے قرضوں کی جو قسط واجب الادا ہے، چاہے وہ نجی بینک ہوں یا سرکاری بینک ہوں اس میں رعایت شامل ہونا ضروری ہیں۔ اسی طرح بجلی، گیس میں رعایت یعنی جو بنیادی ضرورتیں ہیں ان میں ان کو امداد دینے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا پیکیج بھی لازماً آنا چاہیے۔

جنابِ والا! یہ وہ موقع ہے جب ہمارے پلاننگ کمیشن والے، ۲۰۳۰ء کے وژن کی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے لیکن خدا کے لیے ۲۰۰۷ء کی تو فکر کیجیے۔ یہ دیکھیے کہ جو چیزیں بار بار آ رہی ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیم بنانے کی پالیسی کو پچاس سال سے آپ نے سیاست کا کھلونا بنایا ہوا ہے۔ والی بال بنایا ہوا ہے ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر پھینک رہے ہیں۔ بڑے ڈیم، چھوٹے ڈیم ابھی نیلم ڈیم کی بات ہو رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پندرہ سال پہلے اس کا منصوبہ بنا تھا۔ سات سال پہلے اس کا PC-1 بنا تھا۔ ہندوستان نے اسی دوران میں بگلھیار ڈیم بنا لیا اور ہم ابھی تک کاغذوں میں پھر رہے ہیں۔

کالا باغ ڈیم ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ کیا اس کا کوئی اور متبادل نہیں ہے۔ دوسرے جتنے متبادل ہیں، خود سینیٹ کی کمیٹی نے اس کی چھان پھٹک کی ہے اور اب اسے تیسرا سال ہو گیا اس پر کیا ہوا؟ چھوٹے ڈیم ہمارے لیے بہت بڑے متبادل ہیں۔ سرحد میں بیس پراجیکٹ شروع کیے گئے ہیں اس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اتنی ممکنہ استعداد موجود ہے۔ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، چین نے چھوٹے ڈیموں کا نیٹ ورک بنا کر ہزاروں میگا واٹ بجلی پیدا کی ہے۔ ہمارے ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہو گا کہ سیلاب پر کنٹرول پایا جاسکے گا، بارش کا پانی محفوظ ہو سکے گا اور ضیاع کو روکا جاسکے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ تربیلا اور منگلا کے متاثرین آج تک رو رہے ہیں کہ انہیں معاوضہ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جو متبادل موجود ہیں ان پر آگے بڑھیے۔

اسی طرح آپ دیکھیے کہ ہر شہر میں، ہر علاقے میں سیوریج کا سسٹم، صاف پانی کی فراہمی جیسی بنیادی چیزیں اور بنیادی ضروریات، ہم فراہم نہیں کر رہے ہیں۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ کراچی جیسے شہر میں لوگ بدبودار پانی پی رہے ہیں۔ ہر روز ہزاروں افراد گیسٹرو کی بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ہم نے ان تمام بنیادی معاملات کے بارے میں کوتاہی برتی ہے جو ادارتی ڈھانچے کی ترقی ہے اور سماجی و اقتصادی ڈھانچے اور بنیادی ضروریات سے متعلق ہیں۔ میرانی ڈیم کا بار بار مسئلہ آرہا ہے۔ کوئی ڈیم کا مخالف نہیں ہے۔ لیکن جنابِ والا! ڈیم بنانے میں بھی آپ کی منصوبہ بندی میں کمزوریاں سامنے آئی ہیں۔ اسپل وے کی بات سب کے سامنے ہے۔ تین سو فٹ، چھ سو فٹ اور اب کہا جارہا ہے کہ اس کو بارہ سو فٹ کیے بغیر علاقے کے لوگوں کا تحفظ ممکن نہیں ہے یہ ساری باتیں پہلے سے کہی جارہی تھیں لیکن آپ نے کچھ سیاسی مقاصد کے لیے ان تمام چیزوں کو دیکھے بغیر اور لوکل آبادی کے جو اعتراضات تھے ان کو دیکھے بغیر یہ کام کیا۔ خدا کے لیے یہ نہ کیجیے۔ سرکاری عمارتیں، سرکاری سکول، سرکاری سڑکیں پانی کے ریلے میں بہہ جاتی ہیں آخر ان کا کون ذمہ دار ہے۔ کوئی تو احتساب ہونا چاہیے، کیا احتساب یہ ہے کہ سیاسی مخالفین کے لیے آپ اس تلوار کو استعمال کریں اور جو لوگ اس ملک کو تباہ کر رہے ہیں وہ آزاد پھریں۔

جنابِ والا! میری نگاہ میں یہ تین کام ہیں، پہلا فوری ہے یعنی امداد اور بحالی دوسرا اوہ پیکیج ہے جو متاثرین کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر سکیں، تیسرے وہ بنیادی تبدیلیاں ہیں، یعنی بنیادی ادارتی ڈھانچے کی تعمیر کی کوششیں، جس کے بغیر آپ مستقلاً اس قسم کے خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

آخری سب سے اہم بات احساس اور احتساب ہے۔ اسلام آباد کے ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں اور دفاتر میں بیٹھنے والوں کو اندازہ نہیں ہے کہ عام انسان کس مشکل میں پس رہا ہے۔ ان ایوانوں سے نکلیے، عوام کے مسائل کو دیکھیے، ان میں اٹھیے بیٹھیے اور پوری پلاننگ کر کے اخراجات کا رخ اپنی آسائشوں کی بجائے قوم کے عام انسانوں کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کی جانب موڑ دیجیے۔ پاکستان اس طرح ہی اپنے اصل مقصد سے ہمکنار ہو سکے گا۔

(۲۰اگست ۲۰۰۷ء)

- ۴ -

کوئٹہ میں زلزلہ (۲۰۰۸ء)

جناب چیئر مین! حقیقت یہ ہے کہ یہ ہم سب کے لیے بڑا ہی اندوہناک لمحہ ہے، ۲۰۰۵ء کے زلزلے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ابھی تک اس کے اثرات موجود ہیں اور ان نقصانات کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ آج کوئٹہ میں یہ سانحہ پیش آیا ہے، بلاشبہ ایسے واقعات اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہات ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا چاہیے اور اپنی خطاؤں اور غلطیوں سے توبہ کرنی چاہیے۔

جناب چیئر مین! اس کے ساتھ ساتھ دو کام بہت ضروری ہیں۔ پہلا فوری امداد کا کام ہے، اب تک کی اطلاعات اطمینان بخش نہیں ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ قائد ایوان نے جو بات کہی ہے اس کے بارے میں، میں کسی تحفظ کا اظہار کروں، لازماً حکومت اس معاملے میں چوکنا ہو گی اور اسے ہونا بھی چاہیے لیکن ایوان میں آنے سے چند منٹ پہلے تک جو معلومات ہم تک

پہنچی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اہم ترین مسئلہ درپیش ہے اس کی مناسبت سے مناسب اور مؤثر انتظامات ابھی تک نہیں ہوئے ہیں۔ اس لیے اس معاملے میں سرکاری رپورٹوں پر انحصار نہ کریں، کوشش کریں کہ قومی سطح پر اور ہنگامی بنیادوں پر سول انتظامیہ، فوج اور دیگر تمام دستیاب ذرائع سے لوگوں کو مدد پہنچانے کا انتظام کریں۔ جو لوگ ابھی تک ملبے میں دبے ہوئے ہیں انہیں نکالنے اور جو بے گھر ہوئے ہیں ان کے خیموں میں خوراک اور علاج کا انتظام اور جو سہولت وہاں میسر نہیں ہے اس کا مؤثر انتظام ہو۔ اس کے لیے ہیلی کاپٹر اور جہازوں کے ذریعے سے متاثرہ افراد کو ان مقامات پر پہنچانا چاہیے جہاں ان کی دیکھ بھال ہو سکے۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور میں دوبارہ کہوں گا کہ اس میں سرکاری رپورٹوں پر انحصار نہ کریں بلکہ میڈیا جو باتیں کہہ رہا ہے اور انفرادی اطلاعات جو آرہی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کو، اپنی کوشش کو، ہمہ جہتی بنانا پڑے گا۔

ساتھ ہی بحالی کے کام کو مؤخر نہ کیجیے۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلہ متاثرین کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے ان کی بحالی کا کام آج تک ہو رہا ہے۔ اس لیے امداد اور بحالی دونوں کو ساتھ ساتھ جانا چاہیے اور میں پوری تائید کرتا ہوں اس بات کی کہ چیئر مین سینیٹ کا فنڈ فوراً قائم ہونا چاہیے۔ ایک مہینے کی تنخواہ کم از کم عطیہ کی جائے، لوگ زیادہ سے زیادہ تعاون کریں اور دوسروں سے بھی اپیل کریں کہ وہ اس میں مددگار بنیں۔ دوسرے جناب چیئر مین! آپ نے ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے موقع پر سینیٹ کی امدادی سرگرمی کو منظم کیا تھا۔ آپ نے اپنے تمام دوستوں سے کہا تھا کہ مدد کرواور پھر آپ نے یہاں سے اس کو بھیجنے کا انتظام کیا اور یہ بھی ہوا کہ ہماری ٹیم نے جا کر کے خود دیکھا کہ وہ کہاں کہاں تک صحیح تقسیم ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سارا کام آپ کو ایمر جنسی کی بنیادوں پر اب بھی کرنا چاہیے۔ یہ ہم پر تقاضا ہے اور ہمارا فرض ہے۔

جناب چیئر مین! ۲۰۰۵ء کے زلزلے نے ہماری آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس وقت یہ طے ہوا تھا کہ مرکز میں ہی نہیں بلکہ صوبوں میں اور اس سے بھی نچلی سطح پر بحران سے نمٹنے

کا انتظام کیا جائے گا رضاکار فورس تیار کی جائے گی۔ بڑے طمطراق سے رضاکار فورس کے لیے کروڑوں کے خرچ کا اعلان ہوا تھا، پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ در حقیقت اس طریقے کے اعلان ہمارے زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ قومی ایشو ہے اور کسی بھی آفت کے آنے کا انتظار نہیں ہونا چاہیے بلکہ آفات کے آنے سے پہلے تیاری ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں جو افراد بھی ذمہ دار ہیں کہ جو فیصلے اس وقت ہوئے تھے ان پر عمل نہیں کیا ان کی باز پرس ہونی چاہیے۔ محاسبے کا کوئی نہ کوئی ایسا نظام ہو کہ بحران میں انتظامات کا اہتمام ہو۔ عوام کی تربیت بھی اس میں شامل ہے اور جو ادارے ہیں ان کے پاس فورس کو تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ (۲۹ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- ۵ -

سیلاب سے تباہی (۲۰۱۰ء)

جناب چیئر مین! سیلاب اجتماعی اور جغرافیائی زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن پچھلے چھ ہفتوں سے جن سیلابوں کی زد میں ہمارا ملک رہا ہے، وہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے۔ غالباً پچھلے تین سو سال میں اس نوعیت کا شدید سیلاب نہیں آیا ہے اور جو تباہی اس سے ہوئی ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ تقریباً ۲۰ فیصد رقبہ سیلاب زدہ ہے اور بالواسطہ پورا ملک اس سے متاثر ہے۔ کم و بیش دو کروڑ افراد اس سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے ہیں۔ اموات کا صحیح اندازہ ابھی نہیں آیا لیکن جو تازہ ترین اطلاعات ہیں، ان کے مطابق تعداد ۱۸۰۰ سے متجاوز ہو چکی ہے۔ جو اقتصادی نقصان ملک کو ہوا ہے، چھ ہفتے گزرنے کے باوجود بھی ہم اس کا تخمینہ نہیں لگا سکے۔ اس لیے جناب چیئر مین! میں چاہوں گا کہ چند اہم نکات آپ کے توسط سے اس ایوان کے ذریعے حکومت کے سامنے پیش کروں۔

جناب چیئر مین! میں عرض کر رہا تھا کہ سیلاب اور اس کے نتیجے میں آنے والی تباہی، یہ غیر معمولی واقعہ ہے۔ بلاشبہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس قومی سانحے میں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے پوشیدہ تنبیہ ہمارے سامنے رہنی چاہیے۔ وقت چونکہ بہت محدود ہے اس لیے اس پہلو کے اعتراف کے ساتھ میں آپ کے سامنے صرف موٹے موٹے نکات میں وہ باتیں کہنا چاہتا ہوں جن پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

ہنگامی صورتِ حال کے لیے مستقل نظام: پہلی چیز یہ ہے کہ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے انتظامات محض ایک وقتی ضرورت کی چیز نہیں ہے، یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ کبھی زلزلہ آسکتا ہے اور کبھی سیلاب آسکتا ہے، کبھی تباہی کسی اور شکل میں آسکتی ہے اسی لیے ہر قوم اور ملک کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس نوعیت کی ہنگامی حالت میں انتظام کا مستقل نظام ہو۔ جب ۲۰۰۵ء میں زلزلہ آیا اس کے بعد اس ایوان نے خصوصی طور پر اور کھل کر یہ بات کہی کہ ہمارے ہاں جو نظام ہے وہ ناکافی ہے بلکہ عملاً مفقود ہے۔ اس کے لیے مستقل انتظام کیا جائے، ہم نے قدرتی آفات کے بحران سے نمٹنے کے لیے ایک قانون بھی منظور کیا تھا لیکن ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج پانچ سال بعد آنے والے اس سیلاب کے لیے بھی ہم تیار نہیں تھے۔

سیلاب کی مانیٹرنگ کا نظام: جنابِ والا! دوسری بات یہ کہ سیلاب کی مانیٹرنگ اب ایک ترقی یافتہ، سائنس ہے۔ بلاشبہ اس میں اندازے کا تھوڑا بہت فرق ہو جاتا ہے لیکن ہمارا معاملہ عجیب و غریب ہے۔ جیسا کہ سرکاری طور پر کہا گیا، محکمہ موسمیات والوں نے اور آرمی کے لوگوں نے بھی کہا کہ ہمارا جتنا اندازہ تھا، اس سے سو گنا زیادہ شدت اور نقصان ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے پاس مسلسل نگرانی اور اتار چڑھاؤ کے اندازے کرنے کا اعلیٰ انتظام نہیں ہے۔ دس فیصد، ۲۰ فیصد یا ۵۰ فیصد کا فرق ہو سکتا ہے لیکن سو گنا کا فرق ناقابل یقین ہے۔ اس لیے جس چیز پر فوری توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ ہمارے پاس نگرانی کا جو نظام ہے وہ کیا ہے؟ اس میں کہاں خرابی ہے؟ اور اس کو کیسے ٹھیک کیا جائے؟

فوری ردِ عمل کی صلاحیت: جنابِ والا! تیسری چیز کا تعلق فوری رد عمل اور اس کی صلاحیت سے ہے۔ یہ کہہ دینا کہ یہ ہمارے اختیارات سے اور ہمارے وسائل سے زیادہ تھا آسان ہے۔

لیکن میرے خیال میں اس میں ملک کے لوگوں کی بھی مجموعی رائے اور بیرونی اداروں اور عالمی ذرائع ابلاغ کا بھی یہی تاثر ہے کہ حکومت کا ردعمل بہت سست، غیر مؤثر، حتّٰی کہ جھوٹ پر مبنی تھا۔ ایسے ایک نہیں متعدد واقعات سامنے آئے ہیں کہ جن میں جعلی انتظامات کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ ہم امداد کا کام کر رہے ہیں، یہ صریحاً دھوکے بازی ہے۔ مجھے یہ بات بھی یاد کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ جس وقت ملک کا بڑا حصہ سیلاب کی طغیانیوں میں آچکا تھا، صدر مملکت فرانس اور انگلینڈ کے دورے پر تھے۔ ایک واضح احساس یہ ہوتا ہے کہ ہم نے ان تمام چیزوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا، حالانکہ ایسے مواقع پر ہر کام چھوڑ کر ساری توجہ اس پر مبذول ہونی چاہیے۔

وسائل متحرک کرنے میں ناکامی: جنابِ والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ناکام رہی۔ خواہ مرکزی ہو یا صوبائی، جتنا کچھ کام انہوں نے کیا ہے میں ان میں سے نہیں ہوں جو اس کا اعتراف نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ حکومت کے اختیار میں تھا، جس طریقے سے وہ فوری وسائل متحرک کر سکتی تھی، وہ کام نہیں کیا گیا اور آج چھ ہفتوں کے بعد بھی صاف نظر آرہا ہے کہ اس پورے معاملے میں حکومت کی گرفت نہیں ہے۔ سندھ کے سلسلے میں، میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ سندھ سب سے آخر میں اس سیلاب کی زد میں آیا۔ جس وقت صوبہ خیبر پختونخوا اور پنجاب کے جنوبی علاقے سیلاب کی زد میں تھے، صاف نظر آرہا تھا کہ اب اسے سندھ میں آنا ہے لیکن سندھ کے وزیر اعلیٰ صاحب جو بیان دے رہے تھے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قطعاً یہ احساس ہی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کی بہت بڑی ذمہ داری تھی، وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی ہے اور اس پہلو سے اس کا اعتراف ہونا چاہیے۔

بااثر طبقات کا کردار: جنابِ والا! چوتھی چیز میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سیلاب کے موقع پر جس طرح سیاسی قوتوں نے، خصوصیت سے با اختیار افراد نے کردار ادا کیا خواہ ان کا تعلق شہری علاقے سے ہو یا وہ زمیندار یا جاگیر دار ہوں وہ افسوسناک ہے۔ مجھے اس شعبے کا اتنا علم

نہیں ہے لیکن جو چیزیں اخبارات میں آئی ہیں اگر وہ صحیح ہیں اور ان کے ذرائع بالعموم ماہرین ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ جس طرح سیلابی ریلے کے اخراج کے راستے بنانے کا معاملہ ہوا اور اس کے نتیجے کے طور پر جو تباہی آئی، اگر اس معاملے میں صحیح تیاری ہوتی اور سیاسی مخالفت کے لیے نہیں بلکہ خاص فنی اعتبار سے یہ کام کیا جاتا تو اس بات کا پورا امکان تھا کہ جو تباہی مچی، کم از کم ۸۰ فیصد تک اس کو بچایا جا سکتا تھا۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں، جیسے دریائے سندھ کا دایاں اور بایاں پشتہ ہے، یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ سیلاب کو کس پشتے سے نکالا جائے تو کم سے کم تباہی ہو۔ دوسرا تکنیکی مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دریا اپنا راستہ بدلتا ہے تو وہ کتنی جلدی دوبارہ اپنے علاقے میں آجائے تاکہ جو پھیلاؤ کا علاقہ ہے وہ زیادہ نہ ہو۔ ان دونوں اعتبار سے فیصلوں میں بدانتظامی بھی تھی لیکن اس میں یہ بھی صاف نظر آرہا ہے کہ سیاسی قوتوں اور بااثر افراد نے اپنی زمینوں کو بچانے کے لیے غریب انسانوں کی آبادیوں اور دیہات کے دیہات تباہ کر دیے۔ اس میں انفرادی مفادات کا دخل کم یا زیادہ ہو سکتا ہے لیکن یہ تو واضح ہے کہ صحیح معروضی حقائق کی روشنی میں یہ کام نہیں کیا گیا۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک غیر جانبدار کمیشن بنایا جائے جو ماہرین پر مشتمل ہو، پورا جائزہ لیا جائے اور جو بھی افراد ذمہ دار ہوں خواہ ان کا تعلق وزیروں سے ہو، ارکان پارلیمنٹ سے ہوں، افسر شاہی سے ہو یا وہ مقامی افراد ہوں، انہیں متعین کیا جائے کہ کہاں کہاں کیا کچھ کیا گیا ہے اور جو نقصانات اس بدانتظامی یا مداخلت کی بناء پر ہوئے، ان کی تلافی کا اور ان کے احتساب، سرزنش اور ان کی سزا کا کوئی نہ کوئی اہتمام کیا جائے۔

منصوبہ بندی کمیشن کی کارکردگی: جناب چیئرمین! چوتھا نکتہ جس پر مجھے بہت دکھ ہے منصوبہ بندی کمیشن کی کارکردگی سے متعلق ہے۔ ان کی یہ اولین ذمہ داری تھی کہ سیلاب کے آنے کے بعد فوری طور پر نقصانات کا معروضی اندازہ کرتے۔ ان کے پاس ہر شعبے کے ماہرین موجود ہیں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے لیکن سات ہفتے ہونے کو آرہے ہیں اور ابھی تک نقصانات کا صحیح اندازہ ہمارے سامنے نہیں آرہا ہے حتّٰی کہ وزیر اعظم صاحب بھی تفصیلات

جانے بغیر اور بے جانے بوجھے بیانات دے رہے ہیں۔ دوسری جانب یہ فاش غلطی بھی کی گئی کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بنا پر جو ۴۳ ارب ڈالر کا نقصان ہوا تھا اس کو انہوں نے سیلاب کے نام پر پیش کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت غیر ذمہ داری کی بات ہے۔

کرپشن کے شرمناک واقعات: پھر آپ دیکھیں کہ اس نازک موقع پر بھی کرپشن کی بدترین مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ اس میں حکومت بھی ہے اور دوسرے ادارے بھی شامل ہیں۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں ہمارے عوام کی بھی کچھ تعداد شامل ہے۔ دوسری جانب پیشہ ور مجرم بھی ہیں اور ملک کی انتظامی مشینری، اور امن و امان سے متعلق مشینری بھی اپنا فرض ادا نہیں کر سکتی ہے۔ کرپشن کی وجہ سے حکومت پر اعتماد کم سے کم سطح پر ہے۔ ہمیں دکھ بھی ہوتا ہے اور ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں کہ جب غیر ملکی عطیہ دہندگان، بین الاقوامی این جی اوز اور حتّٰی کے ملک کے لوگ بھی صاف کہتے ہیں کہ اس اعتماد کی کمی کی بناء پر جو مدد وہ دینا چاہتے ہیں وہ نہیں دے رہے کہ نہ جانے وہ کہاں خرچ ہوگی۔ اس سلسلے میں بڑی اچھی تجویز دی گئی تھی کہ فوری ایک غیر جانبدار نگراں ادارہ قائم کیا جائے جو ان تمام چیزوں کی نگرانی کرے لیکن اس تجویز کو اولاً منظور کرنے کے باوجود منتشر کر دیا گیا اور اس طرح ایک شفاف نظام جو بن سکتا تھا ساقط ہوگیا۔ جنابِ والا! یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ایسی آزمائش کے وقت جب آبادی کا پانچواں حصہ گھر بار، مسکن اور لباس، حتّٰی کہ خوراک سے محروم ہو رہا ہے، ہماری آنکھیں ابھی بھی نہیں کھل رہیں۔

روشنی کی کرن: بلاشبہ مجموعی صورت میں روشنی کی کرن بھی ہے کہ اس امتحان کے موقع پر بھی عوام اور خدمت کے اداروں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ فوج نے تعاون کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر اس کا تصور بہتر ہوا ہے۔ یہ فوج ہماری فوج ہے اور شہری بحران میں اس کا کردار ایک معروف چیز ہے لیکن یہ سوالیہ نشان ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سول انتظامیہ کے جتنے بھی ادارے ہیں وہ سب ناکام ہیں، غیر مؤثر اور بے صلاحیت ہیں یا بدعنوان ہیں۔ اس کی موجودگی میں آپ نظام کو، دستور کو اور اداروں کو کیسے سنبھالیں گے اور قدرتی تباہی کے نتیجے میں

جو عدم توازن پیدا ہوتا ہے اس سے ہم کیسے نکلیں گے۔ میں ان تمام ملکی خدمتی اداروں کی تعریف کرتا ہوں جنہوں نے اس وقت بڑھ کر لوگوں کی خدمت کی ہے، اپنی جان پر کھیل کر اوروں کو بچایا ہے۔ اسی طرح ان تمام بیرونی اداروں بشمول حکومتوں کے ہم ممنون ہیں جنہوں نے مشکل کے وقت ہمارا ساتھ دیا ہے لیکن اصل ذمہ داری ہماری ہے۔

خود احتسابی کی ضرورت: جنابِ والا! مجھے اجازت دیں کہ میں یہ بات کہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں جو ابتلا اور آزمائش اور تباہی آئی تھی اس وقت مغربی پاکستان کی آبادی پونے چار کروڑ تھی اور اس مغربی پاکستان میں اسی لاکھ سے سوا کروڑ تک افراد چھ سات مہینے کے اندر اندر مہاجر بن کر آئے۔ دوسرے الفاظ میں ملک کی مجموعی آبادی کے تناسب سے تقریباً پچیس فیصد مزید لوگ آئے اور آنے والا ہر شخص متاثر تھا۔ لیکن کسی بیرونی امداد کے بغیر ان سب کا خیر مقدم کیا گیا، کوئی موت فاقے سے واقع نہیں ہوئی اور نہ کسی خودکشی کی نوبت آئی۔ ایک قومی جذبے کے ساتھ ہر شخص نے مل کر اس بحران کا سامنا کیا۔ آج صورت کیا ہے؟ خرابی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد کو بھول گئے ہیں۔ وہ نظریہ اور مقصد موجود نہیں ہے اور نہ ہی وہ قیادت موجود ہے۔ جو ڈھانچے بنائے گئے ہیں وہ ناکافی ہیں۔ یہ پہلو ہمیں اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ بلاشبہ یہ بہت بڑا طوفان ہے اور بہت بڑی آزمائش ہے لیکن اس سے بڑی آزمائش سے چند سال پہلے ہم گزر چکے ہیں لیکن اس وقت جو ہماری کارکردگی تھی اس کا آج کی کارکردگی سے مقابلہ کیجیے تو دور دور تک ان میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ جنابِ والا! یہ خود احتسابی کا وقت ہے۔

ساتھ ہی میں یہ بھی آپ کو کہنا چاہتا ہوں کہ خاص طور سے دریاؤں، نہروں کی دیکھ بھال، پل، سڑکوں کی تعمیر جیسے تمام امور میں غیر معمولی احتیاط اور فرض شناسی کی ضرورت ہے۔ سندھ کے بارے میں کل ہی ڈان اخبار میں ایک ماہر نے اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں الٰہی بخش سومرو کا بیان بھی ہمارے سامنے آیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود انجینئر ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ آج نہیں بلکہ آج سے بارہ چودہ سال پہلے کوٹری بیراج کی دیکھ بھال کے نظام کو میں نے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی کم سے کم دیکھ بھال کی ضروریات بھی مفقود

تھیں۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر طوفان آتا ہے تو یہ بڑی تباہی مچائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے چیف منسٹر کو مطلع کیا کہ یہ صورت حال ہے اس کی فکر کرو۔ لیکن کسی نے اس کی فکر نہیں کی۔ یہ محض ایک بیراج کی بات نہیں ہے بلکہ یہ پورے ملک کا معاملہ ہے۔

بجٹ پر نظر ثانی کی ضرورت: جنابِ والا! میں آخر میں مالی پہلو کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم اس صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے نیا ٹیکس لگائیں گے۔ میں بڑے ادب سے یہ عرض کروں گا کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ ٹیکس کی کیا پیچیدگیاں ہوں گی؟ ہماری معیشت اس وقت زبوں حالی کا شکار ہے۔ زراعت، صنعت، برآمدات، توانائی ان تمام بحرانوں اور حالات کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ ہماری ترجیحات میں اولین چیز اخراجات کم کرنا ہونا چاہیے۔ بجٹ پر فوری طور پر نظر ثانی ہونا چاہیے اور انتہائی سادگی پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ آپ قرضوں کی واپسی کے لیے چھوٹ حاصل کریں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ اس سے آپ چھ سو بلین روپے سالانہ بچا سکتے ہیں۔

کرپشن کو پہلا ہدف بنایئے۔ عوام اس بارے میں چیخ رہے ہیں، بیرونی دنیا چیخ رہی ہے۔ آپ نے اس معاملے میں اپنے کان اور آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ حکومت کو رویہ بدلنا ہو گا۔ اندرونی وسائل کو متحرک کرنا میری نگاہ میں ممکن ہے بشرطیکہ شفاف انتظام ہو، احتساب ہو اور لوگوں کی ضروریات کو ترجیح بنایا جائے۔ حکومت پر عدم اعتمادی کا ثبوت یہ ہے کہ NGOs، مثلاً ایدھی فاؤنڈیشن یا الخدمت اور دیگر اداروں کو عطیات مل رہے ہیں۔ لوگ ان پر اعتماد کرتے ہیں لیکن آپ پر اعتماد نہیں کر رہے۔ اس بنا پر اس بات کی ضرورت ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ ٹیکس کا بوجھ بڑھائیں، آپ بجٹ کو نظر ثانی کر کے جہاں جہاں بچت ہو سکتی ہے اس کو ادھر منتقل کریں۔

میں یہ بات بھی کہوں گا کہ جو ظلم اس صورتحال میں تعلیم کے ساتھ کیا جا رہا ہے اسے چیک کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اس پالیسی پر علیٰحدہ بات بھی کریں گے لیکن میں آج بھی یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کے بجٹ کو کاٹنا اور ہیلتھ کے بجٹ کو کاٹنا ایک ظلم ہے۔ اس کا کوئی

جواز نہیں ہے۔ اگر آپ کو کمی کرنی ہے تو اپنی شاہ خرچیوں پر کریں۔ آئی ایم ایف سے بات چیت کے لیے آپ ان حالات میں واشنگٹن جاتے ہیں اور سترہ افراد کا وفد لے کر جاتے ہیں جو دو ہفتے وہاں ٹھہرتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی موجودگی میں آپ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ عوام آپ پر اعتماد کریں گے اور وہ آپ کو وسائل دیں گے۔ تعلیم پر کٹوتی ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے لیے مزید وسائل اور رقوم مختص ہوں۔ ان وسائل کو متحرک کریں اور جو کشکول گدائی ہم نے لیا ہوا ہے اسے توڑ دیں۔ ہم سب اس پر شرمندہ ہیں، شاید کچھ مجبور بھی ہیں لیکن اگر پاکستانی اپنے وسائل اور تارکین وطن کے وسائل کو صحیح طرح استعمال کریں اور باہم اعتماد ہو تو ہم اس بحران کا بھی اسی طرح مقابلہ کرسکتے ہیں جس طرح ۴۸-۱۹۴۷ء میں اور ایسے ہی دوسرے مواقع پر کیا تھا۔

(۲۱ ستمبر ۲۰۱۰ء)

باب نمبر ۴

انسانی جان کی حفاظت اور حکومتی ذمہ داری

حکومت کی ذمہ داریوں کی کوئی بھی فہرست بنائی جائے ان میں عوام کی جان کی حفاظت اوّلین ذمہ داریوں میں شمار کی جائے گی۔ قدیم زمانہ میں زندگی سادہ تھی اس وقت جان کو لاحق خطرات کا ایک بڑا حصہ تو قدرتی آفات اور وباؤں سے متعلق ہوتا تھا۔ انسان اس کے سامنے عملاً بے بس تھا۔ دوسری جانب، داخلی یا بیرونی تصادم کی صورت میں ہی جان کو خطرات لاحق ہوتے تھے۔ آج کے دور میں البتہ خطرات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کے مختلف دائروں میں آنے والی تبدیلیوں نے جان کی حفاظت کے حوالہ سے حکومتی ذمہ داریوں میں وسعت اور تنوع پیدا کر دیا ہے۔

گذشتہ باب میں زلزلوں اور سیلاب کی صورت میں پاکستان میں آنے والی تباہی پر حکومتی کارکردگی اور طرزِ عمل پر بحث کی گئی ہے جبکہ زیرِ نظر تقاریر ایسے واقعات کے تناظر میں سینیٹ میں کی گئی ہیں جن میں بظاہر ہر ایک کی نوعیت مختلف ہے لیکن ان کا مرکزی نکتہ یہی ہے کہ انسانی زندگی کی حفاظت کو لاحق خطرات کے ضمن میں حکومتیں کہاں کہاں اور کیوں ناکام ہو رہی ہیں اور ایسی صورتِ حال سے انھیں کس طرح نبرد آزما ہونا چاہیے۔

خطرناک ادویات کی فروخت: جناب چیئرمین! اسلام آباد میں صحت کے شعبہ پر نظر رکھنے والی ایک تنظیم کی حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ایسی جن ادویات پر پابندی ہے جو دل کا دورہ پڑنے کا سبب بنتی ہیں پاکستان میں ڈاکٹر ان دواؤں کو مریضوں کے لیے تجویز کر رہے ہیں اور میڈیکل اسٹورز پر یہ ادویات فروخت کی جا رہی ہیں رپورٹ کے مطابق ان ادویات کو میڈیکل اسٹوروں سے ہٹانے کے لیے وزارتِ صحت کی جانب سے سرکاری اعلامیہ کا انتظار ہے۔

جناب چیئرمین! یہ مسئلہ اس پہلو سے بہت حساس ہے کہ یہ ادویات، خصوصیت سے Vioxx اور اسی کیٹگری کی دوسری دوائیں جن کے بارے میں یہ رپورٹ آئی ہے انسانی جانوں کی ہلاکت کا سبب بن رہی ہیں۔ عالمی سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تقریباً ستائیس ہزار افراد ان دواؤں کے استعمال سے مر چکے ہیں۔ یہ دوا ۱۹۹۹ء میں متعارف ہوئی تھی اور سروے میں ان اموات کو پچھلے چار سال سے شمار کیا گیا ہے۔ Vioxx بنیادی طور پر جوڑوں کے درد کے لیے ہے اور میں اس میں ذاتی مشاہدہ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں خود جوڑوں کے درد کا مریض ہوں، مجھے بھی یہ دوا تجویز کی گئی، تین مہینے میں نے استعمال کی البتہ اس کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے کہا کہ آپ اس دوا کو چھوڑ دیں۔

پاکستان میں میرے علم کی حد تک اس وقت بھی یہ دوا تجویز کی جارہی ہے بارہ اکتوبر کو میں نے تحریک پیش کی تھی اور اس وقت تک پاکستان کے عام سٹورز میں یہ عمومی طور پر موجود تھی اور ڈاکٹر اسے تجویز کر رہے تھے جبکہ عالمی سطح پر اسے واپس لے لیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں ٹی وی پر اشتہارات آئے ہیں۔ Merck کمپنی نے اس دوا کو متعارف کیا تھا اور تقریباً ۵ء۲ ارب ڈالر سالانہ اس کی سیل تھی، اس نے اسے واپس کیا ہے اور یہ کہا کہ دنیا بھر سے ہم اس کو واپس لے رہے ہیں۔

لیکن اس ایک دوا سے قطع نظر بھی میں یہ بات واضح کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں دوسری جعلی ادویات بھی مارکیٹ میں موجود ہیں اور وہ بھی جنہیں مغربی ممالک میں تحقیق کے بعد خطرناک سمجھ کر واپس لے لیا گیا ہے کیونکہ ان پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس سے پہلے سینیٹ میں اس کام کے لیے کمیٹی بنی تھی اور میں خود اس کمیٹی کا ممبر تھا، جاوید جبار اس میں تھے۔ ہم نے مہینوں کوشش کر کے ایک بہت ٹھوس رپورٹ دی تھی اور حکومت نے یہاں ضمانت دی تھی کہ وزارتِ صحت اس معاملے میں چوکس رہے گی اور اس قسم کی جو بھی چیز ہو گی خواہ وہ جعلی ہو یا ایسی دوائیں جو خطرناک ہیں ان سے عوام کو محفوظ کیا جائے گا لیکن کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

اس تازہ ترین واقعہ کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ انسانوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے اور اس کو حکومت کو سنجیدہ لینا چاہیے۔ یا آپ فوراً اعلامیہ لائیں اور اسے ختم کرنے کے لیے مؤثر اقدام کریں ورنہ میرا خیال ہے کہ سینیٹ کو اس مسئلے پر تفصیل سے بات کر کے کوئی نہ کوئی رہنما پالیسی خطوط دینے چاہییں۔ جنابِ والا! اس سے جڑا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر ۴ اکتوبر کو حکومت نے اس دوا کے بارے میں کوئی اقدام کر لیا تھا تو پھر صوبوں کو مطلع کرنے میں بیس دن تک یعنی ۲۴ اکتوبر تک کی تاخیر کیوں ہوئی؟ بہر حال جو کچھ آپ نے کیا ہے، یہ قابل ستائش بات ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ دوسری جانب میں یہ سوال اٹھاؤں گا کہ Merck ایک بہت بڑی کمپنی ہے اور اگر ۲۷ ہزار افراد اس دوا سے ہلاک ہو چکے ہیں اور نامعلوم کتنے افراد پر اس کے اثرات ہوئے ہوں گے تو کیا کوئی ایسا انتظام کیا جا رہا ہے کہ ایسی کمپنیاں جو ہمارے یہاں سے اربوں روپے بنا رہی ہیں، ان کے خلاف ایسے معاملات کے حوالہ سے کوئی تادیبی کارروائی کی جا سکے اور ان سے پوچھا جائے کہ آخر دوا کے منفی اثرات جاننے کے باوجود ایسی دوائیں چھ سال سے کیوں مارکیٹ میں آتی رہی ہیں اور فروخت ہوتی رہی ہیں۔ (۹ دسمبر ۲۰۰۴ء)

انسانی اعضاء کی تجارت: جناب چیئرمین! آج ۲۸ جون ۲۰۰۶ء کے ڈیلی ٹائمز میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کے مطابق پاکستان میں انسانی اعضاء کی فروخت کا کاروبار روز بروز بڑھ رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق صرف ضلع گوجرانوالہ میں گذشتہ چھ ماہ کے دوران ۱۱۱ افراد نے غربت کے سبب اپنے گردے فروخت کیے ہیں۔ جنابِ والا! حقیقی حالات کے اندر یعنی کسی کی زندگی کو بچانے کے لیے انسانی اعضاء کی پیوندکاری ایک اچھی چیز ہے لیکن کھلم کھلا استحصال اور خاص طور سے غریب اور مفلوک الحال افراد کے ساتھ اس معاملہ میں جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ بے حد تشویشناک ہے۔ انھیں اپنے جسم کے اعضاء ترغیب یا تحریص کے ذریعے سے بیچنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور یہ کاروبار ایک مافیا کے انداز میں فروغ پا رہا ہے۔ جنابِ والا! ذرائع ابلاغ میں آنے والی ایک اور رپورٹ کے مطابق دھوکہ دہی اس حد تک ہو رہی ہے کہ کراچی میں ایک شخص پتے

کے آپریشن کے لیے گیا، وہ آپریشن تو نہیں کیا گیا اور اس کا گردہ نکال لیا گیا۔ انسانی اعتبار سے بھی اور ملک کے وقار اور صحیح روایات کے اعتبار سے بھی یہ ایک ہولناک صورت حال ہے۔ مافیا کے ذریعے سے اس طرح غریبوں کا استحصال کسی طرح قابل قبول نہ ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس کو پس پشت ڈالنے کی بجائے اس کا سامنا کیجیے۔ قانونی اور سماجی دونوں اعتبار سے اس کو حل کرنے کے لیے مؤثر حکمت عملی ضرورت ہے۔

میں وزیر محترم کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے ایک مثبت رد عمل دیا ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ نصیر خان صاحب بالعموم ایسے معاملات کو پارٹی بنیاد پر نہیں لیتے ہیں بلکہ مسئلہ کے اعتبار سے بہت اچھے رد عمل دیا کرتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی چیز ہے لیکن جنابِ والا! ان کی توجہ کے لیے اس سے زیادہ اہم مسئلہ اور مثال نہیں ہو سکتی کہ انسانوں کے اعضاء کی کھلی تجارت ہو رہی ہے۔ جنابِ والا! مجھے ابھی عبدالرحیم صاحب نے دی نیوز کا اداریہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> پاکستان آج غیر یقینی پابندیوں کے کھیل میں مصروف ہے جبکہ یہاں جو لوگ قیمت ادا کر سکتے ہیں وہ انسانی اعضاء خرید سکتے ہیں۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب آپ کو کسی مسئلے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو راتوں رات آرڈیننس لے آیا جاتا ہے، اس پر کسی ڈرافٹنگ کا، کسی توثیق اور کسی منظوری کا کوئی نام نہیں لیا جاتا بلکہ اس حوالہ سے احسان جتایا جاتا ہے۔ وزیر محترم اس مسئلہ پر غور کریں اور ہمیں بتائیں کہ اعضاء کی تجارت کے اس مسئلے کا نوٹس ان کی وزارت نے کب لیا ہے؟ قانون کی ڈرافٹنگ اور ڈرافٹنگ کے بعد توثیق کے لیے ابھی تک اسے کابینہ میں کیوں نہیں لے کر آئے، اتنا وقت کیوں لگا ہے؟ ان چیزوں کو ترجیح دیجیے۔ اعضاء کی تجارت دراصل سرمایہ دارانہ نظام کا ایک ظلم ہے اور جب تک آپ سرمایہ پرستی اور سرمایہ دارانہ نظام کی جڑوں کو نہیں ہلائیں گے اور ملک سے غربت اور افلاس کو مٹانے کے لیے وسائل کا رخ اس طرف نہیں کریں گے، یہ معاملات حل نہیں ہوں گے۔ (۱۰ اگست ۲۰۰۶ء)

پینے کے صاف پانی کی فراہمی کا منصوبہ: جناب چیئرمین! اس توجہ دلاؤنوٹس کا جو مقصد ہے وہ عوام کو پینے کے لائق صاف پانی کی فراہمی کا منصوبہ ہے۔ اصولاً یہ ایک مفید اور بہت ضروری منصوبہ ہے غالباً ۲۰۰۵ء میں اس کا آغاز کیا گیا تھا اور توقع یہ تھی کہ پاکستان میں پینے کے صاف پانی کے ۶۶۲۶ پلانٹ تمام صوبوں میں لگائے جائیں گے۔ اسلام آباد میں دسمبر ۲۰۰۷ء تک یہ تمام کام مکمل ہو جانا تھا۔ ابتدائی طور پر اس پر سولہ ارب روپے خرچ ہونے تھے اور اصل اسکیم کا یہ بھی حصہ تھا کہ جو کمپنی یہ پلانٹ لگائے گی پہلے تین سال مرمت و دیکھ بھال اس کی ذمہ داری ہو گی اور اس کے بعد دیکھ بھال مقامی حکومت کے سپرد کر دی جائے گی لیکن اس پر تقریباً پانچ سال گزر گئے ہیں اور اب جو معلومات پریس کے ذریعے سامنے آرہی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ منصوبہ بری طرح ناکام رہا ہے۔ شاید بلوچستان واحد صوبہ ہے جہاں اور تو بہت ناکامیاں ہوئی ہیں اور میرے بھائی بتا سکیں گے کہ حقیقت کیا ہے لیکن دعویٰ یہ ہے کہ وہاں ۴۰۹ میں سے ۳۷۰ پلانٹ لگا دیے گئے ہیں۔ **واللہ اعلم بالصواب** کیونکہ باقی تمام صوبوں میں اور پنجاب میں تو سب سے زیادہ بُرا حال ہے۔ میرے توجہ دلاؤنوٹس کا مقصد یہ ہے کہ وزیر موصوف اس مسئلہ کے بارے میں قوم کو بتائیں۔

نمبر ایک، اصل منصوبے پر کہاں تک عمل ہوا ہے اگر عمل نہیں ہوا تو کیوں نہیں ہوا اور عمل نہ ہونے کا کون ذمہ دار ہے۔ اور اس میں کہاں تک حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کرپشن کی وجہ سے بہت سے منصوبے ناکام ہو گئے ہیں اور پریس کے ذریعے یہ پتہ چلا ہے کہ جہاں کہیں پلانٹ لگے ہیں وہاں پر بھی یہ کام نہیں کر رہے ہیں۔ پانی اسی طرح آلودہ شکل میں لوگوں کو مل رہا ہے یا مل ہی نہیں رہا ہے۔ آپ ہمیں صحیح صورت حال بتا دیں کہ کتنا کام ہوا ہے، کتنے پلانٹس لگے ہیں، کہاں کامیاب ہیں، کہاں ناکام ہیں اور ناکامی کی وجوہات کیا ہیں اور ناکامی کے ذمہ دار افراد کے بارے میں آپ نے کیا کارروائی کی ہے۔ اس وقت تک کم از کم دو سال آپ کو مل گئے ہیں۔ ہم جاننا چاہتے ہیں اس پراجیکٹ کے بارے میں حکومت کی کیا کارکردگی ہے؟

جنابِ والا! ابھی ابھی وزیر محترم نے اس سلسلے میں جو حقائق[1] ہمارے سامنے رکھے ہیں وہ تسلی بخش ہیں ہم اسے قبول کرتے ہیں۔ البتہ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ جو افراد ٹھیکہ لینے والی کمپنیوں کی جعلی ضمانت دینے کے ذمے دار تھے اور جو اسے قبول کرنے والے تھے اور جو بینک اس میں ملوث ہیں، کم از کم ان کے خلاف ایکشن لیا جائے۔ (۱۸ فروری ۲۰۱۰ء)

ناکارہ گیس سلنڈروں کی بناء پر ہونے والی ہلاکتیں: جناب چیئرمین! اس تحریک التواء کے تحت میں نے آدھے درجن سے زیادہ اخبارات کے تراشے دیے ہیں جو صرف نومبر کے آخری ہفتے سے لے کر دسمبر کے تیسرے ہفتے تک کے ہیں۔ فیصل آباد، سکھر، لاہور، جیکب آباد یعنی ملک کے طول و عرض میں سلنڈر پھٹنے کے واقعات ہو رہے ہیں۔ یہ واقعات گھروں اور فیکٹریوں میں بھی ہوئے ہیں اور اس سے زیادہ گاڑیوں میں ہوتے ہیں، گاڑیوں میں اموات فوری ہوتی ہیں۔ اس ہفتہ کی رپورٹ میں صرف ایک گاڑی میں ۱۳ افراد، جن میں ۹ بچے شامل تھے شہید ہوئے۔ دوسری گاڑی میں یہ تعداد ۱۵ تک پہنچی۔

اخبارات کی رپورٹ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو نہیں، لاکھوں کی تعداد میں ناکارہ اور غیر معیاری سلنڈر استعمال ہو رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری نگرانی کرنے والوں پر، ان سلنڈر کے سپلائی کرنے اور انہیں استعمال کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے، یہ موت کا رقص ہے۔ اگر اس سے بھی زیادہ کوئی اور اہم مسئلہ وزیر موصوف کی نگاہ میں ہو، تو میں ان سے رہنمائی حاصل کروں گا لیکن اگر اس تیزی کے ساتھ محض صحیح نگرانی کے نہ ہونے کی وجہ سے یا بے ایمانی کی بناء پر ہلاکتیں ہو رہی ہیں تو اس کا نوٹس کیوں نہیں لیا جا رہا۔ بلاشبہ جن

---

[1] وفاقی وزیر برائے خصوصی اقدامات جناب لعل محمد خان نے پینے کے صاف پانی کے منصوبے کے حوالے سے پروفیسر خورشید احمد کے سوال کے جواب میں بتایا کہ کل ۳۳۰۰ ملین روپے کی لاگت سے واٹر پلانٹ لگانے کا ٹھیکہ گلوبل لائف واٹر کو ۲۰۰۷ء میں دیا گیا تھا لیکن دو سال میں کام شروع نہ ہونے کی بناء پر ۲۰۰۹ء میں ۳۶۰۰ پلانٹس کا یہ ٹھیکہ پنجاب حکومت کو دیا گیا۔ تحقیقات کے مطابق گلوبل لائف والوں نے نہ صرف جعلی بینک گارنٹی جمع کرائی بلکہ دو سال کے عرصے میں دس فیصد کام کیا۔ اس منصوبے کے تحت پنجاب میں بشمول اسلام آباد ۳۶۰۰ صوبہ سرحد میں ۱۱۰۰، سندھ میں ۱۱۰۰، بلوچستان میں ۵۰۰ پلانٹس لگنے تھے۔

گاڑیوں اور مکانات میں یا جن فیکٹریوں میں یہ چیزیں لگی ہوئی ہیں، وہ بھی ذمہ دار ہیں۔ لیکن اولین ذمہ داری حکومت کی اور نگراں حکام کی ہے۔ جب یہ چیز بار بار اخبارات اور رپورٹ کے ذریعے حکومت کے سامنے آرہی ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ حکومت اس سلسلے میں کوئی مؤثر اقدام نہیں کرتی کہ ان کا باقاعدہ سروے ہو اور چیکنگ کی جائے۔ اوران کے تمام سیل پوائنٹس کی نگرانی کی جائے۔ درحقیقت یہ نہ کر کے ہم نے لوگوں کو دستور میں دیے گئے جان کی حفاظت کے بنیادی حق سے محروم کر دیا ہے۔

اس وقت میں صرف اس کی اہمیت اور شدت اور ملک میں اس کے بڑے پیمانے پر ہونے والے واقعات کے بارے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ بظاہر اس میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آرہی کہ اسے روکنے کے لیے حکومت نے کوئی اقدام کیا ہو۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک فوری، قومی اہمیت اور انسانی جانوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق حکومت سے ہے۔ اس کا تعلق اس انتظامی مشینری سے ہے جو حکومت کے تحت ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر اعتبار سے یہ تحریک التواء شرائط پر پورا اترتی ہے۔ اسے منظور کیا جائے اور اس پر مکمل بحث سینیٹ میں ہو۔

متعلقہ وزیر کے جوابی بیان کے بعد!

جناب چیئر مین! پہلے تو میں وزیر صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے دیانتداری سے صورت حال ہمارے سامنے رکھی، میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ لیکن آپ دیکھیں کہ انہوں نے کہا کیا ہے؟ اس میں ہمارے سامنے پہلی بات یہ آئی کہ فی الحقیقت اوگرا کا نگرانی کا نظام غیر مؤثر ہے۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ واقعات ہوئے ہیں، ہو رہے ہیں اور اس وجہ سے ہو رہے ہیں کہ خراب، ناکارہ اور غیر معیاری سلنڈر استعمال کیے جا رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس حقیقت کی بنیاد پر میں نے یہ تحریک پیش کی یعنی جانوں کا ضائع ہونا اور اس کی وجہ سلنڈروں کا غیر معیاری ہونا اور یہ کہ مجاز مقتدرہ یہ کام نہیں کر سکی ہے، ان کے بیان سے یہ تینوں باتیں ثابت ہو گئی ہیں۔ دوسری بات جو ان کے بیان سے سامنے آئی اور

میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس بات کو اس ایوان سے مشتہر کیا، وہ اور بھی خطرناک ہے کہ ۱۸ویں ترمیم اپریل ۲۰۱۰ء میں منظور ہوئی، لیکن ابھی تک مناسب طریقہ کار تک طے نہیں ہوا ہے کہ کیا کام صوبوں کو جائے گا اور کیا کام مرکز کرے گا؟ نئے قواعد وضوابط کیا ہوں گے؟ یہ کیا طرزِ حکمرانی ہے؟

جنابِ والا! اس بیان کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ وزیر صاحب نے میری تجویز کی تائید کی ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس تحریک کی اہمیت کے پیش نظر اس پر بحث کی جائے۔ انسانی جانوں سے اس کا تعلق، براہ راست حکومت کی ذمہ داری اور وزیر محترم کا یہ اعتراف بڑی واضح کمزوری اور خامیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جو نگران اتھارٹی ہے، اس نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی۔ اور پھر دوسری چیز اس سے بڑی یہ ہے کہ دھماکہ خیزی کے واقعات کے سلسلے میں جو پالیسی اپریل کے فوراً بعد طے ہو جانی چاہیے تھی، وہ آج تک طے نہیں ہو سکی۔ معلوم ہوا کہ وزارتوں کے درمیان اختلاف ہو رہا ہے کہ کیا چیز کس کی ذمہ داری ہے اور دوسری جانب لوگ مر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم چیز کیا ہو گی؟ اس لیے میں درخواست کروں گا کہ اس کو ضرور منظور کیا جائے۔ (۲۸ جنوری ۲۰۱۲ء)

پارلیمنٹ ہاؤس میں آتشزدگی کا واقعہ: محترمہ چیئرپرسن صاحبہ! ہم سب انتہائی افسردہ ہیں کہ پارلیمنٹ ہاؤس میں آگ لگنے کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ سے بڑا قومی نقصان تو ہوا ہی ہے اس سب سے بڑھ کر اس سے جمہوری اداروں پر حرف آتا ہے۔ یہ بات کہ ہم اپنے اہم ترین جمہوری ادارے کی بھی بروقت حفاظت نہ کر سکے ہم سب کے لیے شرمندگی کا باعث ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اس ایوان میں آگ نہیں لگی بلکہ اس کے دوسرے حصہ میں لگی، پارلیمنٹ ہاؤس ہم سب کے لیے مقدس امانت ہے اور جو نقصان اسے پہنچا ہے اس پر ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر چونکہ محترم وزیر داخلہ موجود ہیں اور یہ اس واقعہ کے بعد پہلا اجلاس ہے، اگر وہ اس معاملے میں ہمیں اعتماد میں لینا چاہیں اور کوئی اب تک کی رپورٹس سے مطلع کرنا چاہیں تو ہم اس کے لیے ان کے ممنون ہوں گے۔ (اس

موقع پر وزیر موصوف نے ایوان کو واقعہ کے بارے میں بتایا۔)

ہم سب وزیر پارلیمانی امور اور ہمارے محترم بھائی سینیٹر سعید قادر کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس عظیم قومی سانحہ کے بارے میں اس ایوان میں گفتگو کا آغاز کیا ہے یہ ایک اچھی روایت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ قومی سانحہ ہے جس کا تعلق کسی خاص ایوان اور کسی خاص پارٹی سے نہیں ہے اور اسی جذبہ کے تحت ہمیں اس پر گفتگو کرنی چاہیے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ ان اوّلین افراد میں سے تھے جو آگ کی اطلاع ملتے ہی وہاں پہنچے۔ یہ بڑی قابل قدر چیز ہے، ہم اس کا احترام کرتے ہیں اور اس بات پر خوشی محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے اس طریقے سے اپنی ذمہ داری ادا کی ہے لیکن میں توقع رکھتا تھا کہ وہ نسبتاً زیادہ تفصیل سے بات کرتے۔ حکومت کی طرف سے ایک بیان آتا کہ فلاں وقت غالباً آگ کا آغاز ہوا فلاں وقت اس کی اطلاع ہوئی اور پھر اس کے بعد جو سات، آٹھ گھنٹے آگ بجھانے کی جدوجہد کی گئی اس میں کیا طریقہ کار طے کیا گیا۔ نقصانات کے بارے میں عمومی اندازہ کیا ہے؟ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جو وہ شروع میں بیان کر دیتے تو شاید یہ بحث صحیح رخ پر کی جا سکتی۔

بہر حال! میں سب سے پہلی بات تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس میں ہم سب غمگین ہیں۔ ہم سب شدت سے اس اتلاف اور اس آزمائش کو محسوس کرتے ہیں۔ بلاشبہ دنیا کے مختلف پارلیمنٹ ہاؤسز میں آگ لگنے کے ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں لیکن بالعموم یہ چیزیں بیرونی حملوں اور جنگوں کے درمیان واقع ہوئی ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کے دوران گولے پھینکے گئے تھے اور اسی عالم میں پارلیمنٹ برسرکار رہتی تھی۔

ایک چیز ہمارے لیے بھی تکلیف کا باعث ہے اور جس کی طرف میرے محترم بھائی سعید قادر صاحب نے صحیح متوجہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ ہاؤس کی حفاظت، اس کے لیے بروقت نگرانی کا نظام کس کی ذمہ داری تھی۔ ہماری اطلاع کی حد تک اس میں ایمرجنسی اور آگ، ان دونوں کے بارے میں الارم سسٹم موجود تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سینٹ میں

جس وقت یہ سارے کام ہو رہے تھے، یہ الارم بجایا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ ہم یہ نظام ٹیسٹ کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ کیا صورت حال ہے۔ تو دوسرے الفاظ میں یہ سسٹم وہاں پر موجود تھا۔ اور آج تو فائر الارم اتنے حساس ہیں کہ سگریٹ کے دھویں سے بج اٹھتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ پارلیمنٹ کی بلڈنگ کی حفاظت کا ذمہ دار کون تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جونیجو صاحب نے جب اس پارلیمنٹ پر جھنڈا لگانے کا افتتاح کیا تھا تو یہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں جھنڈا چوبیس گھنٹے لہراتا رہے اگرچہ یہ عام روایت ہے کہ رات کو جھنڈا اتارا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ نہ اتارا جائے تاکہ اس ملک میں پارلیمنٹ کی یہ شمع جلتی رہے۔ پارلیمنٹ کی عمارت بھی دراصل ایک مقدس چیز ہوتی ہے اور وہ ایک علامت ہے اس ملک میں جمہوریت کے فروغ اور اس کی حفاظت کے لیے، تو پہلا سوال یہی ہے کہ اس کی حفاظت کے انتظامات کس کی ذمہ داری تھی؟ جو واقعہ ہوا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہاں حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم غفلت میں ہیں اور اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہاں حفاظت کا معقول انتظام موجود ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں حفاظت کا معقول انتظام موجود نہیں ہے یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

جنابِ والا! دوسری چیز میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میرے علم کی حد تک دھواں اٹھنے کے بعد اسلام آباد کے شہری باہر نکل آئے اور پارلیمنٹ کی بلڈنگ کے باہر جمع ہو گئے لیکن اس وقت تک سرکاری مشینری خصوصاً سی ڈی اے جس کی ذمہ داری اس کی حفاظت کرنا تھی حرکت میں نہیں آئی تھی۔ پہلے پہنچنے والوں میں افتخار اللہ بابر صاحب (سیکرٹری سینیٹ) اور غالباً وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری صاحب تھے، جنہوں نے بروقت وہاں پہنچ کر انتظامات کیے اور سرگرمی سے اس معاملے میں کارروائی کی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ صرف ان دو کا نہیں تھا بلکہ پارلیمنٹ کی حفاظت یہاں کی پوری انتظامیہ اور دوسرے سیکرٹریز کی ذمہ داری تھی۔ لیکن بجائے اسٹیبلشمنٹ کے، عام آدمی زیادہ پریشان تھا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ایسا کیوں ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے اس بات کی علامت ہے کہ بے حسی اور غفلت کا مرض ہمارے ہاں بہت اوپر تک آچکا ہے اور پھر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ کیسے کیسے واقعات اور کیسی کیسی سازشیں ابھرتی ہیں۔

اسی طریقے سے میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ فائر بریگیڈ کے آنے کے بعد یہ مسئلہ بھی تھا کہ آگ لگنے کے مقام تک کیسے پہنچا جائے۔ اس کے لیے کوئی پلان نہیں تھا کہ کس حصہ کو توڑنا ہے، کہاں سے داخل ہونا ہے کون سے حصہ کو بچایا جا سکتا ہے؟ اگر یہ بات درست ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس اس قسم کی سیکورٹی کا ہنگامی منصوبہ موجود نہیں ہے۔ حالانکہ یہ تو بنیادی چیزیں ہیں جن کا خیال عام گھروں اور عام بلڈنگز کے جو ڈیزائن ہوتے ہیں ان میں بھی رکھا جاتا ہے۔

اہم ترین پہلو حفاظت کا انتظام اور ایمرجنسی پلاننگ ہے۔ اگر ایک عام بلڈنگ کے اندر آگ لگنے کی صورت میں خطرے کا الارم اور بروقت داخلے کی سکیم سوچی جاتی ہے تو پارلیمنٹ ہاؤس کے بارے میں آخر ہمارا نظام کیوں فیل ہو گیا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب آنا چاہیے۔ اسی طریقے سے یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ کیا فی الحقیقت نقصان کو کم کیا جا سکا؟ آگ، غالباً آٹھ گھنٹے لگی رہی ہے۔ اس کو ختم کرنے میں کیا ڈھانچے کی مشکلات تھیں یا انتظامی مشکلات تھیں یا ہماری مشینری کا بروقت متحرک نہ ہو پانا اصل وجہ ہے۔

جنابِ والا! اس کے بعد میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ انکوائریز اور کمیشن کے بارے میں ماضی کا تجربہ بڑا تلخ ہے۔ لوگ برملا یہ بات طنزیہ طور پر کہتے ہیں کہ اگر کسی معاملے کو حل نہ کرنا ہو تو اس پر کمیشن بٹھا دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ متعین وقت کے اندر اس حوالہ سے دونوں کمیشن اپنی رپورٹ پیش کریں۔ کمیشن کی تشکیل کو بھی میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ لچکدار نہ رکھا جائے۔ یہ بات متعین کر دیں کہ یہ ان کی تعداد ہے، یہ وقت ان کے پاس ہے اور اتنی مدت کے اندر انہیں رپورٹ دینا ہے۔ یہ دونوں رپورٹیں، دونوں ایوانوں میں آنی چاہییں تاکہ محض حکومت تک ہی محدود نہ رہ جائیں بلکہ ایوانوں میں آ کر پبلک پراپرٹی ہوں اور ان پر بحث ہو سکے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ذمہ داری کو متعین کر کے غفلت کے ذمہ دار افراد کو سزا ملنی چاہیے۔ یہ جواز نہیں دیا جا سکتا کہ چھٹی کا دن تھا اگر چھٹی کا دن تھا، تو بھی چھٹی کے دن ہم اپنے تمام اداروں کو ایسے ہی خطرات میں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ چھٹی کے مواقع پر تو اور زیادہ انتظام ہونا چاہیے اور کوئی نہ کوئی

ذمہ دار شخص ڈیوٹی پر ہونا چاہیے۔ محض بے چارے چوکیدار اور گارڈز پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ آفیسرز ڈیوٹی پر ہوں جن کی اصل ذمہ داری ہے۔ تو یہ سارے پہلو ہیں جن کو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں سامنے رکھنا چاہیے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ حکومت اس معاملے میں تندہی سے بھی کام کرے گی اور اچھی روایات کا مظاہرہ کرے گی اور دونوں ایوانوں کو پورے طریقے سے اعتماد میں لے گی۔ (۱۱نومبر ۱۹۹۳ء)

اسلام آباد میں پولیس کے جرائم پر رپورٹ: جناب چیئرمین! دی نیوز اسلام آباد نے ۱۶مارچ کو اسلام آباد پولیس پر ایک خصوصی فیچر شائع کیا ہے۔ فیچر میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ اسلام آباد پولیس ایک طویل عرصے سے عوام کی حفاظت کی ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے کی مجرم ہے۔ اخبار کی تحقیق کے مطابق معمولی چوری سے لے کر منظم ڈکیتیوں، بڑے پیمانے پر شراب کی کشید کرنا، زنا اور فحاشی کو پروان چڑھانا، غرض آپ کسی بھی جرم کا نام لیں آپ کو پتہ چلے گا کہ اسلام آباد پولیس اس میں ملوث ہے۔ یہاں جرائم کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔

اس پورٹ کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ جو ادارے اور افراد امن و امان قائم کرنے کے ذمہ دار تھے اور قومی وقار و عزت کے محافظ تھے وہ خود ایسے بدترین جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں جن کی پیشہ ور مجرموں سے توقع نہیں کی جاتی تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ملک میں امن و امان کی صورتحال تباہ ہو چکی ہے اور یہ معاملہ قومی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

میں درخواست کروں گا کہ قومی اہمیت کے اس فوری اور اہم مسئلے پر بحث کرنے کے لیے ایوان کی عمومی کارروائی کو معطل کیا جائے۔

جناب چیئرمین! میں نے اپنی اس تحریک کے ساتھ "دی نیوز" کی جو رپورٹ دی ہے۔ یہ بہت جارحانہ رپورٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور معزز ایوان میں اس کے حصے پڑھتے ہوئے بھی انسان کو حجاب آتا ہے۔ اگر یہ رپورٹ صحیح ہے اور میں وزیر صاحب سے یہ کہوں گا کہ یہ بات بتائیں کہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر حقیقت یہ ہے کہ پولیس کی جو صورتحال اس سے ہمارے سامنے

آتی ہے تو اس ملک کے لیے اور اس کے امن او امان کے لیے یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ہمارے دشمن بیرونی نہیں بلکہ وہ ہیں جنہیں سولہ ارب روپے دے کر ہم اپنی حفاظت کے لیے مقرر کر رہے ہیں اور وہ ہمارے مال، ہماری عزت اور ہماری جانوں کے اوپر حملہ آور ہیں۔ اسلام آباد کمشنر نے جو اس پر تبصرہ کیا ہے میں صرف وہ سنانا چاہتا ہوں۔ اس کی تفصیلات میں جانا اور اس کا پڑھنا اور سننا بھی بڑا مشکل ہے۔ کمشنر کہتا ہے:

”اگر کوئی قانون کا محافظ قانون توڑنے میں ملوث پایا جائے تو سخت کارروائی کی جائے، تاکہ مستقبل کے لیے مثال بن سکے۔ ہم کس معاشرے میں رہ رہے ہیں کہ جہاں پولیس یونیفارم میں لوگ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں“۔

جو تفصیلات اس میں ہیں۔ ایک معمولی سپاہی سے لے کر ایس ایچ او تک، ڈکیتی، چوری، کار اٹھانا، بچیوں اور بچوں کے ساتھ جرائم، اس رپورٹ میں پوری تفصیل ناموں کے ساتھ موجود ہے۔ اگر یہ بھی اہم مسئلہ نہیں ہے تو پھر اس سے اور زیادہ اہم مسئلہ کونسا ہو گا جس پر ہم اس ایوان میں بحث کریں اور جس میں پولیس کو راہ راست پر لانے کے لیے یہ ایوان کوئی سفارشات دے۔

میں سمجھتا ہوں جنابِ والا! وزیر صاحب کو اس معاملے میں اس قوم کے ساتھ اور اس شہر کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے۔ اس ملک کا تاثر (امیج) آپ کی تقریروں، بیرونی دوروں اور اس اعلان سے کہ آؤ یہاں سرمایہ کاری کرو، سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہاں امن و امان صحیح ہے، اگر یہاں انصاف ہے، اگر یہاں معاہدے پورے ہو رہے ہیں اور اگر پولیس قوم کو جان و مال کی حفاظت فراہم کر رہی ہے تو پھر ملک میں بھی ترقی ہو گی اور لوگ سرمایہ کاری کریں گے۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر میری نگاہ میں اس سے زیادہ اس ملک کے ساتھ بے وفائی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میں جناب وزیر صاحب سے کہوں گا کہ محض راج ہٹ میں اس قسم کی تحریک پر جوابی کارروائی نہ کریں بلکہ یہ دیکھیں کہ ملک کے مفاد میں کیا ہے۔ حقائق کا سامنا کریں اور تحقیقات کریں۔ یہ تحریک التواء جو ہم نے ۱۶ مارچ (۲۰۱۰ء) کو دی ہے اور اسی دن

اخباری رپورٹ شائع ہوئی تھی اسے اب کم و بیش آٹھ دن گزر چکے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس اثناء میں انہوں نے تحقیقات کی ہوں گی اور ہمیں بتا سکیں گے کہ کیا یہ رپورٹ صحیح ہے یا نہیں اور اگر صحیح ہے تو انہوں نے کیا کیا ہے۔ اس لیے کہ مسئلہ میری، آپ کی اور ہم سب کے خاندانوں کی عزت کا اور جانوں کا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں جنابِ والا! کہ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ باقی کارروائی روک کر اس پر مکمل بحث کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں، میں یہ بھی عرض کروں کہ وزیر صاحب نے یہ بات درست نہیں کہی کہ میں نے تمام پولیس فورس کو کہا ہے کہ وہ جرائم میں ملوث ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تفصیلی رپورٹ جو تقریباً آٹھ کالم پر مبنی ہے اور جس میں بیسیوں کیسز نام لے کر اور تعین کے ساتھ دیے گئے ہیں کہ کون سے پولیس والے نے، کس تھانے میں، کس وقت، کس کے ساتھ کیا کیا، اس کی تحقیقات ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ کچھ عمومی اعداد و شمار تھے۔ میں نے بہت مخصوص بات کی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ پولیس میں بہت اچھے لوگ بھی ہیں اور امانت داری کے جس واقعہ کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے وہ ہم سب کے لیے قابل فخر ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہر پولیس والا ایسی امانت اور دیانت سے کام لے۔

میں نے جس رپورٹ کو بنیاد بنایا ہے وہ بہت واضح ہے۔ میں نے کہا تھا کہ وزیر صاحب اس میں دیے ہوئے تمام یا بیشتر واقعات کی تردید کریں کہ ایسا نہیں ہوا تو میں اس پر بات نہ کروں گا۔ لیکن اگر اس کی تردید نہیں کرتے تو پھر یہ ایک خطرناک صورتحال کی نشاندہی ہے۔ بلاشبہ یہ صورتحال پورے ملک کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تشویشناک اس کا اسلام آباد میں ہونا ہے جو دارالحکومت اور ایک بین الاقوامی شہر ہے، جو ایک سفارتی شہر ہے اور یہاں ہونے والی ہر چیز کسی اور مقام کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس پر بحث ہو۔ اگر وہ اس کی تردید نہیں کرتے تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ ہر اعتبار سے یہ رپورٹ اور یہ حالات متقاضی ہیں کہ اس پر گفتگو ہو۔

جناب چیئرمین! اس مسئلہ پر ایوان کے مشورے کی ضرورت ہے اور تحریک التواء پر

دو گھنٹوں کی بحث کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ایوان کسی اہم قومی مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار بھی کرے اور اپنے مشورے اور تجاویز بھی دے۔ میں سمجھتا ہوں انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا ہے، اس لیے انشاء اللہ ہم دو گھنٹے گفتگو کریں گے، مشورے دیں گے اور خدا کرے وہ ان پر عمل کر سکیں۔ (۲۴ مارچ ۲۰۱۰ء)

ملاوٹ شدہ گوشت، سوفٹ ڈرنکس اور شراب کی فروخت: جنابِ والا! میں نے پانچ اکتوبر کو توجہ دلاؤ تحریک پیش کی تھی۔ اس میں، میں نے تین مسائل کو اٹھایا ہے، جن کا تعلق اسلام آباد سے ہے اور اسلام آباد میں بھی خاص طور پر پولیس سے ہے۔ ضمناً صحت کی ضمانت کے لیے جو بھی نظام ہے، وہ بھی اس سے متعلق ہے۔ تینوں مسائل اخبار کی تین خبروں پر مبنی ہیں، جو ستائیس ستمبر اور چار اکتوبر کو آئی ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ سوفٹ ڈرنکس میں ملاوٹ ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں عام آدمی کی زندگی اور صحت کو خطرہ ہے۔ اسی طرح گوشت میں بھی، میں اس کی تکنیک سے واقف نہیں ہوں کہ یہ کس طرح کرتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ گوشت میں کسی طریقے سے پانی بھرا جاتا ہے اور اس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ یہ صحت کے لیے ضرر رساں ہے۔

تیسری چیز کا تعلق جو اور بھی شرمناک ہے وہ شراب کی سمگلنگ سے متعلق ہے جس میں پولیس ملوث ہے۔ پہلی گرفتاری میں چھبیس ہزار بوتلیں پکڑی گئی ہیں۔ دوسری میں یہ تعداد بڑھ کر بیالیس ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اس میں کہا جا رہا ہے کہ شالیمار پولیس اسٹیشن اور ترنول پولیس اسٹیشن ملوث ہیں۔ اور ان کے لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔ پھر اس پر غضب یہ ہے کہ جو شراب پکڑی جاتی ہے، ان کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ اصل کو مارکیٹ میں لایا جاتا ہے اور ان بوتلوں میں لوکل شراب ڈال کر بیچی جاتی ہے۔ یہ کام پورے پورے گینگ مل کر رہے ہیں۔ اگر یہ رپورٹ صحیح ہے کہ ایک ڈی ایس پی نے سرکاری طور پر یہ بات کہی ہے کہ ۶۰ سے ۷۰ فیصد پولیس اسلام آباد کی ڈرگ مافیا سے ملی ہوئی ہے تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں: نمبر ا، حکومت کہاں تک باخبر ہے کیونکہ یہ ساری چیزیں شائع شدہ ہیں؛

نمبر ۲، جو مخصوص واقعات ہیں ان کی ذمے داری متعین کرنے، سزا دینے اور ان کے ذمہ داران کے خلاف اقدام کرنے کے لیے آپ نے کیا کیا ہے ؟ اور؛ نمبر ۳، اس صورت حال کے تدارک کے لیے کیا کیا جا رہا ہے کہ جو افراد اور ادارے جرائم کی روک تھام کے ذمہ دار ہیں وہ خود جرم کی سرپرستی کر رہے ہیں، اس میں ملوث ہو رہے ہیں۔ یہ تین مسائل ہیں، میں چاہوں گا کہ وزیر صاحب ان کے بارے میں بتائیں کہ کیا کر رہے ہیں؟ اور کس طرح حکومت ان کو قابو میں کرنے کی کوشش کرے گی[۱]؟ (۳نومبر ۲۰۱۰ء)

بلوچستان میں تین خواتین کا قتل[۲]: میں اپنی بات کہنے سے پہلے یہ کہوں گا کہ زیرِبحث مسئلہ ہماری نگاہ میں نہ پیپلز پارٹی کا ہے اور نہ کسی اور سیاسی جماعت اور گروہ سے اس کا تعلق ہے۔ یہ

---

[۱] وزیر مملکت برائے داخلہ تسنیم احمد قریشی نے اپنے وضاحتی بیان میں بتایا کہ سوفٹ ڈرنکس میں ملاوٹ کے حوالے سے کسی تھانے میں کوئی رپورٹ درج نہیں ہے جبکہ شالیمار پولیس اسٹیشن اور ترنول پولیس اسٹیشن میں شراب کی سیل توڑ کر تبدیل کرنے کے حوالے سے اعلیٰ پولیس افسران نے تحقیقات کی ہیں اور ان الزامات کو غلط پایا ہے۔ چیئرمین سینیٹ نے وزیر مملکت سے کہا کہ وہ چیف کمشنر اسلام آباد اور آئی جی اسلام آباد کے ساتھ ایک میٹنگ کر کے اس معاملے کا گہرائی سے جائزہ لیں۔

[۲] سینیٹ آف پاکستان میں سینیٹر بی بی یاسمین شاہ نے ۲۷ اگست ۲۰۰۸ء کو بلوچستان کے ضلع نصیر آباد میں قتل ہونے والی تین لڑکیوں فاطمہ دختر امیر علی عمرانی، فوزیہ دختر امام بخش عمرانی اور جنت بی بی زوجہ قیصر خان عمرانی کے قتل کے حوالے سے دی نیوز میں شائع ہونے والی خبر کی بنیاد پر تحریک پیش کی اور بتایا کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کیا گیا ہے ان کے مطابق لڑکیاں اپنی مرضی سے شادی کی غرض سے اوستہ محمد آئی تھیں جب ان کے عزیزوں کو پتہ چلا تو وہ انھیں واپس لے گئے اور قتل کر دیا۔ سینیٹ میں بحث کے دوران سینیٹر اسرار اللہ زہری نے کہا کہ اس موضوع پر بات نہ کریں یہ بلوچ روایات ہیں جبکہ سینیٹ کے قائم مقام چیئرمین جان محمد جمالی نے ممبران سے کہا کہ اس واقعہ کی تحقیقات ہو رہی ہیں اس لیے رپورٹ آنے تک خاموشی اختیار کی جائے۔

ممبران کی تقریر کے بعد وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے سینیٹ کو بتایا کہ ابتدائی رپورٹ کے مطابق خواتین ایک ٹیکسی میں علاج کی غرض سے اوستہ محمد گئی تھیں جہاں ایک شخص مراد پلوانی نے ان خواتین کو بغیر کسی مرد کے دیکھا تو ان کے رشتہ داروں کو خبر کر دی جو ان عورتوں کو واپس لے گئے دو دن بعد انھیں غیرت کے نام پر قتل کر کے کنگ واہ موضع گڑھی رحمان کے قبرستان میں دفن کر دیا جبکہ فاطمہ کے والد امیر علی کے پولیس میں بیان کے مطابق ان خواتین کو جائیداد کے تنازعہ میں ذیشان اور غوث بخش نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا جبکہ وہ خود اس فائرنگ میں معجزانہ طور پر بچ گیا۔

جناب رحمٰن ملک نے کہا کہ انھوں نے مزید تحقیقات کے لیے ایک سینئر پولیس افسر کو متعین کر دیا ہے۔ بحث کے دوران یہ بھی پتہ چلا کہ اس واقعہ کا ہائی کورٹ نے پہلے ہی از خود نوٹس لیا ہوا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کی زیر نظر تقریر اسی موقع کی ہے۔ بعد ازاں سینیٹ اراکین نے ایک متفقہ قرار داد میں اس واقعہ کی شدید مذمت کی اور واقعہ کی تحقیقات سینیٹ کی انسانی حقوق کمیٹی کے سپرد کرنے کی تجویز منظور کر لی۔

ایک انسانی مسئلہ ہے، یہ ایک اسلامی مسئلہ ہے اور یہ خواتین کے ان حقوق کا مسئلہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کو دیے۔ کوئی رواج یا کوئی جرگہ، ان حقوق کو واپس نہیں لے سکتا۔ اس تناظر میں جناب چیئر مین! یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور جمعہ کو سینیٹ میں جس طریقے سے یہ بات آئی، آپ کو یاد ہو گا کہ اس وقت بھی ہم نے احتجاج کیا تھا۔ مجھ سمیت کئی سینیٹرز اس وقت ہی اس پر بات کرنا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں بڑے بنیادی سوالات ہیں، جن کا ہمیں سامنا کرنا چاہیے۔

جنابِ والا! اسلام نے عورت کو نکاح کے معاملے میں یہ حق دیا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ولی کے سلسلے میں جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ غلط نہیں ہیں لیکن اس میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ چند مکاتب فکر اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن فقہ حنفی میں جو ہمارے یہاں اکثریتی طور پر قابلِ قبول اور رائج ہے، وہاں ولی کا ہونا ایک مفید چیز ہے البتہ اگر باقی شرائط پوری ہو رہی ہوں تو نکاح جائز قرار پاتا ہے۔ ان شرائط کی روشنی میں بالغ مرد و عورت کے درمیان شوہر اور بیوی کے رشتہ کے قیام کے لیے ایک معاہدہ باہم رضامندی سے گواہوں کے سامنے ہوتا ہے تو یہ نکاح کے لیے کافی ہے۔ اس کیس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تین لڑکیوں نے اپنے خاندان کی اجازت کے بغیر شادی کی جو تنازعہ کی وجہ تھی۔ اور ان کو اس لیے مارا گیا۔ پہلی بات یہ ہے جناب والا! کہ یہ حق اسلام نے انہیں دیا ہے اور اس حق کو کوئی بھی ان سے واپس نہیں لے سکتا۔ اس حق کے استعمال پر ان کو جان سے مارنا ایک قتل ہے، ان ہی کا نہیں بلکہ ساری انسانیت کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کیس کی حد تک جو کچھ معلومات اب تک آئی ہیں، ان میں کاروکاری سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو اسلامی قانون میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں قانون صاف کہتا ہے کہ اگر ایسا واقعہ ہوا ہے جسے قانوناً ثابت کیا جا سکتا ہے تو اس کی سزا ضروری ہے لیکن وہ سزا ہر کوئی حتٰی جرگہ بھی نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے قانون اور نظام عدل ہے قانون سے بڑھ کر یا اسے نظر انداز کر کے زبردستی کوئی کسی کی جان نہیں لے سکتا۔

جنابِ والا! میں تیسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ یہ بات صحیح ہے کہ ان خواتین کو نیم زندگی کی حالت میں دفن کیا گیا ہے تو یہ تیسرا اور نہایت قابلِ نفرت جرم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ لڑکیوں کو زندہ در گور کر دینا، قدیم جاہلی دور میں عرب کی روایت تھی لیکن نبی پاک ﷺ نے جو بنیادی معاشرتی اصلاحات کیں، ان میں انھوں نے اس روایت کو چیلنج کیا، اسے ختم کیا اور اس کے کرنے والوں کو مجرم قرار دیا۔

جنابِ والا! چوتھی بات یہ ہے کہ زیر بحث واقعہ آج سے تقریباً دو ماہ پہلے کا ہے، میں قائد ایوان سے اور ان کے وزیر قانون سے بھی یہ بات ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ اتنا سنگین واقعہ ہوا اور دو ماہ تک آپ کی حکومت نے اس پر کوئی اقدام نہیں کیا۔ جو وضاحت وزیر صاحب کے بارے میں کی گئی ہے، ہمیں اس کو ماننے میں کوئی تامل نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اس پورے واقعے کی آزادانہ عدالتی تحقیقات ہو اور جو بھی ملوث ہیں، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، خواہ قبیلے کا ہو اور خواہ معاملہ وہاں کی حکومت کا ہو، اسے قرار واقعی قانون کے مطابق سزا ہونی چاہیے۔ درحقیقت اس میں جتنی تاخیر ہو رہی ہے، عدل اور انصاف کے تقاضوں کی پامالی اسی قدر بڑھتی جا رہی ہے۔

جنابِ والا! میں اور میری پارٹی اس بات کو بھی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ جہاں بھی ظلم کے ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔ وہاں کے لوگ بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ براہ راست ظلم کرنے والے افراد ہی نہیں درجہ بدرجہ پورا معاشرہ، حکومت اور وہ تمام لوگ جو قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ اس معاملے میں ذمہ دار اور جوابدہ ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ مظلوموں کی زندگیوں کی حفاظت کریں اور جو لوگ محض روایات اور سماج کے رواج کو بنیاد بنا کر یہ ظلم کر رہے ہیں، ان کا ہاتھ روکیں۔ اس معاملے میں واضح کر دینا چاہیے کہ کسی علاقے کا یا کسی قبیلے کا کوئی رواج اور کوئی ضابطہ قانون سے بالا اور اسلام کے احکام سے بری نہیں ہے۔ جہاں کہیں یہ چیزیں رائج ہیں، ان کو ترک کرنا، اس کے لیے تعلیم، سماجی دباؤ اور قانون ان تینوں کو حرکت میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ یہ برے رسم و رواج ہمیشہ کے لیے ختم ہوں اور ہمارے معاملات حقیقی انصاف اور قانون کی بنیادوں پر قائم ہو سکیں۔ (یکم ستمبر ۲۰۰۸ء)

دیت کی عدم ادائیگی پر مجرم کے لیے نرمی کی تجویز[1]: جنابِ والا! اسلام کے قانون قصاص کے تحت قتل کا معاملہ ہو یا زخمی ہونے کا معاملہ ہو، اس میں اگر فریقین کے درمیان معاہدہ ہو جائے تو قانون کے مطابق متاثرہ فریق کو دیت دی جاتی ہے۔ یہ اس بل کا ایک پس منظر ہے جو اس ایوان میں ہمارے سابق سینیٹر کامران مرتضیٰ نے پیش کیا تھا۔ اس بل کے اصل متن میں یہ بات سامنے لائی گی تھی کہ دیت کے قانون کے بارے میں انصاف کا راستہ اختیار کیا جائے۔ ایک طرف وہ مظلوم ہے جس کو زخم لگے ہیں اور جس کو دیت ملنی ہے، دوسری طرف وہ مجرم ہے جو اس کا ذمہ دار ہے۔ اگر وہ وسائل رکھتا ہے اور دیت ادا کر دیتا ہے تو پھر کوئی قانونی مسئلہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر وہ دیت ادا نہیں کر تا تو اسے جیل میں جانا ہو تا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر مجرم فی الحقیقت وسائل کے باوجود دیت کی ادائیگی سے پہلو تہی کر رہا ہو تو اسے کوئی مدد نہیں ملنا چاہیے لیکن اگر وہ وسائل کی عدم دستیابی کے باعث ادائیگی سے معذور ہے تو اس کے لیے کوئی راستہ نکالا جائے۔

ہم نے اس بل میں تجویز کیا تھا کہ ایک ایسا فنڈ قائم ہو جس سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے کہ وہ دیت ادا کر سکیں۔ اس لیے کہ اسلام کا جو اصول عاقلہ ہے اس میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ ایسے حالات میں مقامی آبادی یا پھر ریاست اسے پورا کرے، یہ اس بل کا پس منظر ہے۔ اس پس منظر میں یہ بل کمیٹی میں آیا اور پھر کمیٹی نے اس معاملے کو اسلامی

---

[1] سینیٹر نیئر حسین بخاری نے ۴جون ۲۰۱۰ء کو سینیٹ آف پاکستان میں قانون فوجداری میں ترمیم (۲۰۱۰ء) کا بل پیش کیا تھا جس کے مطابق اسلام کے قانون قصاص و دیت میں ترمیم کی گئی تھی۔ یہ قوانین جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں اسلامی قوانین اور حدود کے نفاذ کے پیکیج میں شامل تھے۔ ۱۹۷۹ء سے ۲۰۱۰ء کے دوران قانون پر عملدرآمد کے دوران یہ شکل سامنے آئی کہ قتل خطا کے مقدمات میں بعض اوقات قاتل جس نے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا، مقتول کے ورثاء کی جانب سے دیت کے حوالے سے رضامندی کے باوجود دیت کی عدم ادائیگی کے سبب جیل میں رہتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں دیت کی ادائیگی کی ذمہ داری عاقلہ پر ہوتی ہے۔ یعنی قاتل کے لواحقین جس میں اس کا خاندان، گاؤں والے یا جہاں وہ کاروبار کرتا ہے وہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ پروفیسر خورشید احمد کی زیرِ نظر تقریر اس ترمیم پر بحث کے دوران کی گئی ہے۔

نظریاتی کونسل کو بھیجا تاکہ وہ شرعی نقطۂ نظر پوری طرح بیان کر دے۔ میرے علم کی حد تک کمیٹی کے سامنے اس کے بعد یہ چیز نہیں آئی، گو کمیٹی کے علم میں یہ بات بھی آئی تھی کہ یہ ایک ایسا اہم مسئلہ ہے کہ اسے کسی رکن کے نجی بل کی بجائے ایک سرکاری بل بنایا جائے گا۔ ہم نے کہا تھا کہ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تاہم کمیٹی کی اس رپورٹ کو اس بل میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس میں وہ توازن نہیں ہے جس کا تقاضا اصل بل میں یا کمیٹی نے کیا تھا کہ فریقین میں سے جو مجبور ہے اس کی مدد ہونی چاہیے۔

بل کے اصل مقصود کو نظر انداز کر کے یہ بات کہ دیت کی ادائیگی کی مدت تین سال کی بجائے پانچ سال کر دی جائے، یا یہ بات کہ دیت کی مجموعی رقم کی ادائیگی کے لیے قسطوں کی مدت بڑھا دی جائے اور یہ کہ مجرم کو پیرول پر رہا کر دیا جائے، اور اسی طرح یہ بات کہ تحفظ کے ساتھ ضمانت بھی ہو اور ضمانت میں گویا اس کے لیے کوئی ضمن اور جائیداد بنیاد نہیں ہو گا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ آپ دراصل متاثرہ فریق کے حق کو ہلکا کر رہے ہیں اور صرف ایک پارٹی کو مدد دے رہے ہیں، دوسری پارٹی کو نہیں دے رہے ہیں جو اس سے زیادہ مجبور و مظلوم ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ اسے ایک بار پھر کمیٹی کے حوالے کریں تاکہ اس پر دوبارہ غور ہو اور اسلامی نظریاتی کونسل کی جو سفارشات ہیں انھیں سامنے رکھ کر اسے بہتر کیا جائے۔ اس قانون کے مقاصد سے ہمیں اتفاق ہے، ہم نے اس کا آغاز کیا تھا، یہ اپوزیشن کی طرف سے پیش ہوا تھا لیکن جس شکل میں یہ آیا ہے اس پر نہ صرف یہ کہ ہمارے نقطۂ نظر کو مناسب طریقے سے شامل نہیں کیا گیا بلکہ شریعت کے جو تقاضے ہیں وہ بھی پورے نہیں کیے گئے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حکومت اس پر نظر ثانی کرے، یہ مسئلہ حکومت یا اپوزیشن کا نہیں ہے بلکہ ایک قومی اور انسانی مسئلہ ہے، اسے انصاف کے تقاضوں کے تحت طے ہونا چاہیے۔

[حکومت نے اس موقع پر ترمیم کرتے ہوئے قاتل کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے ترامیم تجویز کر دیں جس پر پروفیسر خورشید احمد اور کئی سینیٹرز نے تنقید کی اور بل کو دوبارہ اسلامی

نظریاتی کونسل بھیجنے کا مطالبہ کیا تاکہ اس کی رائے حاصل کی جاسکے۔ لیکن حکومت نے اسی اجلاس میں بل کو سینیٹ کے قواعد کے مطابق اکثریت کی بنیاد پر منظور کرالیا۔ قبل ازیں یہ بل قومی اسمبلی سے بھی منظور ہو چکا تھا۔]

(۴جون ۲۰۱۰ء)

باب نمبر ۵

امن وامان کی صورتِ حال اور حکومتی ذمہ داری

- ۱ -

اپریل ۲۰۰۵ء میں سینیٹ آف پاکستان کا اجلاس حزبِ اختلاف کی درخواست پر بلایا گیا تھا جس میں ملک کی سیاسی، معاشی اور امن و امان کی صورتِ حال پر غور کیا گیا۔ ۲۶ اپریل کو سینیٹر پروفیسر خورشید احمد کی تحریک پر ملک میں امن و امان کی صورتِ حال پر تفصیلی بحث ہوئی جس میں تمام ہی جماعتوں کے نمائندوں نے حصہ لیا اور بلوچستان، کراچی، گلگت، پنجاب اور اندرون سندھ تقریباً تمام ہی علاقوں میں قتل، بم دھماکوں، چوری، ڈکیتی، اغواء، کار چوری اور دیگر جرائم کی نشاندہی کی گئی اور ان جرائم میں سماج دشمن عناصر اور پولیس کے کردار پر روشنی ڈالی گئی۔ وزیر داخلہ جناب آفتاب احمد خان شیر پاؤ نے بحث کے اختتام پر امن و مان کی بہتری کے لیے حکومتی اقدامات کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت پولیس ریفارم اور لیگل ریفارم لا رہی ہے اس کے علاوہ ضلعی، صوبائی اور قومی سطح پر نیشنل پولیس کمیشن اینڈ کمپلینٹ اتھارٹی قائم کی جارہی ہے جس سے امن و امان سے متعلق عوام کو درپیش مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر خورشید احمد نے زیرِ نظر تقریر میں محرک کی حیثیت سے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر جامع انداز میں جائزہ پیش کیا ہے۔

جان ومال کا تحفظ ریاست کی بنیادی ذمہ داری: جناب چیئرمین! اس تحریک کے سلسلے میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ کسی بھی مہذب معاشرے اور کسی بھی ریاست میں مہذب معاشرے کو قائم رکھنے اور منضبط کرنے کا جو نظام ہے اس میں پہلی اور سب سے اہم ذمہ داری جان اور مال کا تحفظ ہے۔ اور یہ ذمہ داری جان ومال کے تحفظ کے ساتھ قانون کی حکمرانی اور معاشرے کو فساد، ظلم، ناانصافی اور حقوق کی پامالی سے بچانے سے عبارت ہے۔ جناب چیئرمین! میں آپ کی توجہ

مبذول کراؤں گا کہ جہاں تک اسلامی فکر کا تعلق ہے ہمارے سامنے یہ پسِ منظر ہے کہ فرشتوں نے تخلیق آدم کے وقت اس اضطراب کا خالق کائنات کے سامنے اظہار کیا تھا کہ کیا آپ ایک ایسی مخلوق بنارہے ہیں جو زمین پر فساد پھیلائے گی۔ تو زمین و آسمان کے خالق نے جواب دیا کہ جو تم نہیں جانتے، بے شک میں جانتا ہوں کہ میں یہ کیوں بنارہا ہوں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ (البقرۃ ۲:۳۰)

پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ ”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں“ انہوں نے عرض کیا: ”کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں“۔ فرمایا: ”میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے“۔

بنیادی مسئلہ، فلاح اور فساد کا ہے۔ امن اور سلامتی کے مقابلہ میں ظلم اور جان و مال کے عدم تحفظ کا ہے۔ اسلام نام ہے حقوق کی پاسداری کا اور فساد نام ہے حقوق کی پامالی کا۔ جس معاشرے میں حقوق کا احترام ہو وہ ایک مہذب اور اس معنی میں اسلامی معاشرہ ہے اور جس معاشرے میں حقوق کا احترام نہ ہو وہ فساد پر مبنی معاشرہ ہے۔ اس لیے آپ دیکھیے کہ قرآن پاک نے مکہ مکرمہ کی جو خصوصیات بیان کیں وہ یہ کہ:

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳ۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴ۧ (قریش ۱۰۶:۳-۴)

ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔

تو ایک مہذب معاشرہ وہی ہے جس میں ایک طرف خوف نہ ہو بلکہ امن ہو، جان

اور مال، عزت اور آبرو کا تحفظ ہو اور دوسری طرف تمام انسان اس لائق ہوں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں شریک ہو سکیں۔ اگر کچھ افراد بھوک میں مبتلا ہیں، اپنی ضروریات زندگی کو پورا نہیں کر سکتے ہیں تو پھر وہ معاشرے کی دوڑ میں شریک نہیں ہو سکتے اور یہ انسانی مساوات اور انسانی اکرام کے خلاف ہے۔ یہ ہے اس کی بنیاد۔

لیکن جنابِ والا! ہمیں بڑے دکھ سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ پاکستان میں اور خاص طور پر موجودہ دور میں قانون اور نظم و ضبط دونوں مفقود ہیں۔ میں آپ کی توجہ اس جواب کی طرف دلاؤں گا جو کل میری عدم موجودگی میں وزیر داخلہ نے میرے ایک سوال کے جواب میں دیا[1]۔ اس آئینے میں آپ آج کے پاکستان کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ہم بڑے بڑے بیانات دیتے ہیں کہ ہم نے پاکستان کی تصویر ٹھیک کر دی ہے۔ جنابِ والا! پاکستان کا تاثر تقریروں سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ بیرونی دوروں پر کروڑوں روپے خرچ کر کے بھی نہیں بن سکتا۔ یہ تاثر صرف اسی وقت بہتر بن سکتا ہے جب آپ یہاں امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہوں اور یہاں شرف انسانیت، انسانوں کو حاصل ہو۔ لیکن اس دور میں یہاں انسانوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وزیر داخلہ نے جن چھ سالوں کے اعداد و شمار دیے ہیں وہ ۶ سال وہ ہیں جسے آپ نظم و ضبط کا دور کہتے ہیں اور جس میں آپ (جنرل مشرف) اس بنیاد پر اس حکومت پر قابض ہوئے تھے کہ حالات خراب ہو گئے ہیں اور امن و امان اور نظم و ضبط موجود نہیں ہے۔ اسی ضمن میں مثال دیتے ہوئے آپ کا کہنا تھا کہ حتّٰی کہ "میرے جہاز اور جہاز کے باقی سفر کرنے والوں کو اغوا کیا جا رہا ہے"۔ آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ "ہم اس لیے آ رہے ہیں تا کہ جان و مال کا تحفظ ہو"۔

جنابِ والا! حقیقت یہ ہے کہ ملک میں جان، مال، آبرو، عزت کا تحفظ باقی نہیں ہے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اگرچہ جمہوریت ہماری نگاہ میں سب سے زیادہ صحت مند اور

---

[1] وزیر داخلہ نے بتایا کہ پچھلے چھ سالوں میں ۶۶۱۹۵ افراد قتل ہوئے۔ عصمت دری کے ۱۲۸۹۸ واقعات ہوئے۔ اغواء کے ۵۰۱۸۰ واقعات ہوئے۔ شاہراہوں پر لوٹ مار کے ۱۴۸۷ واقعات ہوئے۔ کارچوری کے ۱۸۲۵۸ واقعات ہوئے۔ چوری کے ۳۸۶۲۹۷ واقعات ہوئے اور بچوں کے اغواء اور بچوں کے ساتھ زیادتی کے ۱۰۳۵ واقعات ہوئے۔ ان سب جرائم میں پنجاب سر فہرست تھا۔ اسلام آباد جو وفاقی دارالحکومت ہے، یہاں بھی امن اور جان و مال کا تحفظ کسی طرح مثالی نہیں ہے۔

مناسب سیاسی نظام ہے لیکن فوجی حکمران کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ اس میں نظم وضبط کی کمی ہے۔ فوج اس لیے آتی ہے کہ نظم وضبط قائم ہو، لا قانونیت نہ ہو، قانون سے انحراف نہ ہو لیکن اس ملک میں فوجی حکمرانوں کے جو دور رہے ہیں اور خاص طور پر موجودہ دور (جنرل مشرف کا دور) اس میں قتل وغارت گری، جان ومال کا تحفظ اور زبوں حالی سب سے زیادہ آگے بڑھی ہے۔ ایک پرانا شعر ہے کہ ؎

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے، وہی مال ندارد

لا قانونیت اور امن وامان کی خرابی کے اسباب

فوج جسے امن وامان اور قوت کے ذریعہ سے امن قائم کرنے کا سب سے زیادہ اہل سمجھا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کے دور میں یہ سب سے زیادہ پامال ہوا ہے اور سب سے زیادہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ذرا اس بات پر غور کرنے کی دعوت دوں کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟

دستور کی پامالی: میری نگاہ میں اس کی سب سے پہلی وجہ معاشرے میں دستور کا احترام نہ ہونا ہے۔ جس کا دل چاہے، دستور کو توڑ دے اور پھر توڑنے کے بعد دستور کا آرٹیکل ٦ سوتا رہے[1] اور کسی کی گرفت نہ ہو۔ اس کے برعکس عدالتیں بھی قانونِ ضرورت کے تحت دستور توڑنے

---

[1] آرٹیکل ٦۔ سنگین غداری: (ا) کوئی بھی شخص جو طاقت کے استعمال یا طاقت سے یا دیگر غیر آئینی ذریعے سے دستور کی تنسیخ کرے، تخریب کرے یا معطل کرے یا التواء میں رکھے یا اقدام کرے یا تنسیخ کرنے کی سازش کرے یا تخریب کرے یا معطل یا التواء میں رکھے سنگین غداری کا مجرم ہو گا۔

(٢) کوئی شخص جو شق (ا) میں مذکورہ افعال میں مدد دے گا یا معاونت کرے گا یا شریک ہو گا اسی طرح سنگین غداری کا مجرم ہو گا۔

(٢)(الف)۔ شق (ا) یا شق (٢) میں درج شدہ سنگین غداری کا عمل کسی بھی عدالت کے ذریعے بشمول عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔

(٣) مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) بذریعہ قانون ایسے اشخاص کے لیے سزا مقرر کرے گی جنہیں سنگین غداری کا مجرم قرار دیا گیا ہو۔

والوں کو سند جواز عطا کریں، یا کم از کم توثیق کر دیں تو اس کے اثرات کا سلسلہ تو بہت دور تک جاتا ہے۔ اور در حقیقت یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء سے بلکہ عملاً اس سے بھی قبل ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا ہے اور آج تک جاری ہے۔ چنانچہ دستور کی پامالی اور دستور کی خلاف ورزی سب سے پہلی چیز ہے جس کی بنا پر اس ملک میں قانون اور جان و مال کے تحفظ کی روایت پامال ہو گئی ہے۔

قانون کی برابری کا فقدان: جنابِ والا! دوسری چیز قانون کے سامنے سب کی برابری ہے۔ قانون کو انصاف کی بنا پر اندھا کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ امیر و غریب میں، بااثر اور بے اثر میں فرق نہیں کرتا، سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ پولیس وی وی آئی پیز (VVIPs) کے تحفظ میں لگی ہوئی ہے اور عام انسان کو اس سے کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ ہم اسلام کا نام لیتے ہیں لیکن کیا ہمارے سامنے نبی پاک ﷺ کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ جب ایک بہت بڑے سردار کی بیٹی فاطمہ نام کی ایک خاتون نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹنے کا معاملہ آیا تو اس خاندان میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے کوشش کی کہ حضور پاک ﷺ تک سفارش پہنچائیں۔ حضور اکرم ﷺ کو سب سے زیادہ عزیز جو صحابی تھے حضرت اسامہؓ بن زید جو نوجوان بھی تھے انہوں نے انہیں راضی کیا کہ آپ حضور ﷺ سے سفارش کریں۔ جب انہوں نے سفارش کرنے کی ہمت کی تو حضور اکرم ﷺ فرمایا کہ :"قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! اگر (بالفرض) فاطمہ بنت محمد ﷺ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا" (ترجمہ سنن نسائی، حدیث ۴۹۰۷)۔ یہ تھا تصور انصاف۔ جب انصاف اس طرح ہو گا تو پھر ظلم ختم ہو گا، پھر قتل، چوریاں اور ڈاکے ختم ہوں گے اور پھر لوگوں کو تحفظ ملے گا۔

آج معاملہ یہ ہے کہ بڑوں کے لیے قانون اور ہے اور عام آدمی کے لیے قانون اور۔ آج جو حالت ہے وہ اسی لیے ہے کہ معاشرے کے اندر قانون پر اعتبار اور اس کا احترام برقرار نہیں رہا ہے اور ان چیزوں کے لیے بلاشبہ اولین ذمہ داری حکومت کی ہے۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ حکومت کے ادارے آج قانون کی حکمرانی اور انصاف کی فراہمی

کی بجائے، قانون توڑنے اور ظلم کی پشت پناہی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

پولیس کا کردار: آج پولیس سب سے زیادہ کرپٹ ہے۔ رائے عامہ کے جتنے سروے ہوئے ہیں ان میں لوگوں نے سب سے زیادہ ناپسندیدگی کا اظہار پولیس کے بارے میں کیا ہے حالانکہ پولیس تو دراصل قانون کی حفاظت اور مظلوم کی حفاظت کے لیے تھی۔ زیادتی یہ ہے کہ ظلم تھانوں میں بھی ہو رہا ہے۔ جس قسم کے واقعات سے روز اخبار بھرے پڑے ہیں انھیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پولیس کی اصلاح ممکن ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال موٹروے پولیس ہے جس کے بارے میں اوراب اسلام آباد میں ٹریفک پولیس کے بارے میں بھی سب کہتے ہیں کہ اس کی کارکردگی میں باقی پولیس کے مقابلے میں نمایاں فرق ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر قانون صحیح صحیح بنایا جائے، اس پر ٹھیک طریقے سے عمل ہو، آپ مناسب ترغیبات دیں، صحیح بھرتی اور صحیح تربیت ہو اور نگرانی کا کوئی انتظام ہو تو اس ملک میں پولیس بھی صحیح کردار ادا کر سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ نہیں ہو رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پولیس کی بھرتی سفارش پر ہوتی ہے۔ وزیر ہو، وزیر اعلیٰ ہو، وزیر اعظم ہو، رکن پارلیمنٹ ہو اور یا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی پسند کا تھانیدار لگے جو ان کے کہنے پر کام کرے، ان کے لوگوں کو پناہ دے اور جن سے وہ خفا ہیں ان کے پیچھے پڑے۔ پھر رشوت، اندرونی کرپشن اور نظم و ضبط میں کمی ہے۔ انصاف کی کمی کا تو پولیس سب سے بڑا ادارہ بن گئی ہے جس کی بناء پر ملک میں لاقانونیت کو فروغ مل رہا ہے۔

اجتماعی شعور میں کمی: جنابِ والا! انصاف کے ضمن میں، میں یہ کہوں گا کہ اس کے ساتھ ساتھ میں اور آپ ہم سب ہی ذمہ دار ہیں، ہمارا تعلیمی نظام ذمہ دار ہے۔ ہمارے امام اور معلم ذمہ دار ہیں۔ ماں باپ ذمہ دار ہیں کیونکہ قانون کے احترام کی تعلیم گھر سے شروع ہوتی ہے۔ امام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جمعہ میں تلقین کرے اور جہاں دینی اقدار اور احکام بیان کرے، وہاں ایک مہذب اسلامی معاشرے کی جو ضروریات ہیں ان کو بھی بیان کرے اور

لوگوں کے اندر خیر وشر کے درمیان تمیز کا جذبہ پیدا کرے۔ ہم اس قسم کے موضوعات جن میں ایک دوسرے کی تخفیف و تذلیل ہو ان پر وقت صرف کرتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں نظم وضبط، قانون کا احترام اور قرآن و سنت کے احکام کے مطابق مہذب فلاحی معاشرہ بنانے کے جو عوامل ہیں ان کی فکر نہیں کرتے۔

تعلیم کو دیکھیے۔ ہم بچوں کو یہ پڑھاتے ہی نہیں ہیں کہ ڈسپلن کیا ہے اور اس کا احترام کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہے۔ گھر پر نظر ڈالیے جہاں اولاد یہ دیکھتی ہے کہ ماں باپ جھوٹ بول رہے ہیں، انہیں سگریٹ پینے سے منع کرتے ہیں اور خود سگریٹ پیتے ہیں۔ اگر مثال یہ ہو گی تو پھر کیسے کام چلے گا۔ چنانچہ حکومت اور موجودہ حکمرانوں، خاص طور پر فوجی قیادت نے چھ سال تک پورے نظام کو اپنے گرفت میں لینے کے بعد دستور، قانون اور قواعد وضوابط کا جس طرح خون کیا ہے اور یوں ہم ان کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں، یا جہاں میں پولیس کو ذمہ دار قرار دیتا ہوں، اور عدلیہ کا بھی اس میں کردار سمجھتا ہوں وہیں میں ایک عام شہری کو اور خود اپنے آپ کو بری نہیں کر رہا ہوں۔ جنابِ والا! میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ بہت گھمبیر ہے اور بہت بنیادی ہے۔ یہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اس ملک، معاشرے اور اس قوم کو اور اس کے کروڑوں انسانوں کو حقوق اور ذمہ داری کی بنیاد پر اپنی زندگی گزارنے کے لائق بنانے کا مسئلہ ہے۔ اس بناء پر جنابِ والا! میں آپ سے عرض کروں گا کہ حکومت کو اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے اور پارلیمنٹ کو اس معاملے پر سوچنا چاہیے۔

قانون سازی میں غیر سنجیدگی: جنابِ والا! ہم قانون بناتے ہیں لیکن اس قانون کا احترام نہیں کرتے جس کی ایک وجہ قوانین کی تشکیل میں کمزوریاں بھی ہیں۔ ابھی میں قائد ایوان سے بات کر رہا تھا کہ آپ یہ جو نیا قانون لا رہے ہیں اس میں آپ نے گنجائش رکھی ہے کہ پندرہ دن کے اندر مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہو گا اور تین مہینے سے زیادہ کوئی مقدمہ نہیں چلے گا۔ مجھے یہ بتایئے کہ کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ موجودہ نظام کے اندر اس قانون پر عمل ہو سکے۔ وہ قانون بنایئے جس پر عمل ہو سکے اور اگر قانون بنایا ہے تو اس کی تنفیذ کے لیے تمام

ضروری اقدامات کیجیے اور عمل کرا کر دکھایئے۔ اگر آپ عمل نہیں کرائیں گے تو اس کے بعد ہر قانون غیر مؤثر ہو کر رہ جائے گا۔ درحقیقت آج یہی کیفیت ہے کہ قوانین موجود ہیں لیکن غیر مؤثر ہیں۔

کیا کیا جائے؟

یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ سب سے اہم ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو اقتدار میں ہیں اور جن کے پاس اختیارات ہیں۔ جتنی اچھی مثال وہ قائم کریں گے اتنے ہی حالات بہتر ہوں گے۔ جتنی خراب مثال وہ قائم کریں گے اتنے حالات بگڑیں گے۔ مشہور مقولہ ہے کہ رعایا حکمرانوں کی پیروی میں چلتی ہے جب تک آپ قیادت کا معیار اور انداز تبدیل نہیں کرتے صورتحال بہتر نہ ہو گی۔ بلاشبہ تعلیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے اسی طرح عدلیہ اور دوسرے اداروں کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے، لیکن اولین ذمہ داری حکومت اور اصحاب اقتدار کی ہے۔ اس کے بغیر ہم اپنے حالات اور تاثر کو درست نہیں کر سکتے۔

سچی بات یہ ہے کہ ملک میں اقتصادی و معاشی ترقی اور سرمایہ کاری کی آپ باتیں کرتے ہیں لیکن کیا امن و امان کے بغیر اس حوالہ سے کوئی پیش رفت ممکن ہے؟ ہم ابھی بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ اس دورے کے دوران، یقین مانیئے جب وہاں مختلف حکومتی ذمہ دار لوگوں سے سرمایہ کاری کی بات ہوئی تو انہوں نے ہمارے ملک میں امن و امان کی صورتحال خراب ہونے کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہا آپ کے ملک میں ہر سطح پر کرپشن ہے۔ جب تک یہ دونوں خرابیاں دور نہیں ہوتیں، آپ یہ خیال ترک کر دیں کہ باہر سے سرمایہ بڑی تو کیا کم مقدار میں بھی آئے گا۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے اور ہمیں حقائق کا سامنا کرنا ہو گا۔

اس لیے جنابِ والا! میں پوری دردمندی سے یہ بات کہوں گا کہ لاقانونیت، امن و امان کی زبوں حالی اور جس دھماکہ خیز شکل میں ہر جگہ پر کرپشن ہو رہی ہے اس کو برداشت کرنا میری نگاہ میں غداری سے کم نہیں۔ اگر یہ ملک ترقی کر سکتا ہے تو اس وقت جب ہم دستور اور

قانون کا احترام کریں تمام ادارے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ادا کریں اور ملک کے تمام عناصر اس بات کی کوشش کریں کہ نہ صرف اپنے رویئے کو بہتر بنائیں بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کو اس لائق بنائیں کہ وہ پاکستان کی امانت کے صحیح امین بن سکیں۔ یہ ہے وقت کی فوری ضرورت، اور میں سمجھتا ہوں کہ سینیٹ اگر پوری قوم کی اور خصوصیت سے حکومت کی توجہ اس بنیادی مسئلے کی طرف مرکوز کراتی ہے تو وہ ایک بڑی اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔

اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آج قتل، زنا، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور بچوں کے اغواء کے واقعات جس طرح ہو رہے ہیں، یہ شرمناک ہے۔ یہ اس ملک کو تباہی کی طرف لے جانے والا طریقہ ہے۔ اس کو روکنا ضروری ہے۔ اس میں سب سے بڑی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ جب تک حکومت بہتر مثال نہیں پیش کرے گی، خود قانون کا احترام نہیں کرے گی اور صدر سے لے کر ایک عام فرد تک اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کریں گے تب تک یہ صورتِ حال بہتر نہیں ہو سکتی۔ اس ملک میں جن افراد کے اوپر قیادت کی ذمہ داری ہے انہوں نے دستور کو توڑا ہے، بدعہدیاں کی ہیں، اپنی ذات کو ہر چیز سے بالا رکھا ہے، چاہے دکھاوے کے لیے 'سب سے پہلے پاکستان' کا نعرہ لگایا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے سامنے 'سب سے پہلے اپنی ذات' سے ہٹ کر کوئی اور چیز نہیں ہے اور یہ بنیادی بات ہے۔ آیئے اس رویے کو بدلیں تاکہ اس ملک کو صحیح معنوں میں پاکستان بنا سکیں۔ (۲۷ اپریل ۲۰۰۵ء)

- ۲ -

زیرِ نظر تقریر کا پسِ منظر یہ ہے کہ سینیٹر سعدیہ عباسی اور بعض دیگر سینیٹر صاحبان نے اپنی تقاریر میں بتایا کہ پارلیمنٹ کی عمارت تک پہنچنے کے لیے انہیں پولیس اور رینجرز کی رکاوٹوں سے گزرنا ہوتا ہے جہاں روزانہ ان سے شناخت پوچھی جاتی ہے۔ ان کے بقول بعض اوقات پارلیمنٹ کے اراکین تک کو یہ کہہ کر آنے نہیں دیا جاتا کہ وزارتِ داخلہ نے ایسے احکامات دیے ہیں۔ اس کے علاوہ جو لوگ اسمبلی یا سینیٹ کی کارروائی دیکھنے کے لیے اجازت نامے لے کر آتے ہیں انہیں روک لیا جاتا ہے۔ دوسری جانب سینیٹر کامران مرتضیٰ نے بتایا کہ مختلف متاثرین اپنے مطالبات کے سلسلے میں ڈی چوک پر پرامن طور پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ان پر حفاظتی فورسز نے بندوقیں تانی ہوئی ہیں۔

جنابِ والا! ہم تو (پیپلز پارٹی کی) موجودہ حکومت سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کا رویہ کم از کم ان لوگوں (جنرل مشرف) سے مختلف ہوگا جو پچھلے آٹھ سال سے حکمران تھے۔ لیکن ہمیں دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک اس بات کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ اس لیے میں اپنی آواز اپنے دونوں بھائی اور بہن سینیٹر سعدیہ عباسی کی آواز میں شامل کرنا چاہتا ہوں اور بڑے ادب سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ سیکورٹی کا انحصار اسلحہ بردار محافظوں اور خاص طور پر پارلیمنٹ کے باہر اس طرح کی مورچہ بندی پر نہیں ہے۔ یہ جمہوری روایات کے بھی خلاف ہے اور یہ بڑا غلط تاثر دیتی ہے۔ مجھے بار بار اس بات کا تجربہ ہوا جس کا تذکرہ میری بہن نے بھی کیا ہے۔ ہمیں یہ معاملہ ایوان میں اٹھاتے ہوئے بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ ہم اس طرح خود ہی اپنے ملک کے حالات پر نوحہ کرتے ہیں۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ اس معاملے میں حکومت ایک واضح رویہ اختیار کرے۔ سیکورٹی کی جہاں ضرورت ہے وہاں کرے لیکن اس طرح طاقت اور اختیار کی نمائش اور اس طرح بندوقیں مظاہرین کی طرف تان کر کھڑے ہونا کوئی اچھا پیغام نہیں ہے۔ اس رویے کو بدلے بغیر آپ فضا کو تبدیل نہیں کرسکتے۔

جنابِ والا! اس وقت ایوان امن و امان کے مسئلے پر گفتگو کر رہا ہے اور یہ مسئلہ ایسا ہے جو ایک مدت سے ہمیں چمٹا ہوا ہے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی نہ ہی قوم اور نہ ہی ایوان اس مسئلے سے اپنے آپ کو علیحدہ کر پا رہا ہے اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ جان، مال اور عزت تینوں کی عدم سلامتی کا جو عالم اس وقت ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں رہا۔ جنابِ والا! آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ کوئی مہذب معاشرہ اور کوئی حکومت جو اپنے شہریوں کو جان، مال اور عزت کی ضمانت اور حفاظت نہ فراہم کرسکے اس کے قائم رہنے کے لیے کوئی جواز نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ اسلام کا مسلمہ اصول ہے۔ انصاف کا قیام جان، مال اور عزت کے تحفظ سے عبارت ہے اور اسلامی ریاست کے اولین اور بنیادی اوصاف میں سے ایک ہے۔ دوسری جانب یونان کی سیاسی فکر سے لے کر آج تک کے افکار کو آپ دیکھ لیں، ریاست کے لیے سب سے اہم چیز اپنے شہریوں کی جان، مال اور عزت کا تحفظ ہے اور آج یہ

میسر نہیں ہے۔ کسی بھی دن کا اخبار اٹھا کر دیکھ لیں کوئی، شہر، کوئی علاقہ، کوئی صوبہ ایسا نہیں کہ جہاں دلخراش واقعات رونما نہ ہو رہے ہوں۔ حتّٰی کہ آپ کو معلوم ہے کہ لوگ مجبور ہو کر، جسے ہجوم کا قانون ہاتھ میں لینا کہتے ہیں، اس حد تک جانے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

جنابِ والا! یہ لاقانونیت، افرا تفری، عزت اور انسانی احترام اور جان کی ارزانی، کسی ایک پارٹی کا مسئلہ نہیں ہے، نہ ہی یہ محض کسی حکومت کا مسئلہ ہے، یہ قومی مسئلہ ہے۔ اس بات کی توقع تھی کہ نئی حکومت اسے اوّلیت دے گی۔ لیکن میں دکھ سے یہ بات کہتا ہوں کہ گزشتہ آٹھ سالوں میں جو مسائل پیدا ہوئے تھے، دو مہینے گزرنے کے باوجود اب تک اس حکومت کی طرف سے کوئی سنجیدہ کوشش حالات کو سنبھالنے، بگاڑ کو روکنے اور لوگوں کے اعتماد کو بحال کرنے کی نہیں ہوئی اس معاملہ میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عدل اور نظام عدل پر لوگوں کا بھروسہ اور اعتماد ہو۔ جب تک آپ یہ پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک امن وامان کی گاڑی اپنی پٹڑی پر نہیں آسکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ یوسف رضا گیلانی صاحب نے وزیر اعظم بننے سے پہلے اور قائد ایوان منتخب ہونے کے بعد، اعلیٰ عدالتوں کے ان ججوں کی، جنہیں آزادی سے محروم کر دیا گیا تھا اور وہ گھروں میں گرفتار تھے، آزادی کا اعلان کیا۔ مزید خوشی کی بات ہے کہ ابھی انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کا حلف نہیں لیا تھا لیکن اس اعلان پر عمل ہوا۔ لیکن حلف لینے کے بعد جو وعدہ انہوں نے، ان کی پارٹی نے، مخلوط اتحاد میں شریک تمام پارٹیوں نے کیا اور سب سے زیادہ اہم بات یہ کہ ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کو عوام نے جس بات کا واضح مینڈیٹ انھیں دیا تھا وہ کام انہوں نے آج تک نہیں کیا ہے۔ ابھی تک چیف جسٹس اور اعلیٰ عدلیہ کی بحالی کو التواء میں ڈالا جارہا ہے۔ اسے دستوری پیکیج سے جوڑ کر میری نگاہ میں ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی کی جارہی ہے اس سے لاقانونیت فروغ پارہی ہے اور یہ ملک میں قانون کی بحالی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

دوسری بات جنابِ والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانون کے احترام کے لیے ضروری ہے کہ جو جتنا ذمہ دار سطح پر اور جتنا بااختیار ہے، جتنا حکومت میں اس کا مقام اونچا ہے اتنا ہی وہ قانون کا پابند ہو۔ اگر اوپر والے قانون توڑیں گے تو نیچے والے اس کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ اس لیے

میری نگاہ میں لاقانونیت کو فروغ دینے میں بہت بڑا احتمال اس بات کا ہے کہ دستور کی پابندی نہ کی جائے۔ دستور کا ہم حلف اٹھاتے ہیں لیکن اسے نظر انداز اور پامال بلکہ عملاً پرزہ پرزہ کرتے ہیں۔ پھر عدالتیں اس کے لیے توثیق کے فتوے جاری کر دیتی ہیں۔ جس ملک میں دستور اور قانون کو توڑنا اوپر والوں کا رواج بن جائے تو پھر نیچے والوں سے ہم کیا گلہ کریں گے۔

تیسری بات جنابِ والا! میں یہ کہوں گا کہ اس رویہ کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہوا، اب ہم قانونِ ضرورت کی بنیاد کے اوپر اس پر مہر تصدیق ثبت نہ کریں۔ بلکہ ایک فیصلہ کرلیں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ آئندہ جس نے دستور کو توڑا، جس نے اس کی تائید کی اور جس نے اس کا جواز فراہم کیا، وہ سب لوگ قومی مجرم ہوں گے جو لوگ اس وقت موجود ہیں اور انھوں نے ماضی میں یہ کام کیا ہے، انہیں بھی قانون کی گرفت میں آنا چاہیے۔ آپ یہ راستہ اختیار کریں تو پھر آپ دیکھیے کہ اوپر سے نیچے تک قانون کیوں نافذ نہ ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے صاحبزادے کو کوئی رعایت نہ دی تھی بلکہ ان پر حد لاگو کی تھی[1]۔ جب آپ یہ مثال قائم کریں گے تب قانون کی حکمرانی قائم ہوگی اور تب جان ومال کا تحفظ ہوگا۔ اگر اوپر والے قانون توڑیں اور یہ سمجھیں کہ نیچے قانون نافذ ہو سکتا ہے تو اس سے بڑی حماقت اور اس سے بڑا دھوکہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس لیے جنابِ والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عدلیہ کی بحالی، دستور اور قانون کا احترام اور اس معاملے میں جو زیادہ اہم مقام پر ہیں، خاص طور پر برسر اقتدار افراد اور اس ایوان کے

---

[1] حضرت عبدالرحمٰن اوسط سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد میں سے تھے جن کی کنیت ابو شحمہ تھی وہ بہ سلسلۂ جہاد مصر تشریف لے گئے تھے ایک رات انھوں نے نبیذ پی لی کہ جس کا پینا فی نفسہ تو جائز ہے البتہ اگر اس میں نشہ پیدا ہو جائے تو پینا جائز نہیں ہوتا جو نبیذ حضرت ابو شحمہ نے پی اتفاقاً اس میں نشہ پیدا ہو گیا تھا جب پینے کے بعد نشہ ہو گیا (تو خوف آخرت اور اللہ پاک سے ڈر اور تقوی کی وجہ سے) امیر مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس جاکر خود درخواست کی کہ میرے اوپر نشہ آور نبیذ پینے کی حد جاری کر دیجیے انھوں نے اپنے گھر میں ان پر حد جاری کی یہ بات جب امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو ملامت کی کہ آپ نے گھر میں حد کیوں جاری کی یہ حد تو جہاں عامۂ مسلمین پر جاری کی جاتی ہے اسی جگہ اور میدان میں ابو شحمہ پر جاری کرنا چاہیے تھا، کچھ عرصہ بعد جب ابو شحمہ حاضر خدمت ہوئے تو حضرت عمر فاروقؓ نے ان پر حد جاری فرمائی اور اس کے بعد اتفاقاً وہ بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں ان کی موت ہو گئی۔ (دارالافتاء دیوبند کی ویب گاہ سے)

ارکان کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے جنابِ والا! جب میں وزیر صاحب کی گاڑی کے تحفظ کے لیے ہونے والے اقدامات دیکھتا ہوں۔ ان کی جان ایک عام شہری سے زیادہ اہم نہیں پھر بھی ایک گارڈ آگے اور ایک گارڈ پیچھے ہوتا ہے، ٹریفک سگنل پر لال بتی ہوتی ہے لیکن ان کی گاڑی ہارن بجاتے ہوئے نکل جاتی ہے۔ یہ طرزِ عمل کس بات کی علامت ہے، ماضی والے یہ کر رہے تھے، آپ بھی یہی کر رہے ہیں۔ حد ہے کہ ججوں کی گاڑیاں آتی ہیں اور سرخ بتی پر نہیں رکتیں انہیں توڑتے ہوئے چلی جاتی ہیں۔ اگر آپ کا رویہ یہ ہو گا تو ملک میں قانون کی حکمرانی کیسے ہو گی۔

جنابِ والا! میں اگلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانون کو بھی وہ ہونا چاہیے۔ جس پر لوگوں کا اعتماد ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قانون سازی کے لیے بنیاد یہ ہے کہ وہ لوگوں کی مرضی پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جبر کی بنیاد پر نہیں بلکہ حق اور انصاف کی بنیاد پر اور خیر اور پسندیدگی کی بنیاد پر ہو۔ اسلام کا تو یہ کارنامہ ہے کہ اس نے جو شرعی قانون دیا ہے وہ کوئی جبر کی اور باہر کی چیز نہیں ہے۔ وہ قانون وہ ہے جس میں انسان کے لیے اللہ کی ہدایت ہے۔ قرآن اور سنت جس پر ہمارا ایمان ہے اور جسے ہم مانتے ہیں وہ اس کی بنیاد ہے۔ اسلامی تاریخ میں قانون کے احترام کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ قانون محترم تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس قانون کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری حاصل ہے، یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور یہ ہماری اپنی خواہش کی تکمیل ہے، یہ جبر نہیں ہے۔

جنابِ والا! کیا میں آپ کو یاد دلاؤں کہ دورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں جو حدود نافذ ہوئیں[1] ان میں تقریباً تمام شہادتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ اقرارِ جرم کی بنیاد پر نافذ ہوئیں۔ ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپ پاک کر دیجیے۔ اس لیے کہ مجھ سے جرم سرزد ہوا

---

[1] اہم بات یہ ہے کہ دورِ نبویؐ کے بعد بھی خلفائے راشدینؓ، خلفائے بنو امیہ، بنو عباس، خلفائے سپین، خلفائے مصر اور خلفائے ترکی کے اس پورے زمانے میں بیس سے زیادہ حدود کے ایسے مقدمات کو ریکارڈ نہیں کیا گیا ہے جو مجرم کے اپنے اقرار کے بجائے شہادت کی بنیاد پر نمٹائے گئی ہوں۔ (’اسلام کا قانونِ فوجداری- حدود شرعیہ‘ مصنف: پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز قرطبہ یونیورسٹی، پبلشر تفہیم دین اکیڈمی- حیات آباد پشاور، اشاعت ۲۰۲۰ء، صفحہ نمبر ۱۸۸)

ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے مالک کے پاس جاؤں اس حالت میں کہ اس جرم سے میرا دامن داغدار ہو[1]۔ یہ اخلاقی تربیت کی مثال ہے۔ جنابِ والا! میں بتانا چاہتا ہوں کہ قانون کا احترام اسی وقت ہو گا جب لوگوں کو یہ احساس ہو گا کہ قانون حق اور انصاف پر مبنی ہے اور یہ امیروں کو تحفظ فراہم کرنے اور غریبوں کو سزا دینے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اگر قانون میں یہ قبولیت نہیں ہو گی، پھر اگر آپ قانون بنا بھی دیں گے تو اس کا اطلاق نہیں ہو گا۔

اس کے ساتھ جنابِ والا! یہ بات ضروری ہے کہ ہمارے قوانین کا جائزہ لیا جائے۔ جو قوانین بنیادی حقوق کے خلاف ہیں، قرآن و سنت اور دستور کے خلاف ہیں انھیں تبدیل کیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دستور میں لکھا ہوا ہے کہ انسانی حقوق کے خلاف کوئی قانون دستور کے نفاذ سے دو سال کے بعد جاری نہیں ہو گا۔ یعنی دو سال کے لیے مہلت دی گئی تھی کہ ماضی کی خرابیوں کو دور کر لیا جائے۔ لیکن آج دستور کو بنے ہوئے پینتیس سال ہو گئے ہیں۔ انسانی حقوق اور آرٹیکل ۵، ۹ تا ۲۵ کے خلاف کتنے قوانین ہیں جو جاری ہوئے یا نئے بنائے گئے ہیں؟ دستور میں یہ لکھا ہوا ہے کہ دستور کے بننے کے پانچ سال کے اندر اندر تمام قوانین کو قرآن و سنت سے ہم آہنگ کر دیا جائے گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے چار ہزار قوانین کا جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا کہ ان میں سے کون سے قرآن و سنت سے متصادم ہیں کون سے نہیں۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے اس پارلیمنٹ نے آج تک اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کی کہ ان رپورٹوں کو سامنے رکھ کر کے قوانین کو تبدیل کرے۔

لاء ریفارمز کمیشن نے دو ہزار سے زائد قوانین کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ کن قوانین میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہ رپورٹس موجود ہیں لیکن پارلیمنٹ میں اور سب کچھ بحث ہوتی ہے قانون سازی نہیں ہوتی۔ جنابِ والا! ہمیں قانون کو بھی درست کرنا ہو گا اور قانون کو قرآن و سنت، ملک کے دستور، عوام کی توقعات اور امنگوں اور ان کے حقوق کے ساتھ

---

[1] ایضاً

ہم آہنگ کرنا ہو گا۔ تب اس قانون کا احترام ہو گا۔

جنابِ والا! اس کے ساتھ قانون کے نفاذ کی مشینری نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انتظامیہ، پولیس اور عدلیہ۔ یہ تین سب سے زیادہ اہم ادارے ہیں اور ان تینوں کا حال ایک سے بڑھ کر ایک بدتر ہے۔ آپ خیال کیجیے کہ پولیس اصلاحات کا نام لیا جاتا ہے لیکن پولیس اصلاحات کے نام پر پولیس کو انتظامیہ کے مزید تابع کر دیا گیا ہے۔ جو حکومت میں آتا ہے اس کی پہلی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ آئی جی، ڈی آئی جی، سپرنٹنڈنٹ حتّٰی کہ میرے علاقے کے تھانہ میں میرا نامزد کردہ آدمی ہو۔ حاصل اس سے کیا ہے؟ آپ اگر انتظامیہ اور پولیس کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ نظام تباہ ہو گا، ادارہ تباہ ہو گا اور اس کی ذمہ داری ہم سب پر آتی ہے۔ تھانہ کلچر والی بات آپ نے سنی ہو گی لیکن جنابِ والا! آج بھی ایک تھانے کو اپنے سارے مصارف خود پورے کرنے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے وہ تمام اقدامات کیے جاتے ہیں جن کی قانون اجازت نہیں دیتا۔

پولیس اصلاحات کے لیے اربوں روپے آپ نے دیے ہیں، نئی ٹیکنالوجی آپ نے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے لیکن بنیادی اسباب پر آپ نہیں گئے۔ اگر تھانیدار کو اپنا خرچہ پورا کرنے کے لیے مقامی لوگوں سے پیسہ لینا ہے۔ اگر افسروں کی آمد کے اوپر کھانا کھانے کے لیے اس کو اپنے علاقے کے بااثر افراد سے مرغیاں مانگنی ہوں تو انصاف کہاں ہو گا، جب تک آپ تھانہ کلچر کو درست نہیں کرتے جب تک آپ پولیس کی اصلاحات نہیں کرتے صورتِ حال بہتر نہیں ہو گی۔ ٹھیک ہے ان کی تنخواہ کا مسئلہ بھی ہے لیکن تنخواہ اصل چیز نہیں۔ درحقیقت یہ پورے کا پورا نظام اصلاح چاہتا ہے۔ خاص طور پر انتظامیہ کا پولیس کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ختم کرنا ہو گا۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ کوئی بھی حکومت اس سطح سے بلند نہیں ہو سکی کہ اس ملک میں نظام اور ادارہ درست ہو۔ ہم محض اپنے مفادات، اپنی پارٹی، اپنے دوستوں، اپنے قبیلے کے لوگوں کے لیے مراعات فراہم کرنے میں لگے رہے۔

جنابِ والا! میری نگاہ میں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ صرف اعداد و شمار کا معاملہ ہی نہیں

ہے۔ ہمارے دوست جو اعداد و شمار پیش کرتے ہیں وہ بالکل متعلقہ ہیں۔ میرے پاس بھی اعداد و شمار ہیں، میں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم توجہ مرکوز کریں ان بنیادی مسائل کی طرف اور وہ مسائل میری نگاہ میں عدلیہ کی بحالی، ذمہ دار افراد، خصوصیت سے صدر مملکت، وزیر اعظم، وزراء، چیف منسٹرز، ارکان پارلیمنٹ کی جانب سے قابل تقلید رویہ اختیار کرنا ہے۔ جب تک کہ یہ مثال قائم نہیں کریں گے اور خود قانون کا احترام نہیں کریں گے دوسروں سے قانون کے احترام کی امید رکھنا عبث ہے۔

اس طریقے سے جنابِ والا! قانون کی جو روح اور حیات ہے وہ قانون کی بالادستی، اس کی اصلاح اور پھر مشینری کی اصلاح میں ہے۔ جب تک یہ ساری چیزیں نہیں ہوتی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہم امن و امان کے بارے میں اسی طرح نوحہ کرتے رہیں گے، چیخ و پکار ہوگی لیکن حالات نہیں بدلیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ نئی حکومت اور یہ پارلیمنٹ اس بارے میں کوئی ذمہ داری ادا کریں اور ایک مثال قائم کریں۔ لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ اس حکومت کے اب تک کے آٹھ ہفتوں میں مایوسی اور بے اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے، ہماری دعا تھی اور ہماری کوشش تھی اور ہے، کہ مخلوط حکومت کامیاب ہو اور فوجی اقتدار اور شخصی آمریت کے مہیب سائے سے ہم نکلیں لیکن بدقسمتی سے ابھی تک اس جانب توجہ نظر نہیں آتی۔

ہمیں بہت سے معاملات میں پیپلز پارٹی سے، مسلم لیگ (ن) سے، دوسری پارٹیوں سے جو جو حکومت میں شریک ہیں اختلاف ہے، اس کے باوجود ہم دل کی گہرائیوں سے یہ چاہتے ہیں کہ جمہوریت کا کاروان آگے بڑھے اور یہ حکومت گر نہ جائے۔ لیکن نظر آرہا ہے کہ انہیں خود احساس نہیں کہ یہ کس تیزی سے اپنی قدر کھو رہے ہیں۔ مشرف صاحب نے اپنے اقتدار کو کھونے میں ساڑھے آٹھ سال لیے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ جو توقعات آپ سے وابستہ کی گئی تھیں وہ آٹھ ہفتوں میں ہی تیزی سے مندمل ہو رہی ہیں۔ خدا کے لیے ہوش کے ناخن لیجیے۔ مفادات کے چکر سے نکلیے۔ این آر او (National Reconciliation

(Ordinance) قومی شرمندگی کی ایک دستاویز ہے اس کے مقابلے میں، میثاق جمہوریت [1] میں آپ نے احتساب کا اور محاسبے کا ایک بڑا اچھا نسخہ تجویز کیا ہے، اسے آپ اختیار کیجیے۔ محض ڈکٹیٹر سے یا امریکن سرٹیفکیٹ لے کر کے آپ قوم سے اعتماد حاصل نہیں کر سکتے۔ قوم کا اعتماد آپ قانون کی پاسداری سے، خدمت اور شفافیت سے، اور احتساب کے ایسے نظام سے حاصل کر سکتے ہیں جس کی بنا پر سب کو اعتماد ہو کہ ہاں مقدمات کی صورت میں آپ سے انتقام لیا گیا تھا آپ ملزم تھے مجرم نہیں تھے۔ جب تک کہ آپ کا دامن صاف نہیں ہو گا آپ کو قوم کی پشت پناہی حاصل نہیں ہو گی۔ قوم کا اعتماد اور احترام این آر او اور غیر قانونی سرپرستی سے حاصل نہیں ہو گا۔ ابھی بھی موقع ہے اور ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے یہ دوست بہتر مثال قائم کریں۔ ملک کو اس بحران سے نکالیں۔ ورنہ آپ دیکھیے کہ اس وقت آپ تین بحرانوں میں گھر گئے ہیں۔

پہلا بحران سیاسی بے یقینی ہے اوراس کی بہت بڑی وجہ سیاسی ہے،، عدلیہ کی بحالی اس کی پہلی ضرورت ہے۔ بلاشبہ دستوری و عدالتی اصلاحات ضروری ہیں۔ ہم انشاءاللہ اس میں مؤثر کردار ادا کریں گے۔ لیکن خدا کے لیے دوبارہ لوگوں کو سڑکوں پر آ کر احتجاج پر مجبور نہ کیجیے۔ جس کام کو پہلے دن ہی ہو جانا چاہیے تھا اسے جلد سے جلد کیجیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی وجہ سے معاشی عدم استحکام ہے اور اقتصادی پالیسیوں میں بھی بے یقینی ہے۔ اس آٹھ ہفتے میں کوئی ایک بھی اچھی معاشی ترغیب نہیں دی گئی۔ بجٹ آ رہا ہے۔ ہم اچھی توقعات رکھتے ہیں اور بالکل کھلے ذہن کے ساتھ ہم اس کو دیکھیں گے۔ لیکن واضح رہنا چاہیے اقتصادی بحران کو بڑھانے میں سیاسی عدم استحکام کا بھی دخل ہے اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو آپ ٹھیک نہیں کر سکتے۔ تیسری چیز جنابِ والا! یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کے چکر سے نکلیے۔ اس جنگ کے ذریعہ امریکہ نے ہمیں ایک شکنجے میں کس لیا ہے۔ وہ خود بھی پھنسا ہوا ہے لیکن ہم اس

---

[1] میثاق جمہوریت پر ۱۴ مئی ۲۰۰۶ء کو لندن میں پاکستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے رہنماؤں نے دستخط کیے جس کا مقصد پاکستان میں ۱۹۹۹ء سے قائم شدہ فوجی حکومت کا خاتمہ تھا۔

کی دم کے ساتھ بندھے ہوئے کھنچے چلے جارہے ہیں۔ اور جو بھی راستہ، مذاکرات کا، اصلاح کا اور امن کا اٹھایا جاتا ہے، اسے بکھیرنے کے لیے اسلام آباد سے واشنگٹن تک ساری قوتیں متحرک ہو جاتی ہیں۔ اس چکر سے نکلیے، جب تک ان تینوں بحرانوں پر آپ بلوغت کے ساتھ واضح ذہن اور ہمت و جرأت کے ساتھ قدم نہیں اٹھائیں گے ملک دلدل سے نہیں نکلے گا۔ قانون کی بالادستی ضروری ہے۔ امن وامان اس وقت بہتر ہو گا جب آپ ان اسباب کی اصلاح کی کوشش کریں گے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ (۹جون ۲۰۰۸ء)

- ۳ -

سینیٹ آف پاکستان میں حزبِ اختلاف کی تحریک پر ملک میں امن وامان کی صورتحال پر تفصیلی بحث ہوئی جس میں تقریباً تمام ہی جماعتوں کے سینیٹرز نے حصہ لیا۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کے دوران امن وامان کے مسائل میں بیرونی عنصر کے داخل ہونے کے سبب دہشت گردی کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ دہشت گردی کے واقعات میں خودکش حملوں، راکٹوں اور توپوں کا استعمال، اغواء برائے تاوان، ملکی سرحدوں کے اندر اور باہر سے مداخلت نے عوام میں دہشت کی ایک فضا قائم کردی۔ امن وامان کے لحاظ سے اس عرصہ میں سب سے زیادہ متاثر بلوچستان، خیبر پختونخوا کے قبائلی علاقے، شمالی علاقہ جات، سرائیکی بیلٹ اور کراچی کا صنعتی شہر شامل رہے۔ جبکہ پسِ منظر میں فرقہ واریت، قبائلی چپقلش اور بیرونی ہاتھ میں افغانستان کی سرحدوں سے دہشت گردی میں ملوث گروہوں کا کردار بھی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد کی زیرِ نظر تقریر اسی تناظر میں پاکستان میں امن وامان کے مسائل اور ان کے حل کی تجاویز سے بحث کرتی ہے۔

امن وامان کا مسئلہ اس ملک کے لیے ایک ایسا مسئلہ بن گیا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں درحقیقت یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یہ الفاظ بلاشبہ سخت ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت لوگ جان، مال اور آبرو، تینوں کے تحفظ سے بالکل محروم ہیں اور اگر یہ تینوں چیزیں کسی معاشرے میں لوگوں کو حاصل نہ ہوں تو اسے مہذب

معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ کل ہی سوالات کے جواب میں وزیر صاحب نے جو معلومات دی ہیں وہ بہت خطرناک صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں۔ صوبہ پنجاب کے اعداد و شمار اس میں موجود نہیں ہیں لیکن پچھلے دو سال میں سوا چھ ہزار افراد کا اغواء ہوا ہے۔ میں ایک بین الاقوامی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔ انسان سر پکڑ لیتا ہے کہ کراچی میں ۲۰۰۶ء سے اس وقت (۲۰۱۰ء) تک ۱۵۴۲ افراد ٹارگٹ کلنگ یا سیاسی قتل میں مارے گئے ہیں اور تقریباً اتنی ہی تعداد باقی پورے ملک میں دہشت گردی کے مختلف واقعات سے متاثر ہوئی ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ سیالکوٹ میں کیا ہوا، گوجرہ میں کیا ہوا، ملتان میں کیا ہوا[1] یعنی معاشرے پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے اور حکومت کوئی کارروائی نہیں کر رہی۔ سچی بات یہ ہے، ہمیں دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ پارلیمنٹ بھی کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر رہی ہے۔ نتیجتاً لوگوں کا اعتماد حکومت پر ہی سے نہیں پارلیمنٹ سے بھی اٹھتا جا رہا ہے۔

لاپتا افراد کا مسئلہ ہے۔ اس سے زیادہ شرمناک معاملہ کسی سوسائٹی کے لیے کیا ہو سکتا ہے؟ جناب چیئرمین! آپ قانون کے ماہر ہیں۔ دستور سازی میں آپ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق ہمارے دستور کا اور ملک کے نظام کا، ایک بنیادی پتھر ہے۔ بنیادی حقوق میں ایک حق ایسا ہے، آرٹیکل ۱۴[2]، انسانی وقار سے متعلق ہے جبکہ باقی سارے بنیادی حقوق قانون کے اندر ہیں لیکن انسانی وقار، انسان کی خلوت اور اس کی عزت کو قانون سے بالا رکھا گیا ہے۔ انسانی وقار کو پامال نہیں کرنا چاہیے اس کے بعد کا حصہ دائرہ

---

[1] ۱۵ اگست ۲۰۱۰ء کو سیالکوٹ میں دو بھائیوں کو قتل کیا گیا ان کی لاشوں کی بے حرمتی کرتے ہوئے انھیں شہر بھر میں گھمایا گیا اور پھر انھیں لٹکا دیا گیا۔ پولیس موقع پر موجود تھی لیکن کسی کارروائی کی بجائے وہ لاشوں کو گھمانے والے جلوس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

گوجرہ میں عیسائیوں کے ایک گروپ کو حملہ کر کے زندہ جلا دیا گیا اور ان کے گھر تباہ کر دیے گئے۔

ملتان میں دو ڈاکوؤں کو ہجوم نے پکڑ کر مار دیا۔

[2] آرٹیکل ۱۴(۱): شرف انسانی اور قانون کے تابع، گھر کی خلوت قابلِ حرمت ہو گی۔

قانون میں ہے۔ قانون کے دائرہ میں یہ نزاکتیں جن کا آپ نے اہتمام کیا ہے، اس پارلیمنٹ نے کیا ہے۔ لیکن عالم کیا ہے؟ اس وقت جس کو چاہے اٹھالیا جاتا ہے۔ جو لاپتا ہیں ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔ لوگ چیخ رہے ہیں۔ جناب چیئرمین! ظلم یہ ہے کہ کل جماعت اسلامی اور دوسری پارٹیوں نے احتجاج کرنے کی کوشش کی تو انہیں پارلیمنٹ ہاؤس میں نہیں آنے دیا گیا۔ انہوں نے ڈھائی کلو میٹر دور اپنا کیمپ لگایا۔ اس طرح کے اقدامات ہمیں کہاں لے جارہے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ کل سپریم کورٹ میں کیا کیا گیا ہے۔ عدالت حکم دیتی ہے کہ ملزم کو رہا کرو لیکن اسے پھر دوسرے اور اس کے بعد تیسرے مقدمے میں گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ پھر جب آخری مقدمے سے بھی نکالا جاتا ہے تو ان کو ایجنسیوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ ہم کہاں جارہے ہیں؟ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ ابھی پچھلے ہفتے آئی ہے اور اس میں یہ کہا گیا ہے کہ گزشتہ چھ مہینے میں چالیس افراد صرف بلوچستان میں ٹارگٹ کلنگ میں مارے گئے ہیں۔ پندرہ آبادکار مارے گئے ہیں اور کوئی ان کی شنوائی نہیں۔ ایک رپورٹ میں یہ بات کہی گئی ہے یہ میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سرکاری ہے یا نہیں لیکن یہ بات کہی گئی ہے کہ بلوچستان میں پچھلے دو سال کے اندر ایک ہزار ایک سو افراد لاپتا ہوئے ہیں اور ان میں سے تین سو باون ایسے ہیں جو منتخب حکومت کے دور میں لاپتا ہوئے ہیں۔

جنابِ والا! یہ صرف اعداد و شمار نہیں ہیں یہ جیتے جاگتے انسانوں کا معاملہ ہے۔ یہ انسانوں کی آزادی اور ان کے خاندانوں کا معاملہ ہے۔ قرآن پاک اس معاملے میں جو تعلیم ہمیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک معصوم انسان کی جان کا ضائع کرنا پوری انسانیت کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے اور ایک معصوم انسان کی جان کا بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے۔ لیکن ہمارا کیا حال ہے؟ میں اس میں صرف حکومت ہی کی بات نہیں کررہا ہوں، میں بلاشبہ پارلیمنٹ کی بھی بات کررہا ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں پوری سوسائٹی کی بات کررہا ہوں۔

پولیس کو آپ دیکھیے یعنی غضب یہ ہے کہ پولیس جس کا کام انسانوں کو تحفظ دینا اور جرم کی تفتیش اور مجرم کو پکڑنا ہے وہ خود جرائم میں ملوث ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے جو رپورٹ آئی

ہے اس کے مطابق ۱۸۲ پولیس افسر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں، کوئی ہفتہ ایسا نہیں ہے جس میں کسی صوبے سے یہ خبر نہ آتی ہو کہ پولیس کا کیا مجرمانہ کردار ہے۔ سیالکوٹ کے واقعہ میں آپ کو معلوم ہے کہ سینئر پولیس آفیسر کھڑے ہوئے ہیں، ٹی وی پر ان کے فوٹو آرہے ہیں لیکن کوئی نہیں ہے جو انسانی جانوں کو بچا سکے، قانون حرکت میں آسکے۔ جنابِ والا! بحران ہیں اور سارے ادارے تباہ ہو رہے ہیں۔ سرکاری افسروں اور پولیس کی سیاسی بنیادوں پر تشکیل ہو رہی ہے۔

ہمارے پاس جانچنے کے ذرائع نہیں ہیں کہ کہاں تک یہ بات صحیح ہے لیکن کہا گیا ہے کہ پچھلے دو سال میں صرف سندھ کے اندر ایک خاص پارٹی کی طرف سے پانچ ہزار نئے افراد کسی میرٹ کے بغیر بھرتی کیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے جو دوسری پارٹیاں اقتدار میں تھیں انہوں نے بھی یہی کھیل کھیلا۔ ہر طرف یہی کام کیا جارہا ہے۔ آپ ان اقدامات سے اداروں کو تباہ کر رہے ہیں۔ آپ کو پتا ہے جنابِ والا! کہ برطانوی دور کے پولیس ایکٹ کے اندر یہ بات شامل تھی کہ پولیس افسر طاقت کا کم سے کم استعمال کریں گے اور اگر مجھے صحیح یاد ہے تو پولیس طاقت کا استعمال اس وقت ہی کر سکتی تھی جب مجسٹریٹ منظوری دیتا تھا اور اسی لیے مجسٹریٹ موقع پر ساتھ ہوتا تھا۔ آج کیا معاملہ ہے، اگر مجسٹریٹ پاس بھی ہوتا ہے تو اس سے نہ کوئی پوچھتا ہے اور نہ اس کا کوئی کردار ہے۔ پولیس والے خود ہی سارے کا سارا کام کرتے ہیں۔

جنابِ والا! خدا کے لیے اس ملک کو سنبھالیے۔ اس کے دستور میں جن چیزوں کی ضمانت دی گئی ہے انہیں حقیقی صورت دینے کی کوشش کیجیے۔ حکومت میں جو بھی آئے اس کا طاقت کا غلط استعمال کرپشن کی بدترین شکل ہے۔ اداروں کا، بیوروکریسی کا اور پولیس کا اپنے مقاصد کے لیے استعمال کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہونا چاہیے۔ غور کیجیے کہ اس صورتحال کے نتیجہ میں جو بے چینی، بے زاری اور نفرت کا لاوا لوگوں کے اندر پک رہا ہے، یہ ان کو کہاں لے جائے گا۔

جناب چیئرمین! میں بڑی دردمندی کے ساتھ آپ کے اور اس ایوان کے توسط سے

اس حکومت کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں بار بار ان چیزوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے۔ میں جب سے اس نئے دور میں سینیٹ میں آیا ہوں، ۲۰۰۳ء سے اب تک، میرا خیال ہے کہ ہم نے امن و امان کے مسئلے پر کوئی پچاس دفعہ بحث کی ہے اور جب بھی آپ بزنس کمیٹی کی میٹنگ بلاتے ہیں، ہر طرف سے پہلا مسئلہ امن و امان کا آتا ہے۔ کب تک ہم محض بحث کرتے رہیں گے؟ کب تک عوام اس طرح بھگتتے رہیں گے؟ کب تک ہم اس طرح لاشیں اٹھاتے رہیں گے؟ آپ نے سرحد (خیبر پختونخوا) میں آپریشن کیا، دو سال سے آپ وہاں کام کر رہے ہیں، وہاں پر فوج کی عملاً حکمرانی ہے۔ روزنامہ ڈان میں ۱۰ جولائی ۲۰۱۰ء کو شائع شدہ رپورٹ کے مطابق میاں بانڈہ کے علاقے میں ایک اجتماعی قبر سے ۲۳ لاشیں ملی ہیں جبکہ اسی رپورٹ میں علاقے کے سابق رکن صوبائی اسمبلی کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ۵۰ لاشیں مختلف علاقوں کو بھیجی گئی ہیں اس سے قبل بھی اگست ۲۰۰۹ء میں آئی آر آئی این (Integrated Regional Information Networks) نے انسانی حقوق کمیشن پاکستان کی رپورٹ کے حوالے سے خبر دی ہے کہ ضلع سوات کے علاقے بابوزئی اور کبل میں اجتماعی قبریں ملی ہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہے جو لوگوں کو مار رہا ہے؟ کیا انہیں دہشت گرد مار رہے ہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو آپ کا یہ سارا آپریشن کہاں جا رہا ہے؟ اگر فوج خود ملوث ہے تو اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟

آج عالم یہ ہے کہ فوج کی جو عزت تھی وہ بری طرح مجروح ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پوری دنیا میں سوشل میڈیا پر جو فلمیں آئی ہیں ان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طریقے سے فوجی وردی میں ملبوس افراد نے شہریوں پر تشدد کیا ہے، ان کو مارا ہے اور ہاتھ باندھ کر مارا ہے، آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر مارا ہے۔ گارڈین (۲۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء) کے مطابق یہ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ امریکہ آپ کو جو امداد دے رہا ہے اس کے ساتھ انہوں نے یہ پابندی لگائی ہے کہ پاکستانی آرمی کی پانچ یونٹس ایسی ہیں جن کو فوجی امداد کا کوئی حصہ اس وقت تک نہیں دیا جائے گا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ انہوں نے انسانی حقوق پامال نہیں کیے ہیں۔

جنابِ والا! آپ نے غور کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ یہ آپ کی فوج کے وقار پر حرف ہے۔ یہ اس سے آگے بڑھ کر آپ کے اندرونی معاملات میں بیرونی حکومتوں کی مداخلت ہے اور مداخلت بھی اس حد تک باریک بینی سے کہ ان کو پتا ہے کہ آپ کی پانچ یونٹس کون سی ہیں جو انسانی حقوق کی پامالی میں ملوث ہیں اور ان پر وہ پابندی لگا رہے ہیں، ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ جناب چیئرمین! میں کہاں تک آپ کو بتلاؤں، یہ بڑے گھمبیر معاملات ہیں، ان کو عمومی نہ لیں۔ اس معاملہ میں اور بھی زیادہ افسوسناک بات حکومت کی سہل انگاری کا عالم ہے کہ وزیر داخلہ رحمٰن ملک صاحب دبئی اور لندن میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، پاکستان میں نہیں۔

ہم امن و امان کا مسئلہ اٹھاتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ یہ صوبائی معاملہ ہے۔ اگر یہ صوبائی معاملہ ہے تو ہر ہفتے صدر صاحب اور وزیر داخلہ صاحب کراچی کیوں جاتے ہیں، وہاں اجلاس کیوں بلاتے ہیں، کیا احکامات دیتے ہیں اور ہر مرتبہ وزیر داخلہ کہتے ہیں کہ اب ایسا نہیں ہو گا اور پھر اگلے دن وہی معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سب کیا کھیل ہے؟ اگر مجھے صحیح یاد ہے تو میں آپ کو یاد دلاؤں کہ مئی ۲۰۱۰ء میں ملک کے سول، ملٹری، سراغ رسانی کے تینوں اداروں کی مشترکہ رپورٹ تھی کہ کراچی خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان کے الفاظ اخبارات میں رپورٹ ہوئے ہیں کہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں اور قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے ناکام ہو چکے ہیں۔ انہوں نے مئی میں انتباہ کیا تھا لیکن مئی کے انتباہ کے بعد کیا ہوا، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، یہی عمل مسلسل جاری رہا۔ اکتوبر میں، آپ کو معلوم ہے پانچویں دفعہ ٹارگٹ کلنگ کے نام پر ڈرامہ رچایا گیا ہے اور اگر میں آپ کو اعداد و شمار دوں تو آپ کو دیکھ کر تعجب ہو گا کہ کس طریقے سے یہ واقعہ ہوا ہے۔ جنابِ والا! یہ چارٹ ہے، ۱۴ اکتوبر کو چار مارے گئے، ۱۵ اکتوبر کو چار افراد مارے گئے۔ ۱۶ اکتوبر کو سترہ افراد مارے گئے، ۱۷ اکتوبر کو ۲۰ افراد مارے گئے، ۱۸ اکتوبر کو ۳ اور ۱۹ اکتوبر کو ۲۹ افراد مارے گئے۔ ایک ہفتے کے اندر یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے اور اس وقت جب آپ کے وزیر صاحب بھی وہاں موجود ہیں۔

براہ مہربانی اس کی وجوہات تلاش کیجیے۔ اخبارات آپ دیکھیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان واقعات کے ذمہ داران کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ پھر اعداد و شمار کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اس میں یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ وہاں پر ہلاک ہونے والے ۱۵۴۰ افراد میں اردو بولنے والے، پختون اور دیگر ہر طبقے کو نشانہ بنایا گیا ہے تو ہم یہ کہاں جا رہے ہیں۔

اسی طریقے سے میرے ساتھیوں نے یہ بات کی ہے اور میں ان کی آواز میں آواز ملانا چاہتا ہوں کہ لاپتہ افراد کا مسئلہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ یہ ایک قانونی اور اخلاقی مسئلہ ہے۔ درحقیقت ایک شخص بھی اگر بلا سبب، بلاوجہ بتائے ہوئے قانون کو پامال کرتے ہوئے گرفتار کیا جاتا ہے، اغوا کیا جاتا ہے یا اسے اٹھا لیا جاتا ہے تو یہ ایک ظلم ہے اسے کسی صورت برداشت نہیں کرنا چاہیے۔ بدقسمتی سے اس میں کوئی بہتری نہیں ہو رہی۔ ہمارے ساتھیوں نے کہا اور میں بھی ان سے پوری طرح متفق ہوں کہ آغاز بلوچستان پیکج میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں لوگ واپس آجائیں گے۔ جنابِ والا! چوبیس گھنٹے نہیں ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اس دوران گمشدہ افراد نہ صرف واپس نہیں آئے بلکہ کچھ اور لوگ اٹھائے گئے اور یہ عمل رُکا نہیں بلکہ مسلسل جاری ہے۔ حتّٰی کہ اسلام آباد اور راولپنڈی میں بھی یہ عمل جاری ہے۔ کراچی اور بلوچستان میں یہ عمل جاری ہے۔ خدا کے لیے اس معاملے پر توجہ دیجیے۔

نظام کا استحکام محض ان دعوؤں سے نہیں ہوتا کہ ہمیں پانچ سال کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ استحکام آپ کی پالیسیوں کے نتیجہ میں اور آپ کے عمل سے ہو گا۔ درحقیقت اس پہلو سے یہ حکومت ناکام رہی ہے۔ بُری حکمرانی، نااہلی اور ترجیحات کا نہ ہونا اس حکومت کی خصوصیات بن گئی ہیں۔ جو دعوے کرتے ہیں اور جو پالیسی بناتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ درحقیقت یہ وہ چیزیں ہیں جب تک آپ ان کی اصلاحات پر توجہ نہیں دیں گے میں نہیں سمجھتا کہ حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

جنابِ والا! میں بڑی دردمندی سے یہ بات کر رہا ہوں، اس میں کوئی سیاسی معاملہ نہیں ہے، کوئی نمبر نہیں بنانے ہیں۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور مسئلے کی طرف توجہ دیجیے۔ اس

کے لیے سب سے پہلی چیز قانون کا احترام ہے اور قانون کے احترام میں سب سے بڑی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ فوج ہو، پولیس ہو، فرنٹیئر کور ہو اور یا رینجرز ہوں یہ نظم ضبط کے پابند ریاستی ادارے ہیں، اس میں نظم وضبط سب سے اہم چیز ہے۔ بلاشبہ ایک لُٹیرا یا ایک شاٹ گن لے کر جانے والا فرد قابل گرفت ہے، اس کو سزا ملنی چاہیے۔ لیکن اگر یہی کام پولیس، رینجرز یا فوج کر رہی ہے یہ اس سے ایک سو گنا بڑا جرم ہے، اس لیے کہ آپ تو نظم وضبط کے پابند ہیں اور ایک نظام کے تحت ہیں۔ آپ کو سرکار امن وامان قائم کرنے کے لیے بھرتی کر رہی ہے اور وسائل خرچ کر رہی ہے یہ سب امن وامان کو توڑنے کے لیے نہیں کیا جارہا ہے۔

جناب چیئرمین! آپ سے زیادہ اور کون اس بات سے زیادہ واقف ہو گا کہ جب طاقت استعمال کرنی پڑے تو ضروری ہے کہ: نمبر ایک، اس کے لیے قانونی جواز ہو؛ نمبر دو، اس کا استعمال کم سے کم ہو اور؛ نمبر تین، بے محابا طاقت کا استعمال نہ ہو متناسب ہو، یہ بنیادی قانون ہے لیکن ہم قانون کو ان تینوں پہلوؤں سے پامال کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قانون کی حکمرانی جب تک نہیں آئے گی اس وقت تک یہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکے گا۔ کراچی کا جو حال ہے، میرے دوسرے ساتھیوں نے بھی بات کی ہے، معاشیات کے طالب علم کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں کہ ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کراچی ہے۔ آپ کی GDP کا بہت بڑا حصہ کراچی سے آتا ہے تقریباً ۸۶ بلین ڈالر سالانہ اور جب وہاں پر ایک دن امن وامان کا مسئلہ ہوتا ہے یا معیشت بند رہتی ہے تو دو بلین ڈالر کا نقصان ہوتا ہے۔ خدا کے لیے اس معاملے کو سنجیدہ لیجیے۔ وہاں جو تینوں پارٹیاں کسی نہ کسی شکل میں اقتدار میں ہیں وہ ایک دوسرے پر الزام دھر رہی ہیں۔ عملاً نظر آرہا ہے کہ حالات کے بگاڑنے میں ان تینوں کا ہاتھ ہے۔ تکرار کے ساتھ ایک کھیل ہوتا ہے کہ اچانک ایک روز ہنگامہ ہوا پھر گورنر ہاؤس میں میٹنگ ہوئی، پھر لندن ایک ٹیلی فون ہوا، پھر ایک بیان آیا، پانچ، چھ یا دس دن کچھ خاموشی رہی، پھر وہی ڈرامہ ہو رہا ہے۔ آخر قوم یہ کھیل کب تک دیکھے گی اگر آپ نے اس کی اصلاح نہیں کی تو پھر مجھے ڈر ہے کہ عوام کو اٹھنا پڑے گا اور عوام کا احتجاج اچھے برے سب کو بہا کر لے جائے گا۔ ابھی وقت ہے اس لیے ہوش کے ناخن لیجیے۔

ساتھ ہی میں پارلیمنٹ اور تمام سیاسی پارٹیوں کو کہنا چاہتا ہوں کہ سیاسی اعتبار سے اداروں اور سیاستدانوں پر قوم کا اعتماد ہر روز کم ہو رہا ہے۔ ہم بڑے طمطراق سے کہتے ہیں کہ مارشل لاء نہیں آئے گا، یہ ضمانت دیتے ہیں وزیر اعظم صاحب لیکن یہ کسی کمزوری کی علامت ہے۔ فی الحقیقت فوج کو نہیں آنا چاہیے اور جتنی بار بھی فوج آئی ہے اس نے نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا کام سیاست نہیں ہے، اس کا کام ملکی نظام کو چلانا نہیں ہے، اس کا کام دفاع اور صرف دفاع ہے لیکن اگر سیاسی ادارے، سیاسی پارٹیاں، سیاسی قیادت اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کریں گے تو پھر کیا ہو گا؟ یہ بہت بڑا سوال ہے۔

درمیانی مدت کے انتخابات کی بات بار بار کی جاتی ہے لیکن میری نگاہ میں درمیانی مدت کی اصطلاح محض ایک سیاسی مذاق بن گیا ہے اس لیے کہ جہاں تک دستور کا اور جمہوریت کا تعلق ہے یہ اس کا ایک حصہ ہے۔ آپ مطالعہ کیجیے، جہاں تک میں نے پڑھا ہے تقریباً ۱۲۸ جمہوری ممالک ہیں ان میں سے بیشتر میں تین سال یا چار سال اور چند میں پانچ سال اور کچھ میں چھ سال بعد انتخابات کی مدت رکھی گئی ہے۔ لیکن اس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ عوام نے آپ کو حکمرانی کا اختیار دیا ہے قانون اور دستور کے مطابق اور منشور کے مطابق کام کرنے کا۔ لیکن اگر آپ ناکام ہوتے ہیں اور عوام غیر مطمئن ہوتے ہیں تو کوئی ضمانت، کوئی گارنٹی اور دستور کا کوئی تقاضا نہیں ہے کہ تباہی کو فروغ دینے کے لیے لازماً یہ مدت پوری کی جائے گی۔

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ انگلستان میں وہاں چار سال کی مدت ہے۔ ۱۹۱۴ء سے لے کر اب تک، جو مطالعہ ہوا ہے، اس میں سات، آٹھ بار ایسا ہوا ہے کہ دو سال یا ڈیڑھ سال میں نئے انتخابات ہوئے ہیں۔ بھارت کو آپ دیکھ لیجیے، بھارت میں ۱۹۴۷ء سے لے کر اس وقت تک کم از کم گیارہ مرتبہ ایسا ہے کہ دو سال یا اس سے بھی چند مہینے کم یا چند مہینے زیادہ پر نئے انتخابات ہوئے ہیں۔ امریکہ میں آپ کو معلوم ہے کہ ہر دو سال کے بعد لوگوں کی طرف الیکشن کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ عوام سے رجوع کرو جنھوں نے آپ کو حق حکمرانی دیا ہے۔ آپ حق حکمرانی پورا نہیں کر رہے ہیں تو آپ کو ایک بار پھر

حق حکمرانی لینا ہوتا ہے۔ میں درمیانی مدت کے انتخابات کے حق میں بات نہیں کر رہا، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پردے کے پیچھے جو باتیں ہمیں سنائی جاتی ہیں ان کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ اپنے منشور کو پورا کیجیے۔ عوام نے جو مینڈیٹ دیا ہے اس کا احترام کیجیے اور اگر آپ نہیں کریں گے تو اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے کہ پھر دوبارہ عوام کے پاس جائیں تاکہ ان سے مینڈیٹ لیا جائے۔ اگر یہ طریقہ آپ نے نہیں کیا تو پھر یا خدانخواستہ خونی انقلاب آئے گا یا فوجی مداخلت ہوگی جو تباہی کا راستہ ہے۔

یہاں پر میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اصل مسئلہ فوجداری انصاف کی ناکامی ہے۔ اصل مسئلہ ہمارے ہاں پولیس کا اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنا ہے۔ اس کی اپنی جگہ کئی وجوہات ہیں۔ ایک چیز پولیس میں نااہلوں کی سیاسی بنیادوں پر تعیناتی ہے۔ دوسرا پولیس کا سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہے۔ کوئی بھی پارٹی ہو ہر ایک نے یہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تیسری چیز پولیس کی ٹریننگ کی کمی ہے۔ پولیس کو جو آلات چاہییں اور دوسری جانب اس کا جو محاسبہ ہونا چاہیے یہ ساری چیزیں بھی موجود نہیں ہیں۔ جب تک آپ فوجداری عدالتی نظام جس میں عدالت، تفتیش اور استغاثے کی کارروائی شامل ہیں سب پر بیک وقت توجہ نہیں دیں گے صورتحال بہتر نہ ہوگی۔

دوسری بات جنابِ والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک تجربہ ہم نے موٹروے ٹریفک پولیس کا کیا ہے۔ یہ کامیاب تجربہ ہے اور اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر آپ پولیس کی اصلاح کرنے کا کام صحیح بنیادوں پر کریں اور جو اس کے اصل تقاضے ہیں، ٹریننگ کے بھی اور تنخواہ اور محاسبے کے بھی وہ پورے کریں تو ہم اس دلدل سے نکل سکتے ہیں۔ اس بات کے لیے کوئی کوشش نہیں ہو رہی بلکہ جہاں تک میں نے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں پولیس کو جو وسائل دیے گئے ہیں، وہ پہلے کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ ہیں لیکن جرائم بڑھے ہیں کم نہیں ہوئے۔ کیا یہ وقت نہیں آیا کہ آپ تلاش کر کے دیکھیں کہ اصل میں کہاں کہاں خرابی ہے اور کس طرح ہم اس کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔

تو تباہی کے راستوں سے بچنے کا راستہ یہی ہے کہ آپ امن و امان، عوام کی زندگی، ان کے مال اور ان کی آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کریں۔ یہ پارلیمنٹ اور وہ ساری پارٹیاں جو مخلوط اتحاد میں شریک ہیں یہ براہِ راست ذمہ دار ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو بڑے شوق سے اور بڑے طمطراق سے یہاں ایوان سے واک آؤٹ کرتی ہیں لیکن حکومت سے واک آؤٹ ہونے کی توفیق انھیں حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اگر یہ حکومت صحیح سمت میں نہیں جارہی ہے اور آپ سنجیدہ نہیں ہیں ان کے ساتھ، یا فیصلوں میں یہ آپ کو شریک نہیں کررہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ وہاں حکومت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو حکومت سے اختلاف ہے تو حکومت سے الگ ہو کر میدان میں آجائیں۔ دستور میں دستوری طریقے سے تبدیلی کا طریقہ موجود ہے۔ اگر حکومت ناکام ہو رہی ہے تو لازماً وہ اپنا مینڈیٹ کھو چکی ہے۔

اس لیے جناب چیئرمین! بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ یہ مسئلہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے یہ دروازہ بند ہونا چاہیے کہ یہ ہاؤس ہر اجلاس میں تین تین، چار چار دن امن و امان پر بحث کے لیے وقف کرے اور عملاً زمینی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ یہ بڑا خطرناک کھیل اور بڑا غلط راستہ ہے، اس سے پارلیمنٹ کی عزت بھی ختم ہوتی ہے اور ملک کا اعتماد بھی ختم ہوتا ہے۔ اس لیے راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ دیانت داری کے ساتھ قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے آیئے۔ قانون کی حکمرانی ہی اصل چیز ہے۔ دستور بالادست ہے۔ اس کے مقابلہ میں پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ، ہر ایک دستور کی پابند ہے کیونکہ یہ سب دستور کی تخلیق ہیں۔ اگر ہم نے دستور کو پامال کیا تو دراصل ہم اپنے اس قانونی جواز کو جو ہمیں حاصل ہے کھو دیں گے اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کی طرف ہم بڑھ رہے ہیں اور تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ جنابِ والا! میں اپنی بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں کہ سنجیدہ صورتحال ہے۔ اسے سنجیدہ لیجیے۔ وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے اور اگر ہم نے بروقت مؤثر اقدام نہ کیا تو پھر کوئی ہم پر شاید آنسو بہانے والا بھی موجود نہ ہو۔ (۳ نومبر ۲۰۱۰ء)

کراچی میں بدامنی، سیاسی و معاشی پہلو
اور کرنے کے کام

۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ء کے عام انتخابات میں ۸۶ نشستیں جیت کر پیپلز پارٹی نے اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے جمیعت علماء اسلام کے تعاون سے مرکز میں حکومت بنائی۔ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں یہ دوسرا دورِ حکومت تھا لیکن حکومت کی نااہلی کے سبب پاکستان کے معاشی اور امن وامان کے حالات سنگین حد تک ابتر ہو گئے۔ پاکستان کی معاشی شہ رگ کراچی میں امن وامان کا حال یہ تھا کہ جولائی ۱۹۹۵ء میں روزانہ درجنوں افراد قتل ہو رہے تھے[۱] جن میں امن وامان قائم کرنے والے اداروں سے منسلک افراد کے علاوہ، سرکاری ملازمین، سیاسی کارکن اور عام شہری بھی شامل تھے۔

ایسے میں مرکزی حکومت نے ایم کیو ایم سے مذاکرات شروع کیے تاکہ کراچی کی بگڑتی صورتحال کو بہتر بنایا جاسکے ان مذاکرات میں ایم کیو ایم نے اپنے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف مقدمات کی واپسی، گرفتار شدہ کارکنوں کی رہائی اور کراچی سے فوج اور نیم فوجی دستوں کی بیرکوں میں واپسی کے مطالبات کیے مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں علیٰحدہ مہاجر صوبے کا نعرہ لگایا گیا۔ اس پس منظر میں سینیٹ آف پاکستان میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے (بشمول پروفیسر خورشید احمد) بالخصوص کراچی میں امن وامان کی صورتحال زیر غور لانے کے لیے تحریک پیش کی۔

گذشتہ تین دہائیوں کے دوران بہت سے اتار چڑھاؤ آئے ہیں۔ امن امان کی صورتِ حال اب پہلے کے مقابلہ میں قدرے بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوہری اعتبار سے انتظامی صورتِ حال میں بہت بڑا فرق واقع نہیں ہوا۔ اس تناظر میں پروفیسر خورشید احمد کی زیرِ نظر تقریر میں اٹھائے گئے نکات آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

جناب چیئرمین! میں اپنی گفتگو کا آغاز اس دعا سے کرنا چاہتا ہوں کہ کراچی میں جو

[۱] روزنامہ ڈان کراچی

آگ لگی ہوئی ہے وہ جلد از جلد بجھے اور جو قتل و خون وہاں جاری ہے وہ ختم ہو۔ مذاکرات[1] کا آغاز، خواہ جس انداز میں بھی ہوا ہو، اللہ کرے کہ وہ کامیاب ہوں اور ملک اس بحران سے نکلے۔

جنابِ والا! میں سب سے پہلے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ کراچی کا مسئلہ محض کراچی کا مسئلہ نہیں، یہ پورے پاکستان کا مسئلہ ہے اور میری نگاہ میں پاکستان کی بقا اور ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ سندھ اور کراچی کے حالات کی جلد از جلد اصلاح ہو۔ دینی اعتبار سے لسانیت، علاقائیّت اور فرقہ واریت کی بناء پر تشدد کے اس مسئلے نے ساری دنیا میں ہمارا منہ کالا کر دیا ہے۔ اور آج ہمارے دشمن خوشیاں منا رہے ہیں کہ کس طرح مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں آپس میں خون بہا رہے ہیں۔ یہ سیاسی اعتبار سے بھی تباہ کن ہے اس لیے کہ ملک میں سیاسی ترقی اور سیاسی عمل کے جاری رہنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے معاملات کو سیاسی عمل کے ذریعے حل کریں۔ اگر ان کو قوت کے ذریعے حل کیا گیا تو یہ محض کراچی نہیں پورے ملک میں سیاسی عمل کو تباہ کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

یہ صورتِ حال معاشی اعتبار سے بھی بے حد نقصان دہ ہے۔ کراچی پاکستان کی معیشت کو پیداواری ٹیکس کا ایک بڑا حصہ دے رہا ہے۔ کراچی کے حالات کا اثر پورے ملک کی صنعت پر، پورے ملک کی تجارت پر اور پورے ملک کی سرمایہ کاری پر ہوتا ہے۔ موجودہ حکومت خوشی کے شادیانے بجا رہی ہے کہ ہم نے اتنے معاہدوں پر دستخط حاصل کر لیے ہیں اور اتنی سرمایہ کاری ہونے والی ہے لیکن میں معاشیات کے ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت سے آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ملک میں سیاسی استحکام، سیاسی بھائی چارہ اور امن و امان نہیں تو

[1] اشارہ ہے اس وقت کے وزیرِ قانون این ڈی خان (مرکزی حکومت) اور ایم کیو ایم کے رہنما اجمل دہلوی کے درمیان کراچی میں امن و امان کی بحالی کے لیے ہونے والے مذاکرات کی جانب جس میں ایم کیو ایم کے دفاتر اور بعض علاقوں میں رینجرز کی تعیناتی ہٹانے پر ایم کیو ایم نے زور دیا۔ اس دوران سندھ کے وزیر اعلیٰ سید عبد اللہ شاہ کے بھائی بھی بعض 'نامعلوم افراد' کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے۔ بعد ازاں امن مذاکرات کے نتیجے میں کچھ عرصے کے لیے ہلاکتوں کا سلسلہ رک گیا۔

آپ ہر گز بیرونی سرمایہ کاری کی توقع نہ رکھیں۔ کراچی پاکستان کا دروازہ ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صرف کراچی کا مسئلہ ہے اور بقایا ملک میں سرمایہ کاری ہو گی، تو ایں خیال است، محال است۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ابھی انگلستان میں جو سرمایہ کاری کانفرنس آپ نے کی۔ اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے یہ بات خود برطانوی وفد نے کہی ہے۔ کراچی کے شہری پاکستان میں بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے کام کر رہے ہیں اور ان سرمایہ کاروں کا یہاں کے حالات کے بارے میں اطمینان ہونا ضروری ہے۔ یوں یہ محض ایک چھوٹا سا مسئلہ نہیں ہے یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور ہمیں اس کو وہ اہمیت دینا چاہیے جس کی ضرورت ہے۔

کراچی کا مسئلہ، پاکستان کا مسئلہ ہے

جنابِ والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں شہر کراچی کو مثبت پیغام دینا چاہیے۔ میں سینیٹ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ اس نے پچھلے ڈیڑھ دو سال میں خصوصیت سے اور جس دن سے یہ سینیٹ وجود میں آئی ہے اس دن سے اس نے سندھ اور کراچی کے مسائل کو اہمیت دی ہے۔ اس کی کمیٹیوں نے اور اس کے عام اجلاسوں کے اندر، اس کے چیئرمین نے بار بار کراچی کے مسئلے پر گفتگو کر کے اور اس کو قوم کی توجہ کا مرکز بنا کر اہل کراچی کو یہ پیغام دیا ہے کہ تم تنہا نہیں ہو۔ پورا ملک تمہاری مشکلات اور اس بحران میں فکرمند ہے اور اس کے حل کی کوشش کر رہا ہے۔ اور جناب چیئرمین! خود آپ نے تقریر کی ہے اس میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے اور میں اس کی تائید کرتا ہوں کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے محض اہل کراچی کا مسئلہ نہ سمجھا جائے اس میں پورا ملک نہ صرف دلچسپی رکھتا ہے بلکہ پورا ملک شریک ہے اور ہم سب کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے۔

حال ہی میں شروع ہونے والے مذاکرات کی کامیابی کے لیے ہم صرف دعا گو نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں پورے ملک اور تمام پارٹیوں کی شرکت ہو۔ اسی بنا پر یہ صرف ایک پارٹی یا دو پارٹیوں کا مسئلہ نہیں ہے، یہ محض ایم کیو ایم اور پی پی کا مسئلہ نہیں

ہے۔ بلکہ پورے پاکستان اور اس کی تمام سیاسی جماعتوں، دینی جماعتوں اور تمام شہریوں کا مسئلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت حکومت کو بھی اور ایم کیو ایم کو بھی اور ہم سب کو بھی علاقائی اور مقامی حقائق کا ادراک تو ضروری ہے لیکن مقامی اور علاقائی یا لسانی سوچ کے برعکس پاکستان اور اسلام جو اس ملک کی بنیاد ہیں، جناب والا! اس بنیاد پر ہمیں اس مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔

مسئلہ کے حل کے لیے پانچ بنیادی اصول

جنابِ والا! اسی پس منظر میں، میں آپ کے سامنے وہ پانچ بنیادی اصول رکھنا چاہتا ہوں جو میری نگاہ میں اس مسئلے کے حل کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی حیثیت مسلمہ تھی اور ہے اور ان کے اوپر ہمارا اتفاق رائے انشاء اللہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے بنیاد بنے گا۔

پہلا اصول، پاکستان - نظریاتی تحریک کا ثمر: مسئلے کو حل کرنے کے لیے غور و فکر کے ضمن میں پہلا اصول اس پاکستان کی بنیاد کو تازہ کرنا ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی تحریک کا ثمر ہے یہ ملک برصغیر کے تمام مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد اور قربانیوں سے بنا ہے، خواہ ان کا تعلق بنگال سے ہو یا پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد سے ہو اور یا دہلی، یوپی، سی پی، بہار، حیدرآباد یا آسام سے ہو۔ پاکستان سب نے مل کر بنایا ہے پاکستان پر سب کا حق ہے اور سب کا مساوی حق ہے اس میں کوئی بڑا اور چھوٹا، کوئی امتیازی مقام رکھنے والا اور کوئی برہمن اور شودر نہیں۔ یہ مسلمانان برصغیر کی کوششوں کا حاصل ہے اور اس پر ان سب کا حق ہے جو پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ کون سی زبان بول رہے ہیں اور کس گروپ سے ان کا تعلق ہے۔

دوسرا اصول، تشدد مسئلے کا حل نہیں: جنابِ والا! دوسرا اصول میری نگاہ میں یہ ہے کہ تشدد مسائل کا حل نہیں ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ پی پی پی (حکومت) اور اپوزیشن کی طرف سے بولنے والے تقریباً سب ہی حضرات نے اس بات کا کھل کر اظہار کیا ہے کہ تشدد مسائل کا

حل نہیں ہے۔ ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے اور کھل کر اس بات کا اعلان کرنا چاہیے۔ میں اس سے آگے بڑھ کر یہ بات کہوں گا کہ ہم ایک دوسرے کے اوپر تیر پھینکنے اور ایک دوسرے کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی پر وقت نہ ضائع کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاید کسی کا دامن بھی بالکل صاف نہیں ہے۔ ہر ایک نے اپنے مفاد میں، کسی نہ کسی موقعے پر کبھی احتجاج کے انداز میں اور کبھی دفاع کے انداز میں، لیکن تشدد کا راستہ کم و بیش سب نے اختیار کیا ہے۔ میرے دوست جو یہاں کھڑے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی نے تشدد کبھی نہیں کیا میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ وہ حقائق کے معاملے میں ناانصافی سے کام لے رہے ہیں۔ طلباء کی سیاست میں تشدد کو شروع کرنے والے، ہم سب جانتے ہیں کون ہیں؟ اور پھر کس طرح اس سے ملک کی سیاست کے اندر ایک مسلسل ردعمل رونما ہوا۔ ابھی میرے ایک دوست نے، بلکہ کئی افراد نے یہ بات کہی کہ امیر جماعت اسلامی نے سندھ کے بارے میں جو بات کہی اس سے ان کو دکھ پہنچا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگتا لیکن مجھے ایک طرح سے یہ سوچ کر خوشی بھی ہوتی ہے کہ اسی دکھ سے شاید ہم مسئلے کا کچھ حل بھی نکال سکیں۔

بلاشبہ پیپلز پارٹی ایک مکمل پاکستانی پارٹی ہے ہم نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی صحیح معنی میں پاکستان کی ایک بڑی پارٹی ہے۔ ہم تو یہی خواہش اور دعا کرتے ہیں کہ اس ملک کی کوئی پارٹی علاقائی پارٹی نہ ہو بلکہ کل پاکستان پارٹی ہو۔ ان میں سے ہر ایک ہر جگہ عوام کا سامنا کرے اور ہر جگہ کے مسائل کو وہ اپنا مسئلہ سمجھے۔ لیکن کیا حقائق محض آپ کی خواہشات یا آپ کے دعوؤں سے نظر انداز کیے جاسکتے ہیں؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ سندھ میں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں سندھ کارڈ استعمال کیا گیا۔ ممتاز علی بھٹو صاحب کے دور میں جو اس وقت کے گورنر تھے۔ کیا کچھ نہیں ہوا؟ ان کو کیوں ہٹایا گیا؟ ان کو ہٹانے کی حقیقی وجوہات کیا تھیں جس کی بنا پر وہاں پر وہ تبدیلیاں لانا پڑیں۔ ایم آر ڈی کے بارے میں آپ آج بلاشبہ یہ کہہ دیں کہ وہ عدم تشدد پر مبنی تحریک تھی لیکن ذرا اس زمانے کے اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ میں بھی یہیں تھا آپ بھی یہیں تھے۔ اس طرح حقائق کا انکار

جو ہے وہ تاریخ کو بدل نہیں سکتا۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

ریاستی تشدد: جنابِ والا! میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ سڑکوں پر تشدد اور معاشی تشدد دونوں غلط ہیں، میں خود اس بات کا گواہ ہوں۔ پچھلے ہی ہفتے پانچ دن میں نے کراچی میں گزارے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ کس طرح ریاستی تشدد ہو رہا ہے۔ ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ میں نے خود یہ بات کہی کہ خدا کے لیے آپ رینجرز کو قابو کریں۔ میں خود دیکھ کر آرہا ہوں کہ کس طرح معصوم انسانوں پر گولی چلتی ہے اور کس طرح پورے محلے کا گھیراؤ کر کے بیس پچیس سے لے کر دو دو سو افراد کو وہ پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ بچوں کو اور بوڑھوں کو لے جاتے ہیں اور ان پر تشدد بھی کرتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ آپ کے ملک کا دستور یہ کہتا ہے کہ کسی شہری کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، آپ بلا وارنٹ گرفتار نہیں کر سکتے۔ آپ اس کا ریمانڈ لیے بغیر چوبیس گھنٹوں سے زیادہ اس کو اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔ لیکن یہاں یہ ہو رہا ہے کہ جس کو چاہتے ہیں اس کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ جب تک چاہتے ہیں تھانوں میں رکھتے ہیں۔ تہہ خانوں میں رکھتے ہیں۔ ایف آئی اے اور سی آئی اے کے تہہ خانوں میں رکھتے ہیں۔ اپنی ہی صوابدید پر بعض اوقات کچھ لوگوں کو چھوڑ بھی دیتے ہیں لیکن جب چاہتے ہیں انھیں نہیں چھوڑتے، حتّٰی کہ عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے جس میں اپنے بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ تو جنابِ والا! ہمیں سڑکوں پر تشدد اور ریاستی تشدد دونوں کو ختم کرنا ہے۔

تیسرا اصول، علاقائی و لسانی تعصبات کا خاتمہ: جنابِ والا! ہم یہ چاہتے ہیں کہ سندھ کارڈ استعمال نہ ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ مہاجر کارڈ بھی استعمال نہ ہو، ہم یہ چاہتے ہیں کہ بلوچ، پختون اور پنجابی کارڈ بھی استعمال نہ ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ صرف پاکستانی کارڈ استعمال ہو۔ ہم سب مل کر کے یہاں رہیں۔ میں صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام نے ہمیں جوڑنے اور ایک بنانے کا کام انجام دیا ہے اور یہ اسلام کی خوبی ہے کہ اس نے تنوع کا انکار نہیں کیا۔

اس نے زبان کو، مقامی حالات کو اور علاقائی تہذیب و تمدن کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے، تمھارے ماں باپ ایک ہیں اور ایک تمھاری بنیاد ہے لیکن:

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ
(الحجرٰت ۴۹:۱۳)

اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

ہاں اس کے بعد تم گروہ بھی بنے ہو، شعوب بھی بنے ہو، قبائل بھی بنے ہو، قومیں اور قومیتیں بھی بنی ہیں لیکن یہ تمھاری اصل پہچان نہیں ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ تمھاری اصل پہچان تمھارا ایمان اور تمھارا کردار ہے۔ تمھارا دین، تمھارا تقویٰ اور تمھارے اعمال ہیں۔ زبان کا فرق ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کو اسلام نے ہمیشہ قبول کیا ہے۔ لیکن جس طرح ایک باغ میں بہت سے پھول اور بہت سے رنگ ہوتے ہیں اور ہر پھول کا اپنا حسن اور اپنی خوشبو ہے، اسی طرح یہ سب مل کر کے ایک باغ بنتے ہیں۔ ہم سب اس باغ کے نگہبان ہیں اور اسے آگے بڑھانا چاہتے ہیں، اس میں حسن بڑھانا چاہتے ہیں، تو ہمیں یک رنگی اور یک جہتی پیدا کرنے والی چیز کو بنیاد بنانا چاہیے۔

چوتھا اصول، بے انصافی اور حقوق کی عدم ادائیگی کا خاتمہ: جنابِ والا! چوتھی چیز جو میں دونوں طرف کے اپنے بھائیوں سے کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مسائل کی اصل وجہ بے انصافی ہے۔ اصل وجہ لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنا اور حقوق کے حوالہ سے انھیں نظرانداز کرنا ہے۔ اس میں زیادتی کسی ایک نسلی یا لسانی گروہ کے ساتھ نہیں بلکہ ہر ایک کے ساتھ ہو رہی ہے۔ سندھ کے مجبور ہاری ہوں یا بلوچ اور پختون ہوں اور یا پنجاب کے غریب کسان سب بالادست طبقات کی زیادتیوں کا شکار ہیں۔ تو بجائے اس کے کہ ہم اس کو قومیتوں

کی جنگ بنائیں، آیئے ہم اس کو حق اور انصاف کی طرف لائیں۔ آئیں ہم سب مل کر اسے سب کے لیے حقوق کی فراہمی اور آزادی اور انصاف کے حصول کی جنگ بنائیں۔ یاد رکھیے کہ انصاف کبھی ترجیحی نہیں ہو سکتا۔

انصاف اور انتقام میں یہ فرق ہے کہ انصاف سب کے لیے مساوی ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ ایک طرف تو آپ کو گولیاں نظر آتی ہیں لیکن اگر وہی کام [ایم کیو ایم] حقیقی والے کرتے ہیں اور سر عام کرتے ہیں، یہ نہیں کہ چپکے سے کر رہے ہیں، سب کے سامنے کر رہے ہیں، اسلحہ لے کر پھر رہے ہیں، اسلحہ کی سر عام نمائش ہو رہی ہے لیکن وہ آپ کو نظر نہیں آتا۔ صرف آپ کو نظر نہیں آرہا ہے بلکہ اس سے پہلے جو ان کی سرپرستی کرتے رہے ہیں ان کو بھی نظر نہیں آتا تھا۔ یہی معاملہ [MQM] الطاف گروپ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ یہی معاملہ اوروں کے ساتھ بھی ہوتا آرہا ہے۔ یہ معاملہ ایک زمانے میں سب کے ساتھ ہوا ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے اور مجھے معاف کیجیے کہ میرا دل اس تصور سے کانپتا ہے کہ حکومت کے ایوانوں میں یہ مشورے بھی ہوئے ہیں کہ ایک گروپ کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے گروپ کو اسلحہ دیا جائے اور اس طرح وہ آپس میں مقابلہ کرتے رہیں۔ اس طرح آپ ملک کو خانہ جنگی کی طرف لے جائیں گے۔ یہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ بے انصافی، ظلم، تشدد، اسلحہ کا استعمال اور اسلحہ کا اظہار سب کے لیے ختم کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔

احساس محرومی: میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ فی الحقیقت ان حالات کو پیدا کرنے میں احساس محرومی کا بڑا حصہ ہے۔ بالخصوص سیاسی محرومی جو مارشل لاء کے ادوار میں پیدا ہوئی، اس کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ آج ہمارے دوست ترجیحی انداز میں مارشل لاء کے اس سپوت (گوہر ایوب خان) کا ذکر تو کرتے ہیں کہ لالو کھیت میں بندوق لے کر آیا تھا لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اسی آمر (جنرل ایوب خان) کے دائیں بازو پر اس کی حفاظت کے لیے اور اس کے چیف الیکشن ایجنٹ (ذوالفقار علی بھٹو) کے طور پر کون بیٹھا ہوا تھا، یہ ترجیحی نقطہ نظر ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں جو سب سے بڑا ظلم ہوا، وہ قوم کو سیاسی پارٹیوں

سے محروم کرنے کے لیے غیر جماعتی سیاست کی پالیسی اختیار کرنا ہے۔ اس پالیسی کے نتیجے کے طور پر عصبیتیں پیدا ہوئیں، برادریاں پیدا ہوئیں اور علاقائی سیاست شروع ہوئی۔ ان بنیادوں پر بننے والی تنظیموں اور گروہوں کی حوصلہ افزائی کی گئی، ان کو مالی طور پر مضبوط کیا گیا اور ان کو تربیت بھی دی گئی اور آج ہم ان حالات سے دوچار ہیں۔ اس لیے میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اور آپ پارٹی کے مفاد کی سطح سے بلند ہو کر سب کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار نہیں کریں گے، معاملات حل نہیں ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت ہے۔ درحقیقت جو بات میں کہہ رہا ہوں اس کا میں خود بھی مخاطب ہوں اور میں آپ سب کو بھی مخاطب کر رہا ہوں۔

پانچواں اصول، حل جمہوری اصولوں کو اپنانے میں: پانچویں چیز جنابِ والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس حقیقت کو ماننا چاہیے کہ جمہوری اصول ہی بنیادی اصول ہیں اور عوام جس کو اپنا نمائندہ قرار دیں ہمیں اس کو نمائندہ ماننا چاہیے۔ خواہ ہمیں اس سے اختلاف کیوں نہ ہو، بلاشبہ یہی ہماری جمہوریت ہے۔ کل پھر انتخاب میں جائیں اس کے لیے پھر عوام تک پہنچیں اور ان سے مینڈیٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں، اس کے اوپر مایوسی پیدا کرنے کی ہر کوشش بگاڑ پیدا کرے گی۔ درحقیقت جمہوریت میں جتنا کردار حزبِ اقتدار کا ہوتا ہے اتنا ہی کردار حزب اختلاف کا بھی ہوتا ہے اسی لیے جمہوریت میں اپوزیشن کو آنے والی حکومت کہا جاتا ہے۔ لیڈر آف دی اپوزیشن جو ہے اسے مستقبل کا وزیر اعظم کہا جاتا ہے۔ لیکن جناب مجھے بتائیے کہ کیا سندھ میں آپ نے وہاں کی اپوزیشن کو آنے والی حکومت کا مقام دیا ہے؟ کیا آپ نے وفاداریاں بدلنے کے لیے سرمائے اور رشوت کا اور تشدد اور دباؤ استعمال نہیں کیا ہے؟ یہ تمام چیزیں جمہوریت کو ختم کرنے والی اور عوام کے مینڈیٹ کی نفی کرنے والی ہیں۔ خدا کے لیے ان سے احتراز کیجیے۔ اس کے بغیر آپ کوئی اصلاح نہیں کر سکتے ہیں۔

جنابِ والا! ایک بات جو پہلے آگئی ہے مگر میں صرف موجودہ حالات کی بناء پر دوبارہ عرض کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ علاقائی و لسانی اور گروہی سوچ کو چھوڑ کر ہمیں قومی سوچ، پاکستانی

سوچ اور اسلام پر مبنی سوچ کو اپنانا ہے۔ جنابِ والا! میں کہنا چاہتا ہوں کہ گفتگو اور مذاکرات جس انداز میں بھی شروع ہوئے ہیں میں اس پر خوش نہیں ہوں۔ یہ مذاکرات دباؤ کے تحت ہو رہے ہیں۔ ایک طرف سے کہا جا رہا ہے کہ بات مانو ورنہ ہم علیحدگی کی بات کریں گے۔ اور یہ کہ غیر ملکی مداخلت بھی ہو سکتی ہے۔ حکومت کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ ہاں مذاکرت تو کرو مگر آپریشن جاری رہے گا۔ حکومت اسی طرح استعمال ہوتی رہی ہے۔ جنابِ والا! یہ ماحول مذاکرات کے لیے نیک فال نہیں۔ مذاکرات کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ماحول کو بہتر بنایا جائے۔

ماحول کو کس طرح بہتر بنایا جائے

میری نگاہ میں ماحول کو بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ضروری ہے کہ دونوں طرف سے خلوص کے ساتھ تشدد، احتجاج اور تصادم کے راستہ سے احتراز کیا جائے اور فی الحقیقت سیاسی بات چیت کو، مذاکرت کو آگے بڑھانے کا اور اس کو کامیابی تک پہنچانے کا موقع دیا جائے۔ اس سلسلے میں حکومت کی بھی ذمہ داری ہے کہ رینجرز اور پولیس جو اقدامات کر رہی ہے اسے روکا جائے۔ اس کی تازہ مثال ایک کونسلر کا پولیس کی تحویل میں مارا جانا ہے، یہ تمام چیزیں مذاکرات کے ماحول کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔ اسی لیے میں یہ کہوں گا کہ جو راستہ رینجرز نے اختیار کیا ہے کہ پورے پورے علاقے کا گھیراؤ کر کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنا، اسے فی الفور ختم کیا جائے۔ اس سے جڑی چیز یہ ہے کہ اگر اسلحہ فوری واپس نہ لے سکیں تب بھی اسلحہ کا جو شو آف ہے اسے کم از کم فوراً روکا جائے۔ پھر اس حوالہ سے انصاف بلا امتیاز اور سب کے ساتھ ہو۔ اس میں ایم کیو ایم الطاف گروپ بھی اور ایم کیو ایم حقیقی اور دوسرے گروہ بھی اور اس میں رینجرز بھی شامل ہیں۔

میں آپ کو اپنا واقعہ بتاتا ہوں، میں تقریباً کوئی دس دن پہلے کلفٹن سے قصر ناز کی طرف آرہا تھا۔ راستے میں میری گاڑی کو رینجرز نے روک لیا، آپ یقین مانیے پانچ چھ ان کی جیپیں تھیں اور ایک ان کا لیڈر تھا اور یہ سب نہ صرف بندوقیں اٹھائے ہوئے تھے بلکہ بندوقیں نشانہ کیے ہوئے تھے اور بلا مبالغہ جو رینجرز کا کمانڈر تھا اس نے پستول کے ٹریگر پر

انگلی رکھی ہوئی تھی۔ غور فرمایئے کہ کیا اس طرح آپ ڈسپلن کو قائم کرتے ہیں جب کہ میری گاڑی پر تو سینیٹر کی پلیٹ بھی لگی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی یہ رویہ ہوتا ہے۔

مسئلے کے حل کی تجاویز

غیر جانبدار انتظامیہ: اگلی چیز میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس بات پر آپ سنجیدگی سے غور کریں کہ کم از کم کراچی کی انتظامیہ کو، چاہے وہ عارضی انتظام کے طور پر ہو، غیر جانبدار بنائیں۔ اس میں پیپلز پارٹی کے لوگ بھی ہوں اور دوسری جماعتوں کے بھی وہ لوگ ہوں جو اس شہر میں معتبر ہوں اور غیر متنازعہ بھی ہوں۔ اس طرح آپ ایک اچھی فضا بنا سکتے ہیں، حتّٰی کہ وہاں مقامی حکومتوں کے انتخابات ہو سکیں جس طرف کہ میں ابھی آرہا ہوں۔ پھر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ان مذاکرات میں بھی جیسے کہ جناب چیئرمین (عبدالرحیم خان مندوخیل) آپ نے بھی اپنی تقریر میں غالباً اشارہ کیا تھا یعنی میری نگاہ میں اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے محض کراچی کا مسئلہ نہ بنایا جائے بلکہ کم از کم مبصر اور مددگار و معاونین کی حیثیت سے، ملک کے دوسرے مقتدر غیر متنازعہ افراد کو بھی شریک کیا جائے تاکہ وہ سب اپنی اپنی جگہ اثر انداز ہو سکیں۔ اس سلسلے میں جنابِ والا! میں یہ بھی کہوں گا کہ لفظوں کی جو جنگ جاری ہے یہ فوراً ختم کی جائے۔

سیاسی مقدمات: دوسرا مسئلہ مقدمات کا ہے۔ جنابِ والا! میں اس پر زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ اسی ہاؤس میں بڑی اچھی تجاویز آئی ہیں اور میں ان کی تائید کرتا ہوں یعنی پہلی تجویز ہے کہ جہاں تک ایم کیو ایم الطاف پر مقدمات کا تعلق ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ سب مقدمات پیپلز پارٹی کے زمانے میں نہیں بنے۔ بلاشبہ اس میں سے کچھ پیپلز پارٹی کے زمانے میں بنے ہیں، لیکن ۹۰-۱۹۸۸ء کے دور کو نہ بھولیے جب وہ آپ کے ساتھ حکومت میں شریک تھے اور نکل گئے تھے اور مقدمات نکلنے کے بعد بنائے گئے۔ پھر بعض مقدمات مسلم لیگ کے زمانے میں بنے یہ بات بھی آپ کی بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ملک میں سارے مقدمات حقائق پر مبنی نہیں ہوتے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے لوگ بھی اور ہم لوگ، میں خود بھی جیل میں رہ چکا ہوں اور آپ بھی جیلوں میں رہ چکے ہیں، ہم سب اس دور سے گزرے ہیں، ایوب صاحب کے زمانے میں بھی، بھٹو صاحب کے زمانے میں بھی، یعنی کتاب رکھنے کے جرم میں، اور وہ اسلحہ جو وہاں موجود ہی نہیں ہوتا ہے اس کے جرم میں، حتّٰی کہ بھینس چرانے کے جرم میں، سیاسی لیڈروں کو گرفتار کیا گیا ہے اور مقدمات بنائے گئے ہیں۔ اشتیاق اظہر صاحب کے اوپر بس کو جلانے، رہزنی اور لوٹ مار کا مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ یہ سب چیزیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے یہ تجویز جو یہاں آئی ہے، بڑی معقول تجویز ہے کہ ٹریبونل جس پر سب کا اعتماد ہو، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے جج پر مشتمل ہو وہ اس کو جانچیں اور جو چیزیں سیاسی انتقام پر مبنی ہیں ان کو ختم کر دیں۔ لیکن جہاں جائز مقدمات ہیں وہاں عدالتی کارروائی ضرور ہونی چاہیے۔ ہم اس کے حق میں نہیں ہیں کہ ہر چیز کو الجھا کر مسئلہ حل کیا جائے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گا کہ زیر حراست افراد کی کراچی میں ایک مسلمہ تعداد ہے۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ عدالتی ریمانڈ پر رکھ کر ان لوگوں کو ہراساں کریں یا جھوٹے انداز میں بار بار عدالتی ریمانڈ حاصل کریں، ان سب کی رہائی بھی بہت ضروری ہے۔

مقامی حکومت اور امن کمیٹیاں: اگلی بات جنابِ والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ امن کمیٹیاں بنائیں ایسی امن کمیٹیاں جو کسی ایک پارٹی سے نہ ہوں بلکہ علاقے میں متعلقہ حلقے کے لوگوں کی ہوں۔ بلدیاتی انتخابات کے بارے میں ایک بار پھر آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس کا اعلان کیجیے، چاہے آپ چار مہینے یا چھ مہینے بعد کی تاریخ کا اعلان کر دیجیے لیکن اس سمت میں آگے بڑھیے۔ اس وقت تک کے لیے کوئی عارضی نظام آپ بنالیں۔

صوبائی اسمبلی کا کردار: پھر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ صوبائی اسمبلی کو متحرک کیجیے۔ اس کی اپوزیشن کو اس کا مقام دیجیے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہ رہا کہ اس کو اقتدار میں شریک کرلیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ صوبائی اسمبلی کا ایک مثبت کردار ہے۔ صوبے کی سیاسی زندگی کے اندر اور کراچی کے حالات کے اندر اسے ادا کرنا بہت ضروری ہے۔

کراچی کے حقیقی مسائل پر توجہ: اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کراچی کے جو حقیقی مسائل ہیں جن میں تعلیم اور روزگار کا مسئلہ ہے، کچی آبادیوں اور ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہے، معاشی ترغیبات کا مسئلہ ہے، ان سب پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مجھے دکھ ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ ۱۹۷۲ کے بعد کراچی کے ساتھ معاشی پالیسی کی تشکیل میں امتیازی رویہ اختیار کیا گیا جس کے نتیجے کے طور پر بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ پورے ملک سے کراچی میں ہجرت کے سبب آبادی کا دباؤ بڑھا ہے لیکن کراچی کو بھرپور ترغیبات نہیں دی گئیں۔ نتیجتاً کراچی سے سرمایہ کہیں اور چلا گیا۔ سرمایہ کی منتقلی پر بڑی تحقیقات ہوئی ہیں ان سے استفادہ کیجیے۔

مردم شماری کا اہتمام: آخری چیز یہ ہے کہ آبادی کا شمار ضروری ہے ملک کے لیے یہ شرم ناک ہے کہ ہم مردم شماری کو بار بار ملتوی کر رہے ہیں۔ میں کہوں گا کہ اس کے لیے مردم شماری کا ادارہ بنایئے۔ جو پورے ملک میں آبادی کو شمار کرے اور جتنی جلدی یہ کام آپ کریں اتنا ضروری ہے۔

یہ چھ چیزیں ہیں۔ جنہیں میں جنابِ والا! آپ کی اجازت سے اس ایوان کے سامنے عوام کے سامنے، حکومت کے سامنے، قوم کے سامنے رکھتا ہوں اور اس دعا پر کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے کے لیے کھولے اور جس مشکل میں ملک گرفتار ہے اس سے ہم نکل سکیں۔ مذاکرات کامیاب ہوں حق اور انصاف کی بنیاد پر کامیاب ہوں۔ ملک کسی بڑے انتشار سے بچ جائے اور ہم سیاسی عمل کو یہاں جاری رکھ سکیں۔ (۱۲جولائی ۱۹۹۵ء)

باب نمبر ۶

سرکاری ملازمین کی فراغت اور بحالی

ناانصافی پر مبنی امتیازی فیصلے

محترمہ بے نظیر بھٹو نے دوسری بار وزیر اعظم بننے کے بعد سرکاری ملازمتوں میں ریٹائرمنٹ کے بعد رکھے گئے ملازمین کو 'سول سروس ایکٹ' کے تحت معاہدہ ختم کر کے فارغ کر دیا تھا۔ ان ملازمین میں بعض سینئر سائنسدان بھی شامل تھے۔ مختلف رپورٹس کے مطابق فارغ کیے گئے ملازمین کی تعداد ۱۵ ہزار تھی۔ پروفیسر خورشید احمد نے ان رپورٹوں اور بعض فارغ ہونے والے ملازمین کے ذاتی طور پر رابطہ کرنے پر اس مسئلے کو سینیٹ میں اٹھایا۔ جس پر حکومتی وزراء نے جواباً بتایا کہ وزیر اعظم نے یہ فیصلہ پیچھے آنے والے ملازمین کی ترقیوں اور بیروزگار نوجوانوں کے لیے مواقع پیدا کرنے کے لیے 'سول سروس ایکٹ' کے مطابق کیا ہے جس کے تحت حکومت معاہدہ پر رکھے گئے کسی بھی ملازم کو فارغ کر سکتی ہے۔ وزراء کے مطابق ذرائع ابلاغ میں فارغ شدہ ملازمین کی تعداد کے بارے میں بھی مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

اس موقع پر اور پھر پیپلز پارٹی کی تیسری حکومت (۲۰۱۳-۲۰۰۸ء) کے دوران ملازمت کی فراغت اور بحالی کے حوالے سے ہی امتیازی روّیوں پر پروفیسر خورشید احمد نے جو تقاریر کیں وہ بھی اس باب کا حصہ ہیں۔

کنٹریکٹ سرکاری ملازمین کی سبکدوشی

جناب چیئرمین! اطلاعات کے مطابق نئی حکومت نے فوری طور پر ایک ماہ کے نوٹس پر سرکاری و نیم سرکاری اور خود مختار اداروں میں کنٹریکٹ پر رکھے گئے اور ۶۰ سال کی عمر کو پہنچنے والے تقریباً پندرہ ہزار ملازمین کو فارغ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس سے ہزاروں

خاندان متاثر ہوں گے۔ یہ ایک اہم اور فوری نوعیت کا مسئلہ ہے اس لیے سینیٹ کی معمول کی کارروائی روک کر اس پر بحث کی جائے۔

اس واقعہ کے بارے میں ان اطلاعات کی تردید نہیں آئی ہے اور تفصیلات کے مطابق تین نوعیت کے ملازمین کو فارغ کیا گیا ہے۔

۱۔ جنہیں حکومت نے کنٹریکٹ پر ملازم رکھا تھا۔ بلا لحاظ اس کے کہ ان کی عمر یا کنٹریکٹ کی مدت پوری نہیں ہوئی ہے۔ جو نئی حکومت آئی ہے وہ ایک مہینے کا نوٹس دے کر ان کو فارغ کر دیتی ہے۔

۲۔ وہ افراد جن کی عمر اگرچہ ساٹھ سال سے زیادہ ہے لیکن ان میں بہت سے افراد غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہیں اور آپ نے ان کو ان کی خدمات کے عوض جن کا سرے سے کوئی بدل موجود نہیں ہے، قومی ضروریات کے تحت ملازمت پر رکھا ہوا ہے۔ آپ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ یہ ضرورت ہے قوم کی۔ مثلاً میں خاص طور پر اشارہ کروں گا تحقیق اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں ہونے والے کاموں کی جانب۔ تمام دنیا میں پروفیشنلز کو عمر سے نہیں ناپا جاتا بلکہ ان کی خدمات اور ان کی مناسبت سے ان کو موقع دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے کچھ اقدامات کرتے ہوئے عمر دیکھی جاتی ہے لیکن محض یہ وجہ کہ ایک شخص کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہے اس کی بنیاء پر اس کی خدمات کو نظر انداز کر دینا درست طرز عمل نہیں ہے۔ اگر وہ بعض قومی اداروں میں، بہبود کے اداروں میں، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اداروں میں خدمات انجام دے سکتا ہے اور آپ نے اس کی خدمات کو کنٹریکٹ پر لیا ہے تو بالکل الل ٹپ انداز میں اس کو ختم کر دینا ایک بڑا ظلم ہے۔

۳۔ ساتھ ہی جنابِ والا! میں یہ بھی کہوں گا کہ اس معاملے میں امتیاز برتا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ تمام افراد جو اس کیٹیگری میں آتے ہوں ان سب کو فارغ کر دیا گیا ہو۔

جنابِ والا! اگر پندرہ ہزار افراد کو بیک جنبش قلم نکال دینا اور ان کے اہل خاندان کو اس طرح سے متاثر کرنا قومی اہمیت کا مسئلہ نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ وزراء کے لیے یہ کوئی بات نہ ہو لیکن مجھے ایک عام انسان کی حیثیت سے روز مرہ ان لوگوں سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اور میرے پاس وہ اپنی مصیبتیں لے کر کے آتے ہیں تو میرا فرض ہے کہ میں اس مسئلہ کو ایوان میں لے آؤں اور میں نے اسی لیے یہ مسئلہ آپ کے سامنے رکھا ہے کہ حکومت کے ایک اقدام سے قومی اہمیت کا بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ ایسے میں یہ بات کہنا کہ یہ مسئلہ لا کر میں قواعد کی کوئی خلاف ورزی کر رہا ہوں، میں سمجھتا ہوں یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

جنابِ والا! میری اس تحریک کا تعلق ان تمام افراد سے ہے جن کی تعداد ہماری اطلاعات کے مطابق ہزاروں میں ہے، جنہیں حکومت نے کنٹریکٹ پر نیم سرکاری اداروں میں یا گورنمنٹ کے ماتحت خود مختار اداروں میں ملازمت دی تھی اور جو کام کر رہے تھے اور اس کے بعد سے ایک پالیسی فیصلے کے تحت انھیں فارغ کیا جا رہا ہے واضح رہے کہ فراغت اس بنا پر نہیں کہ کسی کی پرفارمنس خراب تھی یا کسی نے اپنے کنٹریکٹ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اگر ایسے کوئی حالات ہوں تو بلاشبہ اقدام کیا جا سکتا ہے بلکہ کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ ایک دھاندلی زدہ کارروائی ہے کہ تمام افراد جو کسی خاص زمانے میں رکھے گئے تھے خواہ ان کا تعلق کسی بھی حکومت سے ہو انھیں فارغ کر دیا جائے۔

جنابِ والا! میں یہ بات نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اس ملک کی روایت بن گئی ہے کہ جو نئی حکومت آتی ہے وہ پچھلے والوں کو نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہم نے اس قسم کا سوال اس وقت بھی اٹھایا تھا جب پہلے پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تھی اور اس وقت بھی اٹھایا تھا جب آئی جے آئی کی حکومت آئی تھی اور اس وقت بھی اٹھایا تھا جب نگران حکومت نے یہ کام کیے تھے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق عوام سے ہے، لوگوں کے روزگار سے ہے اور ان خدمات سے ہے جو یہ افراد ملک کے لیے کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہے تو آپ بلاشبہ فارغ کیجیے، ان کو سزا دیجیے لیکن ہزاروں افراد کو اس طرح حکومت کی تبدیلی کے ساتھ نکال دینا، یہ صریحاً

ایک زیادتی ہے اور یہ دراصل ہمارے ملکی نظام سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ہمارے ملک کا جو ایڈمنسٹریٹو نظام ہے اچھا ہے یا برا ہے لیکن وہ امریکی نظام نہیں ہے جہاں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ بیوروکریسی بدلتی ہے۔ ہمارے ہاں ایڈمنسٹریشن کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ بیوروکریسی جو بھی ہے اور کوئی بھی حکومت اسے نامزد کرے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ اس پس منظر میں خصوصیت سے میں سمجھتا ہوں کہ اسے یہاں زیر بحث لانا چاہیے۔

جناب چیئرمین! میں دونوں محترم وزراء کا ممنون ہوں جنہوں نے اپنے نقطہ نظر کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا لیکن میں بڑے ادب سے ان سے گزارش کروں گا کہ میری بات پر تھوڑا سا ٹھنڈے دل سے غور کریں اور جذبات میں اس مسئلے کو نہ لیں۔

میری پہلی گزارش یہ ہے کہ کیا یہ ہمیں پوری تفصیل بتا سکتے ہیں کہ کوئی بھی شخص جو اگرچہ ۶۰ سال سے زیادہ کا ہو گیا ہو، اور وہ نہ صرف استعداد کار رکھتا ہو اور کسی اہم ذمہ داری پر کام کرتا رہا ہو بلکہ قوم اور ملک کو اس کی ضرورت بھی ہو اس کو کس بنیاد پر آپ فارغ کر رہے ہیں۔ میں یہ عرض کروں گا کہ بلاشبہ ۳۰ سال سروس پر ریٹائرمنٹ ایک اچھی چیز ہے اور یہ بات بھی ضروری ہے کہ نئے لوگوں کے لیے جگہ پیدا ہو لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۶۰ سال کے بعد جو افراد اپنے میدان میں، حکومت کے کسی ادارے میں، خاص طور پر انجینئرنگ اور تحقیقی اداروں میں ہیں ان کا کردار بڑا اہم ہو سکتا ہے۔

جنابِ والا! میں کوئی انوکھی بات نہیں کر رہا۔ دنیا بھر میں یہ روایت موجود ہے، مثلاً انگلستان کی یونیورسٹیوں میں یہ اصول ہے کہ ۶۰ سال کے بعد جو بھی پروفیسر کام کرنا چاہتے ہیں اور یونیورسٹی یہ سمجھتی ہو کہ ہاں وہ ایسا کر سکتے ہیں تو پروفیسر ریسرچ کے طور پر وہ کام کرتے ہیں۔ سب اداروں کے اندر ان لوگوں کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ سیاست میں آپ دیکھ لیجیے ۷۵-۷۰ اور ۸۰ سال کی لیڈرشپ بھی قوموں کو قیادت مہیا کرتی رہی ہے۔ ان معاملات میں میرٹ ہونا چاہیے۔ اگر کنٹریکٹ پر کسی شخص کو سفارش کی بنیاد پر

حکومت میں رکھا گیا تھا، یہ بڑا ظلم تھا۔ اس صورت میں جواز ہو گا اور جو حکومت بھی ایسے نااہل افراد کو نکالے گی میں سمجھتا ہوں کہ وہ اچھا اقدام کرے گی۔ اسی طرح سے جن لوگوں کو سیاسی بنیاد پر فائدے پہنچانے کے لیے ترقیاں دی گئی ہیں، ٹھیکے دیئے گئے ہیں، پیپلز پارٹی نے دیئے ہیں یا مسلم لیگ نے دیئے ہیں وہ غلط تھے، وہ غلط رہیں گے اور جو بھی ایسے لوگوں کے معاہدہ میں توسیع کرے گا وہ غلط ہو گا اور سب سے زیادہ بدنام ہو گا۔ لیکن اس کا سہارا لے کر کے یہ اصول پیش کر دینا کہ ۶۰ سال کے بعد سب لوگ از کار رفتہ ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات نہ حقیقت سے مطابقت رکھتی ہے نہ نسل انسانی اس کی تائید کرتی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں کتنے ہی سائنسدان ہیں جو ۶۰ سال نہیں ۷۰ اور ۸۰ سال کے ہیں اور ایسے ایسے کام کر رہے ہیں جن پر انہیں نوبل پرائز مل رہے ہیں، ان کی خدمات کا اعتراف ہو رہا ہے دنیا کے اندر عمر کی ڈیڈ لائن کی بنیاد پر یہ فیصلے نہیں ہوتے ہیں یہ فیصلے قابلیت پر ہوتے ہیں۔ البتہ اگر آپ کنٹریکٹ پر رکھنے کے نظام کو ہی ختم کر رہے ہوتے کہ کنٹریکٹ غلط ہے اور کنٹریکٹ پر آئندہ کوئی تقرری نہیں کریں گے تب آپ کی بات کسی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔

لیکن جب تک آپ کنٹریکٹ کا نظام لاگو رکھتے ہیں اور اس کو استعمال کرتے ہیں آپ کے اقدام کا کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر جہاں سے آپ لوگوں کو فارغ کرتے ہیں وہیں انہیں دوبارہ مقرر کیوں کرتے ہیں۔ اگر آپ یہ بات کہتے ہیں کہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر ہم اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ تو پھر آپ کو چاہیے کہ سب کی دوبارہ تقرری کریں۔ اور اگر آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ نہیں کنٹریکٹ اپنی جگہ صحیح ہے۔ ہم ایک ایک کیس کی دوبارہ جانچ کریں گے اس کے بعد میرٹ پر تقرری کریں گے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور اگر کوئی ایسی کمیٹی بنی ہے جس نے معروضی تجزیہ کیا ہے اس کے بعد فیصلے کیے ہیں۔ تو یہ قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن اگر ایسے طریقے سے سو افراد یا پچاس افراد کو واپس لیا جاتا ہے اور جو لوگ متاثر ہو چکے ہیں وہ پندرہ سولہ ہزار ہیں تو یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میں یہ جاننا چاہوں گا اور حکومت کو

اس معاملے میں ہمیں اعتماد میں لینا چاہیے کہ پوری حکومت چاہے وہ فیڈرل گورنمنٹ سروس ہو، یا اس سے متعلقہ محکموں کی سروس ہو خود مختار ادارہ ہو یا نیم خود مختار ادارہ ہو، ان میں کل کتنے افراد کنٹریکٹ پر تھے۔ ان میں سے کتنے کو نکالا گیا ہے۔ جن کو نکالا گیا ہے ان کے لیے کس طریقہ پر عمل کیا گیا ہے اور کیا انہیں اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کا موقع دیا گیا ہے، یہ تفصیلات ہمارے سامنے آئیں۔ مجھے پتہ نہیں ایک ہفتے میں آپ کتنے ہزار افراد کے کام کو جانچ کر کے معروضی طور پر طے کر سکتے ہیں کہ ان کی سروسز جاری رکھنی چاہیے یا نہیں؟

مجھے ایسے افراد سے کوئی دلچسپی نہیں جنہیں سیاسی سرپرستی کی خاطر توسیع دی گئی ہو یا ترقی دی گئی ہو۔ میں تو ذکر کر رہا ہوں ان پندرہ سولہ ہزار مقدمات کا جو اخبار میں رپورٹ ہوئے ہیں اور جنہوں نے مجھ سے خود رابطہ کیا ہے۔ اس معاملے میں حکومت پورے حقائق ہمارے سامنے لائے۔ کتنے ہزار افراد کنٹریکٹ پر ہیں اور ان میں سے کتنوں کو نکالا گیا ہے اور جنہیں نکالا گیا ہے ان کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ جنہیں کنٹریکٹ پر رکھا گیا ہے انہیں کیوں رکھا گیا ہے اور دوسروں کو کیوں نکال دیا گیا ہے تو یہ معاملات ہیں جن پر اعتماد میں لینا چاہیے۔ (۲۸ دسمبر ۱۹۹۳ء)

مختلف اداروں میں چھانٹی

میں بہت ہی اختصار سے آپ کی توجہ اور آپ کے توسط سے حکومت کی توجہ مختلف اداروں میں ہونے والی چھانٹی کی جانب دلانا چاہوں گا اور اس سلسلہ میں خاص طور پر حزبِ اختلاف کی مدد بھی چاہوں گا۔ یہ اطلاعات ملی ہیں کہ سوئی ناردرن میں کنٹریکٹ ملازمین سے بیگار کا کام لیا جا رہا ہے، ان پر تلوار بھی لٹک رہی ہے اور ان کو تنخواہیں بھی نہیں مل رہی ہیں، لوگ سخت پریشان ہیں۔ اسی طرح مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ یوٹیلیٹی سٹورز کے کنٹریکٹ ملازمین کی بڑی تعداد کو فارغ کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت لوگوں کے جو حالات ہیں، ان کے لیے روزگار کے بغیر زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں رہا۔ دوسری جانب آپ ان کو تنخواہ بھی نہیں دیتے اور سرسری طور پر کارروائی کے ذریعہ نکال دیتے ہیں۔

یہ تمام چیزیں انسان کش ہیں، یہ ملک کے مسائل میں اضافہ کر رہی ہیں اور خاص طور پر جو کمزور اور غریب طبقات ہیں، ان کے مسائل میں اضافہ کر رہی ہیں۔ خدا کے لیے آپ یہ نہ کریں کیونکہ آپ کا دعویٰ یہی رہا ہے کہ آپ عوام کے نمائندے ہیں اور آپ کے سامنے سب سے زیادہ اہمیت غریب طبقات کی ہے لیکن اس وقت غریب طبقات سب سے زیادہ پس رہے ہیں۔ میں سوئی ناردرن اور یوٹیلیٹی سٹورز کارپوریشن کے بارے میں چاہوں گا کہ آپ تفصیلات بتائیں۔ جو باتیں مجھ تک پہنچی ہیں، اگر وہ صحیح ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ باتیں صحیح ہیں تو آپ ان کے معاملہ کو کس طرح ایڈریس کر رہے ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو جو کام کر رہے ہیں، ان کو معاوضہ ملے اور جو مستقل ہونے کے مستحق ہیں، ان کو مستقل کیا جائے اور جو کنٹریکٹ ملازمین ہیں، ان کو اس طرح نکالنا کسی لحاظ سے اخلاقی، سیاسی اور قانونی طور پر درست نہیں ہے۔ (۶ فروری ۲۰۱۲ء)

پندرہ سال قبل سبکدوش ہونے والے ملازمین کی بحالی کا قانون

جناب چیئرمین! میں سب سے پہلی بات تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اللہ تعالیٰ، اس ملک کے عوام اور دستور تینوں کے سامنے جواب دہ ہیں اور ہمیں اپنے ضمیر اور حق وانصاف کے مطابق ہر چیز کے متعلق معاملات کو طے کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں خصوصاً قانون سازی بہت اہم ہے جس کی اہمیت کسی وقتی فیصلہ کی نہیں ہوتی بلکہ جو ایک مستقل چیز ہے اور ایک حیثیت سے آج اور آنے والے کل کے لیے مثال قائم کرتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس دور میں بھی میرٹ کے بغیر کوئی تقرری سیاسی بنیادوں، اقربا پروری، دوست نوازی، بے جا ترجیح کی بنیاد پر ہوئی ہے، وہ غلط ہے اور اس کا دفاع میری نگاہ میں قانون، اخلاق، سیاست، اس ملک کے مفاد، غرض کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ اسی طرح جس دور میں بھی درست طور پر کسی مقرر کردہ شخص کو، جسے میرٹ پر ایک ذمہ داری دی گئی تھی، بغیر صفائی کا موقع دیے ہوئے، سیاسی انتقام کی بنیاد پر برطرف کیا گیا ہے، نکال باہر کیا گیا ہے، وہ غلط ہے، وہ غلط رہے گا اور اس کی تلافی ہونی چاہیے۔ یہ بنیادی چیز ہے۔

اب آپ اس قانون[۱] کو دیکھیے! پہلی بات یہ ہے کہ یہ قانون ایک امتیازی قانون ہے۔ پاکستان کی پوری تاریخ میں سے اس قانون کے تحت ساڑھے تین سال کے 'متاثرین' منتخب کیے گئے ہیں۔ گویا کہ صرف ان ساڑھے تین سالوں میں جو لوگ مقرر ہوئے ہیں یا نکالے گئے ہیں، اس قانون کا تعلق ان سے ہے باقی لوگوں سے نہیں۔ یہ دستور کے خلاف ہے اس لیے کہ دستور میں یہ واضح لکھا ہوا ہے کہ سب برابر ہیں اور امتیاز نہیں برتا جائے گا لیکن یہ امتیازی ہے۔

نمبر دو، اس میں ایک گول مول بات کہی گئی ہے کہ 'جسے بھی ہٹایا گیا ہے'، یعنی نکالنا، برطرفی، سبکدوشی اور گولڈن ہینڈ شیک یہ چاروں چیزیں اس کے اندر شامل ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص کا سروس کا چھوڑنا خواہ وہ مستقل ہو یا عارضی معاہداتی ہو یا جزوقتی ہو، اگر ان چاروں میں سے کسی بھی شکل میں ہوا ہے اس میں شامل ہے۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک کی شکل برابر نہیں ہے۔ گولڈن ہینڈ شیک اور چیز ہے، اور برطرفی ایک بالکل مختلف چیز ہے ان کو بھی انہوں نے ایک جگہ بریکٹ کر دیا ہے۔

جنابِ والا! یہ بات بار بار کی جارہی ہے کہ یہ غریبوں کا معاملہ ہے۔ جناب چیئرمین! میں نے اس کو بار بار پڑھنے کی کوشش کی ہے اور مجھے اس میں کہیں یہ لکھا ہوا نظر نہیں آیا کہ کس آمدنی اور کس تنخواہ اسکیل کے لوگوں پر یہ قانون لاگو ہو گا۔ درحقیقت یہ گریڈ ایک تا ۲۲ سب پر لاگو ہو گا، حتّٰی کہ اگر ایم ون اور ایم ٹو والا بھی کوئی ہے تو وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ تو یہ بات کہنا کہ یہ غریبوں کا مسئلہ ہے، صحیح نہیں ہے۔ جو معلومات دی گئی ہیں اگر وہ صحیح ہیں، افراد کی تعداد کئی ہزار اور معاوضے کا معاملہ ۲۱، ۲۰ ارب روپے کا ہے تو یہ ملک کے

---

[۱] پیپلز پارٹی نے اپنے تیسرے دور حکومت (۱۳-۲۰۰۸ء) میں ۸ دسمبر ۲۰۱۰ء کو مجلس شوریٰ کی منظوری سے ایک قانون پاس کرایا اس قانون کے مطابق یکم نومبر ۱۹۹۳ء تا ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء کے دوران جن سرکاری یا نیم سرکاری اداروں اور کارپوریشنوں سے ملازمین کو برطرف یا سبکدوش کیا گیا اور بعض صورتوں میں جبراً گولڈن ہینڈ شیک دیا گیا انھیں اس قانون کے تحت ریلیف دیتے ہوئے اپنے، اپنے اداروں میں بحال کیا گیا۔ بحالی کے اس عمل میں ان ملازمین کو ۱۹۹۳ء سے لے کر ۲۰۱۰ء تک تمام واجبات، ترقیاں وغیرہ ملا کر ادا کیے گئے۔

ساتھ بھی کسی طرح صحیح رویہ نہیں ہے جو اس وقت شدید مالی بحران میں ہے۔ اس وقت ہر سرکاری ادارہ اضافی عملے سے بھرا ہے اور نقصان میں جا رہا ہے، تقریباً چار سو ارب روپے آپ امدادی رقم دے رہے ہیں اور ان اداروں کے نقصانات پورے کر رہے ہیں۔ اگر آپ بلا امتیاز بحالی کرتے ہیں تو یہ محض غریبوں کے لیے نہیں بلکہ یہ مفاد پرستوں کے لیے ہے اور یہ خاص عرصے سے متعلق ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ نومبر ۱۹۹۳ء کی پہلی تاریخ سے ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء تک کے یہ لوگ کون سی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کوئی فرشتے ہیں یا آسمان سے نازل ہوئے ہیں، اور کیا ان سے پہلے والے سب گنہگار تھے؟ سب خاکی تھے، سب ناکارہ تھے؟ اور ان کے بعد والے بھی۔ اگر آپ میں انصاف کی کچھ بھی حس ہوتی تو آج آپ جو قانون ۱۹۹۳ء سے لا رہے ہیں اور بقیہ ماضی کو نظر انداز کر کے لا رہے ہیں تو اسے آج تک لاتے۔ اور یوں کسی بھی دور میں، خواہ پیپلز پارٹی کا دور ہو یا مسلم لیگ کا اور یا خواہ مشرف دور ہو، جو بھی غیر قانونی طور اور غلط بنیادوں پر نکالا گیا ہے اسے بحال کرتے اور معاوضہ دیتے۔ لیکن اندھا دھند برطرفی اور بحالی حق و انصاف اور ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔

جنابِ والا! میں ساتھ ہی یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے اندر گولڈن ہینڈ شیک بھی شامل کیا گیا ہے۔ گولڈن ہینڈ شیک کے لیے ایک نیا لفظ اختراع کیا گیا ہے کہ جبری گولڈن ہینڈ شیک۔ یہ الزام تراشی پر مبنی ایک جذباتی اصطلاح ہے، جبری گولڈ ہینڈ شیک ہو ہی نہیں سکتا اور اگر ہوا ہے تو آپ کو اسے الگ کیٹیگری بنا کر، ہر ایک کیس اور اس کی ایک ایک چیز کو دیکھنا پڑے گا۔

جنابِ والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس کام کے لیے کوئی ٹریبونل بھی بنایا جا سکتا تھا۔ اگر یہ کوئی ایسا ٹریبونل بنا دیتے جو تمام معاملات کو میرٹ پر دیکھنے کے بعد ان پر نظر ثانی کرتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کہا جا رہا ہے کہ لوگ سپریم کورٹ میں اور ٹریبونل میں گئے ہیں لیکن مشرف کے دور میں ان کے فیصلوں کو نہیں مانا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہے

تو ان سب فیصلوں کی تنفیذ ہونی چاہیے، اسے قانون کے دائرہ میں لائیے۔ لیکن یہ بات کہ سپریم کورٹ یا ٹربیونل نے جو فیصلہ کیا ہے اسے اور خواہ کسی اور قانون میں جو صورت حال بھی ہے، ان سب کو نظر انداز کر کے یہ قانون سب سے بالا ہو گا یہ کسی بھی طرح دیکھا جائے حق اور انصاف کے خلاف ہے۔

جنابِ والا! ایک اور نا قابل فہم بات یہ ہے کہ اس کے اندر وہ ادارے جو ختم ہو چکے ہیں، تحلیل ہو چکے ہیں، دیوالیہ ہو چکے، وہ بھی شامل ہیں۔ ان اداروں کے ملازمین کے لیے بھی اس کے اندر ایک راستہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ میری نگاہ میں شدید امتیازی اور نا منصفانہ ہے۔ یہ محض ایک سیاسی چیز ہے اور ہم محض اس دعوے پر کہ یہ غریبوں کے لیے کیا جا رہا ہے، وھوکہ کھانے کو تیار نہیں ہیں۔ (نومبر ۲۰۱۰ء)

پی آئی اے میں کنٹریکٹ ملازمین کا مسئلہ

جناب چیئرمین! پہلی بات یہ ہے کہ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن، بد قسمتی سے کئی سال سے بحران کا شکار ہے اور ہمیں دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ حکومت خصوصاً وزارتِ دفاع جس کے تحت یہ ادارہ کام کر رہا ہے اس نے مسئلے کی اہمیت کا پوری طرح احساس نہیں کیا۔ وزارتِ دفاع کے افسران کی وقت کی کمی کی جو قیمت اس ملک کو ادا کرنا پڑی اس کا انھیں شعور نہیں ہے۔ میں دفاع اور دفاعی پیداوار کمیٹی کا رکن ہوں اور ہم کئی سال سے بار بار اس مسئلے کو اٹھا رہے ہیں۔ ایک سب کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے چیئرمین سینیٹر طارق عظیم صاحب تھے اور میں بھی اس کمیٹی میں شامل تھا۔ ہم نے پوری کوشش کی کہ معروضی طور پر حالات کا جائزہ لیں اور دو اور دو چار کی طرح ٹھوس تجاویز دیں کہ کس طرح اس بحران سے نکلا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری سفارشات پر کسی نے کان نہیں دھرا۔

ہمارے سامنے یہ بات کہی گئی کہ یہ قومی ادارہ ہے جو مسلسل خسارے میں جا رہا ہے۔ ملک میں اور ملک کے باہر بدنامی ہو رہی ہے اور سب سے زیادہ پی آئی اے سے سفر کرنے

والوں کے لیے پریشانی اور مشکلات اور سلامتی کو خطرات لاحق ہیں۔ بلاشبہ یہ بڑے سنجیدہ معاملات ہیں اور بھرپور ترجیح دے کر اس ادارے کی اصلاح کی کوشش ہونی چاہیے تھی لیکن بد قسمتی سے نہ انتظامیہ اور نہ حکومت نے اس معاملے میں کوئی مؤثر اقدام اب تک لیا ہے۔ خسارہ بڑھتا جارہا ہے، جہاز پرانے ہیں، سروس خراب ہے، پروازوں کا التواء اور منسوخی اور پھر عملے کی طرف سے مؤثر تعاون اور سہولت نہ ہونا اور صحیح سروس نہ دینا یہ زمینی صورتحال ہے۔ اس میں گہرائی میں جاکر انفرادی واقعات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور بڑے بڑے مسائل کو بھی سامنے رکھا گیا ہے لیکن بے حسی اپنی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جناب والا! ہماری کمیٹی نے یہ بات بھی تجویز کی تھی کہ سب سے اہم چیز اس کا ایک پیشہ ور ادارے کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کو کیسا ہونا چاہیے، اس کا معیار کیا ہونا چاہیے، اسے کس طریقے سے اقربا پروری اور سفارش سے پاک ہونا چاہیے۔ ہم نے اس معاملے میں بھی ٹھوس تجاویز دی ہیں لیکن ان پر کوئی رد عمل نہیں ہوا۔

جناب چیئرمین !مالی مسئلہ تھا جس میں ایک سوال یہ تھا کہ حکومت زر تلافی دے یا قرضہ دے۔ ہم نے پی آئی اے کے فنانس ڈیپارٹمنٹ کو موقع دیا کہ ہمیں متبادل منصوبہ بنا کر دے۔ انہوں نے آئیڈیاز دیے ہیں۔ ہم نے ان میں سے ہی ایک کو ترجیح دی۔ اس میں حکومت کے خزانے سے کوئی مدد نہیں ہونی تھی۔ لیکن جنابِ والا! مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے اور میں پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ فنانس ڈیپارٹمنٹ کے جس آزاد فنانشل کنسلٹنٹ نے تجاویز دی تھیں اس کو کان سے پکڑ کر نکال دیا گیا اور معاملات وہیں کے وہیں رہے۔ کمیٹی کے ریکارڈ میں ساری تفصیل موجود ہے۔ اس کو منگوا کر دیکھ لیں۔ میں اپیل کروں گا وزیر دفاع سے کہ خدا کے لیے اس ادارے کو بچانے کے لیے فوری اقدام کریں۔

پارٹی کے مفادات اور سیاسی مفادات سے بالا ہو کر ایک قومی ادارے کی حفاظت کے لیے جو تجاویز خود آپ کی کمیٹی نے، پی آئی اے اور وزارتِ دفاع دونوں کے مشورے سے، دوسرے ماہرین کو اور پیشہ ور حضرات کو بلا کر مرتب کی ہیں ان پر عمل کیجیے۔ ان تجاویز کو

آج دو سال ہونے کو ہیں مگر ان پر کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ اگر یہ کارکردگی اور بے حسی ہو گی اور یہ بری حکمرانی ہو گی تو پی آئی اے بھی بحال نہیں ہو سکتی اور دوسرے سرکاری شعبے کے کاروباری ادارے جس بحران کے شکار ہیں اور جس طرح ایک بے پانی کی دلدل بن گئے ہیں اس سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقت ہے کہ سینیٹ حکومت کی توجہ مرکوز کرائے، ان کا احتساب ہو اور جو چیزیں بتائی جا چکی ہیں کم از کم ان پر عمل کر کے اس بحران سے نکلنے کا راستہ اختیار کرے۔ (۶ فروری ۲۰۱۲ء)

پلاننگ کمیشن میں تقرریاں

جناب چیئرمین! حقیقت یہ ہے کہ پلاننگ کمیشن ایک حیثیت سے سرکاری دماغ ہوتا ہے، وہاں آپ نے جو تقرریاں کی ہیں وہ میرے لیے بہت ہی حیران کن ہیں۔ چھ تقرریاں آپ نے کی ہیں۔ ڈپٹی چیئرمین، جس کا عہدہ وفاقی وزیر کا ہے اور جسے آپ MP-I سکیل دے رہے ہیں ایک لاکھ پچانوے ہزار تنخواہ اور دیگر سہولیات، لیکن اس کا کوئی تجربہ منصوبہ بندی و ترقیات کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر اشفاق بہت عالم فاضل لوگوں میں سے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ قومی سرمایہ ہیں، ان کا وہاں ہونا ہمارے لیے باعث اعزاز ہے۔ (پوری ٹیم میں صرف وہی ایک فرد ہیں جن کا کوئی جواز پیش کیا جا سکتا ہے۔) میں سوال کرنا چاہوں گا کہ لیفٹیننٹ جنرل محمد زبیر کا تجربہ کیا ہے۔ انھوں نے بی ایس سی انجینیئرنگ کیا ہوا ہے اور ان کی تنخواہ عام ممبر سے بھی زیادہ، دو لاکھ پچیس ہزار مقرر کی گئی ہے اور اس کے بعد دیگر سہولتیں ہیں۔ ڈاکٹر راشد امجد وہ لائق لوگوں میں سے ہیں لیکن وہ پہلے ہی وائس چانسلر ہیں، PIDE (پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس) کے قائم مقام چیف اکانومسٹ بھی رہے ہیں۔ اب آپ کے ممبر ہیں لیکن وہ کہاں کہاں سے تنخواہ لے رہے ہیں۔ بطور وائس چانسلر اگر کل وقتی ملازمت ہے تو اس کے بعد ممبر پلاننگ ہونے کے بعد دو لاکھ چالیس ہزار بنیادی

تنخواہ کا کیا جواز ہے۔ اور پھر ان کا کوئی تجربہ اس فیلڈ کا نہیں ہے[1]۔

دوسری بات یہ ہے کہ منصوبہ بندی کمیشن میں ضرورت ہوتی ہے کہ دو قسم کے تعلیم یافتہ لوگ آئیں۔ ایک وہ جو اپنے شعبوں کے ماہرین ہوں اور اس طرح ممبر کی حیثیت سے اپنے شعبہ میں منصوبہ بندی کا جو پورا وژن ہے اس کے تقاضے پورے کر سکیں اور دوسرے وہ جن کی رائے عامہ سے واقفیت بھی ہو کہ جو عوام کے مسائل، جذبات اور خواہشات کا بھی وہاں خیال رکھ سکیں۔ موجودہ تقرریوں سے تو بہت ہی گنجلک صورت حال سامنے آئی ہے بلکہ میں اسے خطرناک صورتحال کہوں گا۔

اگلی بات میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جو اسکیل اب دیے گئے ہیں وہ کس بنیاد پر طے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ ڈپٹی چیئرمین سے بھی زیادہ معاوضہ زبیر صاحب کو کیا اس لیے دیا جارہا ہے کہ وہ فوجی ہیں۔ کیا اس سے پہلے جو منصوبہ بندی کمیشن تھا اس کو یہی اسکیل دیے جارہے تھے۔ میں خود ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن رہا ہوں اور اس زمانے میں تنخواہوں کے اسکیل کو غیر ضروری طور پر متاثر کیے بغیر ایک نہیں ۸ پی ایچ ڈی معیشت داں، منصوبہ بندی کمیشن میں ہم لائے تھے۔ میں جاننا چاہوں گا کہ کیا فی الحقیقت اس وقت کیا جانے والا جمع جوڑ ملک میں منصوبہ بندی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اور کیا یہ انصاف کے مطابق ہے یا یہ اپنے قریبی دوستوں کو کھپانے اور انھیں غیر معمولی تنخواہیں دینے کے لیے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک پر جو بوجھ ہے اس کے حوالہ سے صورتِ حال کو بہتر بنانے میں پلاننگ کمیشن کا کردار بہت اہم ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا منصوبہ بندی کمیشن اس ترتیب میں فی الحقیقت کوئی نتائج پیدا کر سکتا ہے جو اس وقت کے چیلنجز اور تقاضے کو پورا کر سکیں۔

---

[1] قبل ازیں پروفیسر خورشید صاحب کے ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا تھا کہ پلاننگ کمیشن میں مندرجہ ذیل افراد کا تقرر کیا گیا ہے۔ (۱) جناب سلمان فاروقی (سابق وفاقی سیکرٹری) (۲) لیفٹیننٹ جنرل محمد زبیر (بی ایس سی انجینئرنگ) (۳) جناب اکرم ملک (پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ) (۴) ڈاکٹر راشد امجد (پی ایچ ڈی اکنامکس) (۵) جناب اعجاز رحیم (ایم اے) (۶) ڈاکٹر اشفاق حسن خان (پی ایچ ڈی اکنامکس)

جنابِ والا! جہاں تک افراد کی ذات کا تعلق ہے، خدا گواہ ہے کہ میں کسی کے بارے میں کبھی کوئی ذاتی بات کہنا پسند نہیں کرتا اور نہ اس کی معلومات میرے پاس ہیں۔ میرے لیے ہر ایک محترم ہے۔ لیکن یہ میں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ پلاننگ کمیشن ریٹائرڈ بیوروکریٹس کی آخری جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر آپ کو باصلاحیت آدمی چاہییں اور مختلف شعبوں کے چاہییں تاکہ وہ مل کر منصوبہ بندی کا کام سرانجام دے سکیں۔ جب میں اس پہلو سے دیکھتا ہوں تو جو چھ افراد آپ نے بتائے ہیں یہ اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں تضادات موجود ہیں۔ فوج کے پس منظر سے جو آیا ہے، اس کا منصوبہ بندی کا کوئی تجربہ ہمارے سامنے نہیں آیا لیکن آپ اس کو غیر معمولی معاوضہ دے رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ محض جرنیل کو کھپانے کے کے لیے کیا گیا ہے۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ آخر معاوضوں میں فرق کیوں ہے اور خاص طور پر امتیازی فرق ایک ریٹائرڈ فوجی کے بارے میں کیوں کیا گیا ہے؟ رہی یہ بات کہ جو معیشت دان ہیں آیا وہ اپنی تنخواہ پلاننگ کمیشن سے لے رہے ہیں یا بطور وائس چانسلر لے رہے ہیں یا بطور قائم مقام چیف اکانومسٹ لے رہے ہیں یا صرف ان کے لیے ایک تنخواہ ہے اور باقی وہ رضاکارانہ کام کر رہے ہیں، یہ تفصیلات میں جاننا چاہتا ہوں اور یہ میرا حق ہے۔

میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ اس وقت آپ پلاننگ کمیشن والوں کو جو تنخواہ اور الاؤنسز دے رہے ہیں وہ ماضی سے کیا مطابقت رکھتا ہے۔ مجھے یہ بتا دیجیے کہ جو کچھ اس وقت دیا جارہا ہے آیا یہی پچھلے دس سال میں یا اس سے پہلے دیا گیا۔ میں جس زمانے کے بارے میں واقف ہوں اس وقت یہ صورتحال نہیں تھی۔ اب اگر بدلی ہے تو ہمیں اس کی معلومات دیجیے۔

(۲۹ اگست ۲۰۰۸ء)

فیڈرل پبلک سروس کمیشن میں تقرریاں[1]

جناب چیئرمین! قانون سازی ایک بڑی اہم ذمہ داری کا اور نازک کام ہے اور اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ افراد کو سامنے رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ قانون سازی کی جاتی ہے اداروں کے لیے، اصولوں کے لیے، ضابطوں کے لیے، طریقہ کار کے لیے اور قوم کے لیے۔ درحقیقت قانون سازی جب بھی کسی خاص شخص کو سامنے رکھ کر ہٹانے یا لانے کے لیے کی جائے تو اس سے بڑا ظلم، قانون سازی کے عمل پر نہیں ہو سکتا۔

سرکاری افسروں کی تقرری کا اختیار

دوسری بات یہ ہے جنابِ والا! کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن ایک دستوری ادارہ ہے اور ملک میں جو انتظامی ڈھانچہ ہے اس کا محافظ اور ضامن ہے۔ یہ انتظام اس لیے ہے کہ سروس میں لانے کا اختیار کچھ مخصوص لوگوں کی رائے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بغلی دروازے کا راستہ جب بھی اختیار کیا گیا ہے اس کے تباہ کن اثرات ہم نے دیکھے ہیں۔ وفاقی ملازمتوں میں تقرریاں

---

[1] فیڈرل پبلک سروس کمیشن آئینی طور پر (۱۹۷۱ء) میں قائم کیا گیا جس کے فرائض میں حکومت پاکستان کے انتظام کو چلانے کے لیے اہل افسران کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کمیشن میں عدلیہ، انتظامیہ اور ماہرین پر مشتمل سلیکشن بورڈ بنایا گیا۔ جن کی معیادِ ملازمت تین سال تھی اور میرٹ پر صرف ایک بار توسیع کی جاسکتی تھی۔

جنرل پرویز مشرف نے ۲۰۰۱ء میں ایک آرڈیننس کے ذریعے کمیشن کے ممبران اور چیئرمین کی معیادِ ملازمت کو تین سال سے بڑھا کر پانچ سال کر دیا تھا، کہا گیا کہ اس کا مقصد کمیشن کی پالیسیوں میں استحکام پیدا کرنا ہے اور کارکردگی کو بہتر بنانا ہے۔ اس زمانے میں لیفٹیننٹ جنرل گلزار جمشید کیانی کو کمیشن کا چیئرمین مقرر کیا گیا لیکن بعد میں جنرل کیانی اور جنرل مشرف میں افسران کے پروموشن اور تقرری پر اختلاف پیدا ہو گئے۔ گویا جنرل کیانی نے حکومت کی جانب سے مختلف افسران کے حق میں یا ان کے خلاف سفارش کو ماننے کے بجائے میرٹ پر فیصلے کیے جس پر فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے قانون میں ۲۰۰۶ء میں ترمیم کی گئی جس کے ذریعے کمیشن کے چیئرمین اور ممبران کی معیادِ ملازمت پانچ سال سے گھٹا کر تین سال کر دی گئی جس کے نتیجے میں جنرل کیانی کو فارغ کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور ممبر بھی فارغ ہو گئے۔ سینیٹ میں جب یہ قانون زیرِ بحث آیا تو اس سے قبل اخبارات میں ان تمام معاملات پر مضامین شائع ہوئے۔ خود کمیشن کے سابق چیئرمین نے پریس کانفرنس کر کے ان حالات کا تذکرہ کیا۔ تمام ہی جماعتوں سے سینیٹ کے ممبران نے اس بل پر اپنی تقاریر میں اس قانون کی خامیاں گنوائیں لیکن حکومت نے اکثریت کے بل پر اس قانون کو پاس کر لیا۔

مقررہ طریقہ کار کے ذریعے سے ہونا چاہییں اور وہ طریقہ کار پبلک سروس کمیشن ہے۔ اس لیے آفیسر کیڈر کے لیے آپ عارضی ملازمت تو دے سکتے ہیں، کسی کی معاہداتی تقرری بھی کر سکتے ہیں لیکن کسی بھی فرد کو کیڈر کا حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سے اس کی تقرری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دستور نے اس کو ایک ذمہ داری قرار دیا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ ایک طرف پبلک سروس کمیشن کے دائرہ اختیار سے چیزوں کو نکالا جا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے پہلے آرڈیننس کے ذریعے چند ایجنسیوں میں تقرریاں جو ہمیشہ سے پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ہوا کرتی تھیں ان کو اس کے دائرہ اختیار سے نکال دیا گیا ہے تاکہ من مانی سے جن کو چاہیں آپ نواز سکیں۔ اس طرح درحقیقت سروسز کو سیاست زدہ کرنے اور اوپر نیچے کرنے اور ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ بے شمار تقرریاں ہیں جو پبلک سروس کمیشن کے بغیر ہو رہی ہیں اور غیر معمولی حالت میں کنٹریکٹ پر تقرری کی جو گنجائش رکھی گئی تھی اس کا بے محابا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جو ظلم کیا گیا ہے وہ پبلک سروس کمیشن کے ادارے کو بطور ادارہ تباہ کرنے کا کام ہے۔

کمیشن کی دستوری حیثیت

جنابِ والا! ۱۹۷۱ء کے قانون کے تحت پبلک سروس کمیشن ایک دستوری ادارہ ہے ادارہ کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ یہ سول سروسز اور عدلیہ سے مہارت رکھنے والے افراد پر مشتمل ایک متوازن ادارہ ہو۔ یہ ادارہ اب کم و بیش دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ سے اپنا کام کر رہا تھا۔ اس کے اندر ارکان کی تقرری کی مدت تین سال تھی لیکن تجدید کی گنجائش بھی تھی۔ اس طرح ایک شخص کو ایک لچکدار انتظام کے اندر چھ سال مل جاتے تھے۔ جنرل مشرف نے برسراقتدار آنے کے بعد اور بڑے طمطراق سے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ سول سروسز کو سیاست سے پاک کرنے کے لیے میں یہ کام کر رہا ہوں عملاً اس کے نظام میں سیاست داخل کر دی۔ آج ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ غلطی سے ہو گیا تھا لیکن غلطی نہیں تھی۔ اخبارات میں

موجود جنرل مشرف صاحب کے اس بیان کو پڑھ لیجیے جو اب تاریخی ریکارڈ کا حصہ ہے کہ میں اس [ادارہ] کو سیاست سے پاک کرنا چاہتا ہوں تاکہ خالص قابلیت پر یہاں تقرریاں ہوں اور یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تقرریاں تین سال کے بعد قابل تجدید ہو جائیں، بلکہ تین سال کے بجائے اسے پانچ سال کر رہے ہیں تاکہ یہ مستحکم عرصہ ہو۔ اپنی جگہ یہ ایک اچھا قدم تھا اور ہمیں توقع تھی کی شاید پبلک سروس کمیشن اپنا موثر کردار ادا کر سکے۔ لیکن ہوا کیا؟

ہوا یہ کہ جن افراد کو وہ اپنی پسند سے لائے تھے اور جن کا پچھلا ریکارڈ بڑا اچھا تھا انہوں نے وہاں آکر وزیر اعظم کے ناروا مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ چیز ریکارڈ پر ہے، میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں مقدمات کو پڑھ لیجیے۔ اور اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن جو آئینی ادارہ ہے اس نے اپنی سرکاری رپورٹ میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے کام میں مداخلت کی گئی، ہمیں مخصوص لوگوں کو لانے کے لیے کہا گیا اور ہم نے اس کو نہیں مانا۔ اور اس کی سزا ان کو یہ ملی کی سب سے پہلے ان کی تیار کی گئی اس رپورٹ کو رسمی طور پر پیش کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ نتیجتاً وہ رپورٹ پارلیمنٹ میں نہیں آسکی۔

اس کی خبر ہمیں اس طرح ملی کہ اپنی پٹیشن میں انہوں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ اور جب خاص طور پر اس بارے میں انہوں نے بتایا تو پھر سزا یہ دی گئی کہ تقرری کی پانچ سال کی مدت کو گھٹا کر تین سال کر دیا جائے یعنی: یہ ترمیم بالخصوص اس کمیشن کے کسی خاص شخص (ممبر) کو سزا دینے کے لیے کی گئی ہے۔ تاکہ ایک جانب اس میں عمر کم ہو جائے اور دوسری جانب مخصوص افراد کو تین سال کی مدت پوری ہونے کی بناء پر ادارہ سے ہی نکال دیا جائے۔ اس سے زیادہ کھلا کھلا مذاق دستور کے ساتھ، قانون کے ساتھ، ضابطوں کے ساتھ، جمہوریت کے ساتھ اور سول سروس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔

افراد کو نگاہ میں رکھ کر قانون میں ترمیم

میں یہ سوال اٹھاتا ہوں جنابِ والا! یہ مسلمہ اصول ہے کہ قانون مؤثر بہ ماضی نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں یہ بھی کیا گیا کہ چونکہ خاص افراد کو نشانہ بنانا تھا اس لیے قانون میں وہ دفعات ڈالی گئیں جس کے نتیجے کے طور پر ایک ایک شخص کو کان سے پکڑ کر نکالا جاسکے۔ یہ بڑا ہی گھناؤنا کھیل ہے۔ آپ پاکستان کے بیرونی دنیا میں تاثر کی باتیں کرتے ہیں اگر پاکستان کا تاثر کسی چیز سے خراب ہوتا ہے تو وہ آپ کا یہی طرزِ عمل ہے۔ آپ کی فوجی وردی، آپ کی وعدہ خلافیاں، آپ کی سیاست گردی، آپ کی پبلک سروس کمیشن میں اس طریقہ سے مداخلت اور عدالت میں لوگوں کا جانا اور یہ بتانا کہ ہم کو اس طریقے سے نکالا جارہاہے کہ ہم غیر قانونی اور بلاجواز احکام کو ماننے کے لیے تیار نہیں پاکستان، پاکستانی قوم اور حکومت کا تاثر خراب کر رہی ہیں۔ میں کمیشن کے ارکان کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کیا۔

لیکن جنابِ والا! اگر سینیٹ بھی اس قانون کو منظور کرتی ہے تو ہم بھی اس خطرناک، گھناؤنے، غیر دستوری، غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر جمہوری کھیل کے شریک ہو جائیں گے۔ اس لیے میں عرض کروں گا اور سرکاری پارٹی کے ارکان کے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہوں گا کہ خدا کے لیے سوچیئے! آپ نے اس ملک کے دستور کے تحفظ کا حلف اٹھایا ہے کچھ پاسداری کیجیے، مسئلہ میرا اور آپ کا نہیں ہے یہ مسئلہ آنے والی نسلوں کا ہے۔ مسئلہ حق، دستور اور قانون کا ہے۔ خدا کے لیے محض یہ دیکھ کر اپنے ضمیر کو دباؤ کا شکار نہ کیجیے کہ جرنیل آپ سے کیا مطالبہ کر رہا ہے۔ اپنے ضمیر کے ساتھ انصاف کیجیے اور اس غلط قانون کو رد کر کے یہ ثابت کر دیجیے کہ پارلیمنٹ دستور کی محافظ ہے۔ پارلیمنٹ ان اقدار کی محافظ ہے جن پر دستور قائم ہے۔ بلاشبہ اس طرح ہم اندرون وبیرون ملک ایک صحیح پیغام دے رہے ہوں گے[1]۔ (۱۸ ستمبر ۲۰۰۶ء)

---

[1] سینیٹ میں اس بحث کے باوجود حکومت نے اکثریت کی بنیاد پر قانون منظور کرالیا۔

باب نمبر ۷

سفارت کاری: کارکردگی اور کردار

جنابِ والا! مجھے امریکہ میں بھی اور انگلستان میں بھی پاکستانی سفارت خانوں اور قونصل خانوں میں بار بار جانے کا موقع ملا ہے۔ میں جب بھی کسی ملک کا دورہ کرتا ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے سفیروں کو مطلع بھی کروں۔ بحیثیت مجموعی جو کام امریکہ میں انہوں نے حال ہی میں کیا ہے۔ خصوصیت سے دو چیزیں ایک ویب سائٹ اور دوسری نیٹ ورکنگ کے لیے ڈیٹا بیس کی تیاری یہ دونوں بڑی اچھی تبدیلیاں ہیں۔ اس کو اور بھی زیادہ مؤثر انداز میں آگے بڑھانے اور خصوصیت سے ماہانہ بنیاد پر اپ گریڈ کیا جانا چاہیے۔ البتہ یہ ضرور لمحہ فکریہ ہے کہ امریکہ میں آپ کے پاس ابھی صرف تیس ہزار پاکستانیوں کا ڈیٹا بیس ہے جبکہ میرے علم کی حد تک وہاں پاکستانیوں کی تعداد ایک ملین کے لگ بھگ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں سے صرف تیس ہزار کا ڈیٹا بیس آپ کے پاس ہونا، آغاز کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن اس کی فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کام آگے بڑھایا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آپ نیٹ ورک میں پر لائیں تاکہ ان جدید ذرائع سے ابلاغ بھی ہو، معلومات بھی جائیں اور وہ آپ سے رابطہ بھی کر سکیں۔

جنابِ والا! اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وزارت نے ہمارے سوال کے جواب میں سفارت خانوں کے جو کام رکھے ہیں اور جنہیں نمایاں کیا ہے، اس میں تین نکات کھل کر سامنے آتے ہیں۔ پہلا جو بہر حال ہر سفارت خانے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ متعلقہ میزبان حکومت کے اداروں سے رابطہ اور ان تک پاکستان کا نقطۂ نظر پہنچانا۔ دوسرا پاکستانی کمیونٹی سے رابطہ اور ان کے مسائل کا حل یہ بہت بڑا کام ہے اور تیسرا کام ملک کے لیے سرمایہ کاری

اور تجارت کے بارے میں رابطے۔ یہ تینوں امور اہم ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ چند مزید چیزیں ایسی ہیں جن کی نشاندہی کرنا ضروری ہے کہ یہ بنیادی ضروریات ہیں اور ان کو پورا کرنا ہمارے سفارت خانوں کے پیش نظر ہونا چاہیے۔

موجودہ چیلنج: میری نگاہ میں اس وقت سب سے بڑا چیلنج پاکستان کے تصور کے بارے میں تاثر کو درست کرنا ہے۔ اس کے لیے میزبان ملک میں رائے عامہ کے اداروں اور افراد تک اپنی بات پہنچانا ازبس ضروری ہے۔ پاکستان کو اس وقت خاص طور پر ہدف بنایا جارہا ہے اور اسی طرح اسلام کو اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک خاص منصوبے کے تحت کام ہورہا ہے اور اسی لیے اس سلسلے میں ہماری بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اسلام کے بارے میں بھی، مسلمانوں کے بارے میں بھی اور خاص طور پر پاکستان کے بارے میں۔ خصوصیت سے اس لیے کہ پاکستان کو مذہبی مسائل کے اوپر کارنر کیا جارہا ہے۔ آج دنیا میں ہمارے سفارت کاروں کا فرض ہے کہ رائے عامہ بنانے والوں تک صحیح حقائق پہنچائیں، صرف ذرائع ابلاغ ہی نہیں بلکہ رائے عامہ تشکیل دینے والے تمام افراد اور ادارے ہمارا ہدف ہوں۔ اس کے لیے ہمیں باقاعدہ پروگرام بنانا چاہیے۔ دفتر خارجہ کو لٹریچر تیار کرنا اور بھجوانا چاہیے۔ مثال کے طور پر کئی سفارت خانوں میں، میں گیا ہوں اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ کشمیر کے اوپر آپ کے پاس کیا مواد موجود ہے تو آپ یقین مانیے کہ متعلقہ افراد نے یہ بات کہی کہ ہمارے پاس عام لوگوں کو دینے کے لیے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ یہ صورت حال نہیں ہونی چاہیے۔ جتنے بھی ہمارے بنیادی مسائل ہیں ان کے بارے میں لٹریچر تیار کیجیے باقاعدہ آگہی دیجیے، فرد مقرر کیجیے اور ہر سفارت خانے کو اس طرف متوجہ کیجیے۔

دوسری چیز جس کی طرف میں چاہتا ہوں کہ خصوصیت سے آپ توجہ دیں وہ میڈیا ہے۔ اس وقت ایک ابلاغی جنگ ہے پاکستان کے خلاف، جھوٹ پر مبنی اطلاعات پھیلائی جارہی ہیں حتّٰی کہ جن خبروں کی وضاحت کردی جاتی ہے وہ بھی بار بار، مختلف انداز میں چھپتی ہیں حالانکہ صحافت کا یہ ایک اصول ہے کہ کسی ایک اخبار میں اگر کوئی ایک رپورٹ آجاتی

ہے تو پھر دوسرا اخبار اس کو نہیں چھاپتا لیکن یہاں صورتحال یہ ہے کہ پاکستان کے خلاف ایک مقدمہ مثال کے طور پر ''ٹائم'' میں چھپا ہے تو وہ دوسرے اخباروں میں چھپنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا چیلنج ہے جس کی طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جنابِ والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ انگلستان میں اس وقت ہماری بہت باصلاحیت سفیر ہیں لیکن جو سہولیات وہاں موجود ہیں وہ ناکافی ہیں۔ برمنگھم جہاں پاکستان کمیونٹی کی بہت بڑی تعداد ہے وہاں بارہا مجھے جانے کا موقع ملا ہے۔ اس قونصل خانے کی عمارت اچھی حالت میں نہیں۔ سیڑھیوں ہی سے بدبو آتی ہے۔ قالین بری حالت میں ہیں اور مناسب طور پر کمپیوٹر کا استعمال بھی نہیں ہے۔ لوگ صبح ۱۰ بجے آتے ہیں اور چار بجے تک وہاں بیٹھے رہتے ہیں، چار افراد وہاں کام کر رہے ہیں اور ان کے پاس میز نہیں ہے۔ اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں سے وسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً برمنگھم کے بارے میں آپ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کا بجٹ تقریباً ایک لاکھ اسی ہزار یورو کا ہے جبکہ جو آمدنی وہ آپ کو دے رہے ہیں وہ ایک ملین یورو کے قریب ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا جدید طریقہ استعمال کریں اور انھیں ترغیب بھی دیں کہ وہ جو آمدنی پیدا کر رہے ہیں، عام خرچے کے علاوہ ترغیب کے طور پر اس کا حصہ انہیں سہولتوں کو بہتر بنانے کے لیے مل سکتا ہے۔ تو کمپیوٹر کا استعمال، عملے کو بڑھانا، لوگوں کو سہولتیں دینا، کمیونٹی کے لوگوں کو مدد دینا یعنی یہ ساری چیزیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا اس کام کی طرف توجہ دی جائے تو آپ پر مالی بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔ میں چاہوں گا کہ اس پر خصوصی توجہ دی جائے۔

اس سے پہلے بھی میں نے اس طرف متوجہ کیا تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسا نظام نگرانی کا ہونا چاہیے کہ جس میں خاص طور پر ہمارے تجارتی، تعلیمی اور لیبر اتاشی جو مخصوص ذمہ داریوں کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کی مانیٹرنگ ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہاں کتنا کام ہے اور وہ اس میں کس حد تک فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے مجھ سے تو سارے لوگ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں لیکن کمیونٹی کے لوگوں نے جہاں جہاں میں گیا ہوں بڑی شکایت کی ہے۔

شکایات بھی خاص طور پر لوگوں کے رویے کے بارے میں ہیں۔ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اگر کسی کا کام نہ بھی کر سکیں تو اس کو اچھی طرح سن لیجیے، اس کو مشورہ دیجیے، بتا دیجیے آپ کی کیا مشکلات ہیں لیکن اگر آپ ایک افسرانہ اور تحکمانہ انداز میں ان سے معاملات کریں گے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بہت سے طلباء اسکالرز جو تعلیم اور تحقیق کے لیے بیرون ملک جارہے ہیں ان کو بڑی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ میرے علم کی حد تک خصوصاً انگلستان کے اندر اس طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ امریکہ میں ہمارے ساتھ امتیازی طور پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے نتیجے کے طور پر انگلستان میں طلباء کا داخلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو بیچارے اپنے وسائل سے اور پیٹ کاٹ کے جاتے ہیں، ان میں سب بہت رئیس لوگ نہیں ہیں ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ دسیوں طلباء مجھ سے آکر ملے ہیں جو کہ اوسط وسائل والے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور خاندان نے اپنے پیٹ کاٹ کر کے انہیں بھیجا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ان لوگوں کی ہم کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ کیا وہاں غیر سرکاری اداروں اور دوسرے ذرائع سے کسی طرح ان کی امداد کا انتظام کر سکتے ہیں؟ یہ بڑا ضروری کام ہے۔ دفتر خارجہ کو دوسری وزارتوں کے تعاون سے اس پر توجہ دینی چاہیے۔ جنابِ والا! اسی بنا پر میں ان کے جواب کی بڑی قدر کرتا ہوں، میں نے اس کو غور سے پڑھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وزارتِ خارجہ نے کچھ اچھا اقدام کیا ہے۔ تاہم میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے اور جن چند موٹی موٹی چیزوں کی طرف میں نے متوجہ کیا ہے، مجھے توقع ہے کہ دفتر خارجہ ان کی فکر کرے گا۔ (۲۱ جنوری ۲۰۰۴ء)

جدہ میں پاک و ہند مشاعرہ میں پاکستانی سفیر کی تقریر: جناب چیئرمین! میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا۔ میں آپ کی توجہ اور آپ کے توسط سے حکومت کی توجہ خاص طور پر وزارتِ امور خارجہ کی توجہ ''نوائے وقت'' میں آج جو ایک بڑی دلخراش خبر شائع ہوئی ہے

اس کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ خبر کے مطابق جدہ میں پاکستانی کونصلر کی صدارت میں ایک پاک و ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا ہے۔ اس حد تک کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ مشاعرہ بہت اچھی چیز ہے اور ہماری تہذیبی روایت کا حصہ ہے۔ لیکن ہر ملک اور قوم کی اپنی کچھ روایات، عزت اور مقاصد ہوتے ہیں۔ پاکستانی سفارتی عملہ کو ان قومی روایات اور تصورات سے باخبر بھی ہونا چاہیے اور اپنی سرگرمیوں میں ان کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں کہ کونصلر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے کہ 'دیوار برلن گر سکتی ہے تو پاکستان بھارت تعلقات کیوں قائم نہیں ہوسکتے'۔

تعلقات کے قائم ہونے سے کسی کو انکار نہیں، بھارت کے ساتھ تعلقات تو پہلے دن سے موجود ہیں بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگیں ہوئی تب بھی تعلقات رہے۔ مسئلہ تعلقات کا نہیں ہے، نہ مسئلہ دوستی کا ہے، نہ مسئلہ حقیقی طریقے پر معاشی یا سیاسی معاملات کا ہے۔ مسئلہ پاکستان کے بنیادی تصور اور نظریہ سے متعلق ہے۔ دیوار برلن کی مثال پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے دینا، یہ پاکستان کے تصور، پاکستان کی بنیاد، پاکستان کے وجود کے حوالہ سے ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ہم نے یہ تقسیم کسی تعصب کی بنیاد پر نہیں کی ہے اور نہ اس کی حیثیت اس ظلم پر ہے جس پر کہ دیوار برلن قائم ہوئی تھی۔ یہ ہمارے عقیدے اور ہماری تاریخ کی بنیاد پر ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے لیکن آپ ذرا دل سنبھال کر بیٹھیے ابھی آگے بھی سنیں۔ اس موقع پر ہندوستان سے آئے ہوئے ایک شاعر نے ہندوستان کی تقسیم اور قائد اعظمؒ پر اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا، نقل کفر، کفر نہ باشد۔ میں مصرع پڑھ کر سناتا ہوں کہ ؏

وہ بے وقوف زمین بانٹ کر بہت خوش ہے

اور پھر اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ نام لے کر کہا کہ میں یہ ۱۹۴۷ء کے بارے میں کہہ رہا ہوں اور جو پاکستانی شاعر وہاں بیٹھے ہوئے تھے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا، اس دفتر کی طرف اشارہ کرکے کہ اس نے پاکستان بنایا۔

بلاشبہ مجھے خوشی ہے کہ ایک پاکستانی شاعر نے اس کا بروقت جواب دیا اور یہ بات کہی کہ ہمیں پاکستان کے قیام پر فخر ہے، تقسیم ہمارے عقیدے اور ہمارے تاریخی تقاضوں کے مطابق ہوئی ہے اور اس پر پورے ہال نے ان کی تائید کی لیکن پاکستان کے سفارت کار کا اس قسم کا مشاعرہ منعقد کرنا، اس کی موجودگی میں ان ساری چیزوں کا ہونا، اس کا خاموش رہنا اور اس سے بڑھ کر یہ کہنا کہ اگر دیوار برلن گر سکتی ہے تو گویا کہ پاکستان اور ہندوستان ایک ہوسکتے ہیں۔ جنابِ والا! یہ قومی خود مختاری پر ایک ضرب ہے اور ہمارے فارن آفس کے ذمہ دار افراد کی سرپرستی میں ایسا ہونا بہت ہی افسوسناک ہے۔ میں اس پر احتجاج کرتا ہوں، اس کی مذمت کرتا ہوں اور مطالبہ کرتا ہوں کہ حکومت پاکستان اس معاملے میں بروقت اور مؤثر کارروائی کرے تاکہ دوسروں کو اس کی ہمت نہ ہو۔ (۱۶ مئی ۲۰۰۶ء)

ملک شام میں پاکستانی اسکول: جناب چیئرمین! میں مندرجہ ذیل مسئلے پر وزیر خارجہ کی توجہ چاہتا ہوں قومی اخبارات میں خبر آئی ہے کہ شام میں پاکستانی سفیر نے پاکستان اسکول کے اساتذہ اور عملے کو جو اسکول کو بہتر انداز میں چلا رہے تھے سرسری احکامات کے تحت فارغ کر دیا اور اپنے رشتہ داروں کو انتہائی قابل اعتراض انداز میں ملازمت پر رکھ لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وزیر خارجہ ایوان کے سامنے تمام تفصیلات لائیں۔

پہلی بات میں یہ عرض کروں کہ پاکستان نے باہر جو اسکولز قائم کیے ہیں، میرے علم کی حد تک یہ اسکول ان میں سے نہایت ہی اچھے اسکولوں میں سے ایک ہے۔ جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں ان کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس اسکول میں ۲۰۰۹ء سے پہلے تک ۲۰۰ طالب علم تھے جو ۲۰۰۹ء میں ۱۱۰۰ تک پہنچ گئے۔ اس کی جو کل آمدنی تھی یہ ۱۰ء۲ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۲۰۰۹ء میں ۷۷ء۴ ملین ڈالر ہو گئی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کی شہرت اتنی اچھی تھی کہ وہاں کے وزیر خارجہ اور متعدد ڈپٹی منسٹرز کے بچے یہاں پڑھ رہے تھے۔ تقریباً چالیس قومیتوں کے لوگ اس اسکول میں تھے اور اس اسکول کو اس کے نتائج کی بنیاد پر غالباً سات یا آٹھ گولڈ میڈل بھی ملے تھے۔ یہ اس کا ریکارڈ ہے۔

اب آپ دیکھیے ہوا کیا ہے؟

خبروں کے مطابق شام میں صدر زرداری کی جانب سے مقرر کردہ نئے سفیر نے پاکستان انٹر نیشنل اسکول دمشق کے تمام انتظامی اور تدریسی عملے کو سرسری احکامات کے ذریعے نکال دیا ہے اور اپنے خاندان کے قریب ترین افراد کو فوری طور پر ملازم رکھ لیا ہے جن کی ماہانہ تنخواہ ۳۸ ہزار ڈالر (جو اس وقت ۳۳ لاکھ روپے) بنتی ہے۔

اساتذہ اور عملے کو جو ایمبیسی کا اسکول چلا رہے تھے بلا وجہ اور بلا پیشگی نوٹس کے نکالا گیا ہے اور انہیں مقدمہ بازی کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ جس سے پاکستان کو بدنامی مل رہی ہے۔ نئے سفیر امین اللہ رئیسانی کی ستمبر ۲۰۰۹ء میں دمشق آمد کے پانچ ماہ کے اندر پاکستان ایمبیسی اسکول کے اساتذہ اور انتظامیہ کو تبدیل کر دیا گیا۔

مقرر کیے گئے نئے عملے کی فہرست کے مطابق سعیدہ یاسمین رئیسانی کو، جو سفیر کی بہن ہیں پرنسپل مقرر کیا گیا ہے جو ماہانہ ۶۵۰۰ ڈالر تنخواہ لے رہی ہیں جبکہ سابقہ پرنسپل سید توصیف بخاری ۲۵۰۰ ڈالر ماہانہ تنخواہ لے رہے تھے۔ سفیر صاحب کی ایک اور بہن مس عباس کو ۳۵۰۰ ڈالر ماہانہ پر اردو ٹیچر رکھا گیا ہے دو بیٹیوں آمنہ امین اللہ رئیسانی اور قرۃ العین امین اللہ رئیسانی کو تین تین ہزار ڈالر ماہانہ پر ٹیچر رکھا گیا ہے جبکہ پہلے اساتذہ کو اسکول ۱۶۰۰ ڈالر ماہانہ ادا کر رہا تھا۔ سفیر صاحب کے برادر نسبتی محمد اسحٰق کو ۳۵۰۰ ڈالر ماہانہ پر اکاؤنٹینٹ مقرر کیا گیا ہے۔

جو بات میں کہہ رہا ہوں، میں خود سے نہیں کہہ رہا بلکہ یہ عالمی میڈیا میں آئی ہے۔ میرے پاس اس ضمن میں ساری چیزیں موجود ہیں۔

میں ختم کرتا ہوں لیکن جناب والا! بنیادی بات یہ ہے کہ میں نے کسی کے خلاف کوئی الزام نہیں لگایا بلکہ وہ رپورٹ جو دنیا بھر میں چھپی ہے اور جس سے پاکستان کا تصور متاثر ہوا ہے میں وہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ معاملہ بلوچی اور غیر بلوچی کا نہیں ہے۔ اگر کسی بلوچی کے ساتھ بھی کوئی

امتیاز برتا گیا ہے تو ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم اس کی اصلاح چاہتے ہیں۔ شام میں اگر کوئی اقربا پروری ہوئی ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ بلوچی ہے یا پنجابی ہے یا سندھی ہے یا پٹھان ہے اسے قبول یارد نہیں کیا جاسکتا یہ پہلو بحث کے حوالہ سے غیر متعلق ہے۔ (۳۱مارچ ۲۰۱۰ء)

سندھ طاس معاہدہ-سفارتی دباؤ کی ضرورت: جناب چیئر مین! میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے عزیز بھائی محمد علی درانی نے ایک بہت اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ پانی کے مسئلے کو اس کے حقیقی پس منظر میں دیکھا جائے۔ بلاشبہ درانی صاحب کا مرکز توجہ پنجاب کا ایک علاقہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ علاقہ محروم بھی ہے اور مظلوم بھی ہے اور اس کی محرومیوں کو دور ہونا چاہیے۔ جناب چیئر مین! میں آپ کی اجازت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ سینیٹ کو، خاص طور پر اس کی جو اسٹینڈنگ کمیٹی برائے زراعت ہے اسے اس مسئلے کو زیرِ بحث لانا چاہیے اور اس کے تینوں پہلو ہمارے سامنے رہنے چاہییں۔

پہلی چیز یہ کہ سندھ طاس معاہدہ میں بہت خامیاں تھیں۔ ایک فوجی آمر کے زمانے میں معاہدہ کسی قومی مباحثہ کے بغیر کیا گیا یہ بذات خود غلط تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس معاہدہ میں موجود ہے اور جس طرح اس پر عملدرآمد ہونا چاہیے تھا وہ بھی نہیں ہوا۔ اس بگاڑ میں تمام حکومتیں شامل رہی ہیں بلکہ میں یہ بات کہوں گا کہ حکومتوں کی ذمہ داری تو ہے ہی، اصل میں اس بگاڑ کی بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ اس ملک میں ایک خاص طبقہ فیصلہ کن مقام پر رہا ہے۔ اس طبقہ نے اپنے مفادات کا تحفظ تو خوب کیا ہے لیکن ملک کے عوام کی اور ملک کے مختلف علاقوں کی کیا ضروریات ہیں فی الحقیقت اس کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں زور دینا چاہیے کہ سندھ طاس معاہدہ کے تحت جو کچھ ہمارا حق ہے وہ ہمیں ملے۔ اس کے لیے ہندوستان سے مذاکرات، ہندوستان پر دباؤ، بین الاقوامی رائے عامہ کو متحرک کرنا اور ان بین الاقوامی قانونی اداروں کو متوجہ کرنا ضروری ہے جو بین الاقوامی معاہدوں کے نفاذ کی ذمہ داری رکھتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس پورے کام کا حصہ ہیں۔

دوسری جانب بحیثیت مجموعی پاکستان میں پانی کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کے وقت پانی کی جو مقدار ایک فرد کے لیے موجود تھی آج اس کا صرف بیس فیصد دستیاب ہے۔ آج اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو حقیقت یہ ہے کہ ہم بڑی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پانی کا اہم ترین ذریعہ کشمیر سے منسلک پہاڑ ہیں۔ چنانچہ یاد رہنا چاہیے کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہماری رگ جاں ہندوستان کے قبضے میں رہے گی۔ آپ پورے علاقے کے بارے میں کوئی صحیح اور منصفانہ پروگرام نہیں بناسکتے جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس پہلو کو بھی سامنے رکھا جائے اور اس معاملے میں جو کمزوری دکھائی گئی ہے، خصوصیت سے پچھلے دس سالوں میں، جس کا ناقابل تلافی نقصان ملک کو پہنچا ہے اس کے تدارک کے لیے کوشش کی جائے۔ وقت آگیا ہے کہ پارلیمنٹ اور پوری قوم اپنے حق کے لیے اٹھے اور اس بات کی بھرپور کوشش کرے کہ ہمیں صحرا میں تبدیل نہ کیا جائے۔

جنابِ والا! تیسری چیز پاکستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں کے درمیان پانی کی تقسیم کی ایک منصفانہ پالیسی کی تشکیل ہے۔ اس ضمن میں یہ سامنے رکھنا ہو گا کہ بارش کے پانی اور دریائی اور زیر زمین پانی کے تینوں ذرائع کو سامنے رکھ کر فیصلے ہوں ورنہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب اور سندھ کے درمیان، سرحد (خیبر پختونخوا) اور پنجاب کے درمیان اس حوالہ سے تنازعات ابھرتے ہیں اور ہر صوبہ اپنے اپنے انداز میں مسئلے کو اٹھا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ ہمارا علاقہ ہے ہر ایک کی ضروریات کو پورا ہونا چاہیے اور مل بیٹھ کر جو وسائل ہمارے پاس ہیں ان کی منصفانہ تقسیم کا نظام بھی بنایا جانا چاہیے اور پھر یقینی بنایا چاہیے کہ اس نظام پر عمل ہو گا۔ یہ تینوں پہلو بہت ضروری ہیں۔ میں یہ تجویز کروں گا کہ اس مسئلے کو سینیٹ کمیٹی کے حوالے کرنا چاہیے اور اسٹینڈنگ کمیٹی کو فی الفور اقدام لینا چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ ماہرین کو شامل کریں، تمام صوبوں کی نمائندگی اس میں موجود ہو اور ان تینوں مسائل کے بارے میں ایک قابل عمل منصوبہ حکومت کو دیں۔

حکومت کے بارے میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان دو سالوں میں

اس نے اس ملک کے بنیادی مسائل اور عوام کی مشکلات کو نظر انداز کیا ہوا ہے: ۱۔ اہم مسائل پر پالیسی کا نہ ہونا؛ ۲۔ اچھی حکمرانی کا نہ ہونا؛ ۳۔ بد عنوانی؛ ۴۔ نااہلیت۔ یہ چار ہمارے بنیادی مسائل ہیں۔ خدا کے لیے ان کو حل کیجیے ورنہ مجھے ڈر ہے کہ جمہوریت کی جو نعمت ہمیں حاصل ہے وہ خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ (یکم مارچ ۲۰۱۰ء)

سندھ طاس معاہدہ- بھارتی وفد کا خیر مقدم: میں سب سے پہلے تو آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراؤں گا کہ بلا شبہ پارلیمانی روایات کا یہ بڑا قیمتی حصہ ہے کہ جب اہم وفود آتے ہیں تو ان کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ چیئرمین صاحب نے ہم سب کے خیالات کی نمائندگی کر دی تھی لیکن روایات سے ہٹ کر ہم نے یہ کیا ہے کہ ہر پارٹی کے لیڈر نے بھی وفد کا خصوصی خیر مقدم کیا ہے بلاشبہ روایات سے انحراف سمجھتے ہوئے بھی یہ خصوصی سلوک ہم نے اختیار کیا ہے اور اس میں، میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہوں۔

ہم بھارت کے اس وفد کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہمارا مقصد دونوں ملکوں کے درمیان اچھے، برادرانہ اور دوستانہ تعلقات ہیں، ایسے تعلقات جو تعاون، حق اور انصاف پر مبنی ہوں اور جہاں یہ جذبہ ہو کہ جو چیز حقیقی اور مساوی تعلقات کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنے ان کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ ان کے حل کے لیے مناسب اور مؤثر کوشش ہر طرف سے ہو تاکہ دونوں ملکوں کے عوام مل کر مشترکہ مقاصد کو حاصل کر سکیں۔ اس معاملے میں کشمیر کا مسئلہ جو تقسیم کے وقت سے اس وقت تک بنیادی مسئلہ رہا ہے نہایت اہم ہے۔ اسی طرح پانی کی سپلائی جس کے بڑے دور رس اثرات پاکستان پر ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کو ہمیں حل کرنا ہو گا حق کی بنیاد کے اوپر اور مسلمہ اصولوں، اقوام متحدہ کے فیصلوں اور سندھ طاس معاہدے کی بنیاد کے اوپر۔ درحقیقت جب تک یہ مسائل حل نہیں ہوں گے ہم محض رسمی احترام سے ان حالات سے نہیں نکل سکتے جس میں ہم سب اس وقت گرفتار ہیں۔ اس مجموعی تناظر میں، میں توقع رکھتا ہوں کہ دونوں ملکوں کے پارلیمنٹرین اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ (۱۷ جنوری ۲۰۱۲ء)

باب نمبر ۸

ذرائع ابلاغ کی آزادی اور ان کا کردار

آزادی صحافت اور صحافیوں کا تحفظ: سب سے پہلے تو میں اپنی بہن ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے بڑے مدبرانہ انداز میں اور مخلصانہ طور پر اس مسئلے کو پیش کیا ہے جس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے صحیح سمت میں ایک قدم سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ بات محض کسی بھی حکومت وقت کے فیصلوں پر منحصر نہ ہو بلکہ ملک کے قانون کا ایک حصہ بن جائے تاکہ یہ سیاسی کھیل کا ذریعہ نہ بنے۔ آپ نے جو اقدامات کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ان کو اس بل میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن بل میں اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہیں۔ یہ ایک جامع بل ہے اور ہم نے انسانی حقوق کا بین الاقوامی اعلامیہ، صحافیوں کے تحفظ کے لیے دولت مشترکہ کا اعلامیہ اور خاص طور پر آسٹریلیا میں صحافیوں کے تحفظ کے لیے جو قانون سازی ہوئی ہے ان تمام چیزوں کو مد نظر رکھ کر اسے مرتب کیا ہے اس بل کے تین بنیادی مقاصد ہیں۔

ان میں اطلاعات تک رسائی اور آزادی اظہار کے ساتھ صحافیوں کا یہ حق بھی شامل کیا ہے کہ خبر کے ذریعہ کو ظاہر نہ کریں جن کی بنا پر دنیا بھر میں صحافیوں کو ہراساں کیا جا رہا ہے۔ ہم نے اس چیز کو اپنے بل میں اہمیت دی ہے۔ دوسری چیز ان کو مالی اور تعلیمی لحاظ سے سہولت فراہم کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ خطرناک حالات کے اندر پاکستان میں دو درجن سے زیادہ صحافی پچھلے دنوں میں شہید کیے گئے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو در بدر پھر رہے ہیں اور اپنے شہر میں نہیں جا سکتے ہیں تو ان کے تحفظ کو بھی اس بل میں لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ مالی معاملات، چاہے وہ وقتی ہوں یا مستقل جن میں ان کو مدد کی ضرورت ہے اسے لیا گیا ہے۔ ہم

چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت ہو اور وہ محض کسی خاص ادارے یا کسی خاص حکومت کی مرضی پر منحصر نہ ہو۔

جنابِ والا!! ہم نے اس بل کے اندر ایک صحافتی کونسل تجویز کی ہے جو قومی سطح کی نمائندہ ہو اور ان معاملات کی دیکھ بھال کرے۔ اس حیثیت سے یہ ایک جامع قانون سازی ہے اور اسے مزید بہتر کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اسے داخل کرنے کے بعد تمام سینیٹرز سے درخواست کی تھی کہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے، آیئے آپ اس میں ہمارے ساتھ شریک ہو جایئے، مجھے بڑی خوشی ہے کہ مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے سترہ سینیٹروں نے اس کو میرے ساتھ اسپانسر کیا ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آج کے ایجنڈے میں آٹھ اور نو نمبر پر یہی بل ہے۔ اس کی دوسرے ۱۷ لوگوں نے بھی حمایت کی ہے، ان دونوں کو ملا دیا جائے۔ اس طرح یہ بل محض ہم تین کی طرف سے نہیں بلکہ ان بیس ارکان کی طرف سے ہو گا۔ اور بھی جو رکن شامل ہونا چاہے، ہم اس کا خیر مقدم کریں گے اور یہ چاہیں گے کہ بل پر غور کے لیے کمیٹی میں وزیر اطلاعات بھی ہوں اور وہاں اس کو اگر مزید بہتر کیا جا سکتا ہے تو بلاشبہ کیا جائے۔ اس طرح سے آپ نے جو اقدامات کیے ہیں وہ ملک کے قانون کے تحت ہمیشہ کے لیے ایک غیر جانبدار انتظام بن جائے گا، وقتی چیز نہیں رہے گی۔ آپ کا جو مثبت ردعمل ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں درخواست کروں گا کہ اس کو کمیٹی کے سپرد کیا جائے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جس طرح سے میرے سترہ سینیٹر ساتھیوں نے اس کی تائید کی ہے، ان دونوں کو ملا کر گویا یہ بیس سینیٹروں کی طرف سے ایک مجوزہ بل ہو جائے گا[1]۔ (۳۱ اکتوبر ۲۰۱۱ء)

پیمرا آرڈیننس اور الیکٹرانک میڈیا میں آزادی کی حدود: جناب چیئرمین! پیمرا آرڈیننس ۲۰۰۷ء میں آیا۔ بلاشبہ یہ اس اعتبار سے ایک بہت ہی مفید انتظام تھا کہ الیکٹرانک میڈیا کو

[1] بعد ازاں سینیٹ اجلاس کے صدر نشین نے دونوں بل قائمہ کمیٹی کو تفصیلی غور و خوض کے لیے بھجوا دیے۔

حکومت کی گرفت سے آزاد کیا جائے اور اس میدان میں پی ٹی وی کی اجارہ داری ختم ہو۔ پیش نظر یہ تھا کہ عوام تک اطلاعات کے اعتبار سے بھی اور پھر مباحثے اور مسائل پر رہنمائی کے اعتبار سے بھی متبادل نقطۂ نظر پہنچے۔ یہ ایک اچھی تبدیلی تھی۔ ۲۰۰۷ء میں ہی اسے ایکٹ کی شکل دی گئی۔ لیکن جنابِ والا! اس کے بعد ایک آرڈیننس نومبر ۲۰۰۷ء میں آیا جس کی رو سے اس قانون کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔

میں اس اعتبار سے تو اس نئے آرڈیننس سے پہلے آنے والی تبدیلی کو خوش آمدید کہتا ہوں کہ یہاں مختلف چینلز آئے اور یوں سیاسی و تعلیمی اور تفریح ہر اعتبار سے تنوع اور بہتری کے مواقع پیدا ہوئے۔ اسی طرح اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ایسے تمام معاملات میں کوئی نہ کوئی ضابطہ، کوئی نہ کوئی قانون، کوئی نہ کوئی اصول وضوابط، لاگو ہونا ضروری ہیں۔ درحقیقت یہ تمام چیزیں اپنی جگہ پر بالکل مسلم ہیں اور اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔

میں جس چیز پر آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حکومتِ وقت نے اس ادارے کو حقیقی آزادی کے محافظ اور دستور کے مطابق باقاعدہ نظم کی ذمہ داری ادا کرنے کی بجائے، اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ خصوصیت سے ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کے بعد جس طرح حکومت نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو دھمکیاں دیں، ہراساں کیا اور اپنے حق میں استعمال کیا، چالیں چلیں اور ان پر حکومت اور پریشر گروپس بھی مسلط کیے گئے اس کو میں ناقابلِ قبول قرار دیتا ہوں۔ کراچی میں کچھ عناصر نے جس طریقے سے میڈیا کو اپنے ہاتھ میں لینے اور ان پر اپنی مرضی مسلط کر کے اس کے مطابق نشریات کرانے کی کوشش کی اور جس طرح اس سب کام میں پیمرا کی اتھارٹی ذریعہ اور سرپرست بنی رہی وہ میرے نزدیک شدید قابل مذمت ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کے برعکس تشدد اور دہشت گردی، عدم رواداری، فحاشی اور عریانی پھیلانے کے لیے ان کو کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے لیے کوئی ضابطہ اخلاق ہی نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ریگولیٹری ادارے کا کام بہت نازک ہوتا ہے۔ ایک طرف

آزادی کا تحفظ ضروری ہے اور دوسری طرف یہ خیال رکھنا ہے کہ آزادی کا مطلب مادر پدر آزادی نہیں۔ آزادی کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ آزادی نام ہی اس بات کا ہے کہ ایک متفقہ ڈھانچہ کے اندر ہر ایک کو اپنی بات کہنے اور کرنے کے مساوی مواقع ملیں۔ ایمانوایل کانٹ جو جرمن فلسفی تھا، اس نے بڑے لطیف انداز میں آزادی کو واضح کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ”مجھے اپنا ہاتھ گھمانے کی آزادی ہے لیکن یہ آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے آپ کی ناک شروع ہوتی ہے“ یہ جائز نہیں ہے کہ آپ کے ہاتھ کی جو حرکت ہے وہ میرے منہ پر طمانچہ بن کر لگ جائے۔ یہی وہ نازک کام ہے کہ ایک طرف آزادی کا تحفظ ہو اور محض حکومت کو یا چند عناصر کو خوش کرنے کے لیے اور ان کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لیے لوگوں کو آزادی سے محروم نہ کیا جائے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ہر معاشرے کی کچھ حدود ہوتی ہیں، کچھ اقدار اور کچھ بنیادیں ہوتی ہیں، ان کا تحفظ ضروری ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اقدار کا تحفظ تو نہیں ہوتا، تحفظ مخصوص افراد اور اداروں کا ہوتا ہے؟ چنانچہ پیمرا کا جو آرڈیننس نومبر ۲۰۰۷ء میں آیا ہے، آپ اس میں یہ پابندی پائیں گے کہ کوئی چیز جو 'سربراہِ ریاست، عدلیہ، پارلیمان، انتظامیہ اور مسلح افواج کے اراکین کی شہرت' داغدار کرے۔

جنابِ والا! ایک مہذب معاشرے میں تنقید مہذب انداز میں ہونی چاہیے افتراپردازی اور ہتک عزت صحیح نہیں۔ کسی کی بے حرمتی کرنے، گالی دینے اور اشتعال دلانے کا حق نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دفعات کے غلط استعمال کے ذریعے سے کچھ اداروں کو مقدس گائے بنا دیا گیا ہے اور ان کا سہارا لے کر چینلز یا ان کی نشریات بند کی گئیں۔ آپ کو پتا ہے کہ جیو کے ساتھ کیا ہوا، اے آر وائی کے ساتھ کیا ہوا۔ ایسے کمپیئرز جو محترم اور معتبر تھے لیکن ان کا چہرہ کسی کو پسند نہیں تھا، انہیں نکال باہر کر دیا گیا۔ اس طرح ملکی چینلز کی تو نشریات بند کی گئیں لیکن اس کے برعکس انڈین چینلز کے لیے دروازہ کھول دیا گیا اور اس طریقے سے ہم نے اپنے دروازے کھول کر ہندوستان کے ثقافتی حملے کے لیے راہ ہموار کر دی۔

جنابِ والا! میں بڑے دکھ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے انڈین چینلز جو ہماری

آزادی، ہماری خود مختاری اور ہماری ثقافت کی جڑیں کاٹ رہے ہیں انھیں ہم نے اجازت دے کر کھلی آزادی دے ڈالی ہے۔ یہ وہی میڈیا ہے جس کے بارے میں سونیا گاندھی نے کہا تھا کہ ہمیں اپنی فوجوں کو پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا میڈیا ہماری فلمیں، ہمارے براڈ کاسٹرز، وہ کام انجام دے رہے ہیں جو سرحدوں کو منہدم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ شرمناک بات یہ ہے کہ اگر کسی چینل پر پابندی لگائی گئی تو وہ پیس(Peace) چینل تھا، ڈاکٹر ذاکر نائیک اس کے اہم کردار ہیں اور انہوں نے پوری دنیا میں کسی تعصب کے بغیر فرقہ واریت کے انداز میں نہیں، دلیل کے ساتھ اسلام کی دعوت کو پھیلایا ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ وہ چینل پاکستان میں بند ہے۔ اس حکومت کے زمانے میں بند ہے اور اس کے مقابلے جو فحش چینلز ہیں جو سیاسی و ثقافتی اعتبار سے ہمارے لیے خطرہ ہو سکتے ہیں، وہ آرہے ہیں۔

جنابِ والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ پیمرا اپنی اصل ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے برعکس یہ ادارہ میڈیا کی سنسر شپ، اسے دھمکانا اور اس سے متعلق شخصیات کو ہدف بنانے کا ذریعہ بنا ہے۔ جس طرح کراچی میں خاص طور پر ۱۲ مئی ۲۰۰۷ء کو ذرائع ابلاغ سے وابستہ لوگوں کو بار بار ہراساں کیا گیا یہ ہماری تاریخ کا ایک بڑا سیاہ اور شرمناک باب ہے لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس حوالہ سے پیمرا کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ جس طرح یہاں اسلام آباد میں جیو کے دفاتر پر پنجاب کی پولیس نے حملہ کیا اس کی کوئی توجیہ ممکن نہیں ہے۔ میں اس موقع پر وہاں خود موجود تھا جب حملہ کیا گیا جو کچھ اس وقت پنجاب کی پولیس نے کیا وہ افسوسناک ہے۔ اس کے بعد وہاں سے جو پہلا پروگرام ہوا، اس میں میں نے شرکت کی، اس اعتبار سے میں خود بھی ایک عینی شاہد ہوں۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ اس وقت یہ تمام چیزیں پیمرا کو نظر نہیں آئیں۔ اس کے برعکس پیمرا نے اس نام پر کہ فسادات کو ہم کور نہیں کرنے دیں گے، پولیس کی جانب سے وکلا پر تشدد، گیس اور لاٹھیوں سے ان کی مار پیٹ، جیسے مناظر دکھانے سے روک دیا۔ میری نگاہ میں یہ آزادیٔ صحافت پر بہت بڑا وار تھا۔ جنابِ والا! میں ساتھ ہی یہ کہنا چاہوں گا کہ میڈیا کے لیے سب سے اہم چیز

سیلف سنسر شپ ہے اور پیمرا جیسے اداروں کا کام ہے کہ وہ اپنے کردار اور اقدامات کے ذریعہ انھیں اس جانب متوجہ کریں۔

دوسرے ملکوں میں اس کے لیے جو نظام بنایا جاتا ہے اس سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً انگلستان میں پریس کونسل، ایک مؤسّسہ ادارہ تھا جس سے ہر کوئی رابطہ کر سکتا ہے۔ اس میں حکومت بیٹھی ہوئی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہم نے اس پر جو ۱۲ افراد کا بورڈ بنایا ہے، اس میں بعض افراد صوبوں سے آنے ہیں، چنانچہ ان کی نامزدگیاں بعض حکومتوں کے ذریعے سے کی گئیں، یہ گویا کہ حکومت کی توسیع ہے۔ اس قسم کے اداروں میں پارلیمنٹ، پبلک اداروں، خود میڈیا کے نمائندوں، سابق جج، اور سوسائٹی کے محترم افراد کو ہونا چاہیے۔ یہاں ایسے لوگوں کو لایا جا سکتا ہے۔ جن پر قوم کو اعتماد ہے اور جو ذمہ داری کے ساتھ، دیانت کے ساتھ آزادی کی نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے رہنمائی کا کام انجام دے سکتے ہیں لیکن ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ وہی بیوروکریسی کے کنٹرول کا ہے جو دراصل میڈیا کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے اور حکومت کے ہاتھوں استعمال کرنے کی ایک کوشش ہے۔

جنابِ والا! میں محترمہ شیری رحمٰن صاحبہ کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ سنسر شپ پالیسی نہیں ہے۔ لیکن میں ساتھ ہی یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آزادی اور اخلاقی و ثقافتی اقدار کا تحفظ ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے نہ ڈنڈے کی ضرورت ہے اور نہ حکومت کی سنسر شپ کی ضرورت ہے اور نہ ہی حکومت کی جانب سے سرزنش کرنے کی افادیت ہے۔ اس کے لیے ایک خود انتظامی طریقہ کار کی اور ضابطہ اخلاق کی ضرورت ہے۔ اور اس ضابطہ اخلاق کو بھی مؤثر بنانے کے لیے کسی سرکاری نظام کی نہیں بلکہ ایک خود اختیاری نظام بنانے کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں دنیا میں مختلف تجربات ہوئے، یہ راستہ ہم بھی اختیار کر کے توازن پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ میڈیا کی جانب سے آزادی کو ناجائز استعمال بھی کیا جاتا ہے اور دوسری جانب دنیا میں دیگر حکومتیں بھی اپنی اپنی جگہ بہت سے غلط اقدامات کرتی ہیں۔ ابھی

نیو یارک ٹائمز میں ایک بڑی اہم رپورٹ آئی ہے۔ یہ رپورٹ خود میرے لیے بھی چشم کشا تھی کہ کس طرح بش انتظامیہ صحافیوں کو جتھہ بندی، ایڈوائس سسٹم اور لفافوں کے ذریعے سے، اپنے تنخواہ دار افسروں کو پلانٹ کر کے میڈیا کو قابو کر رہی ہے۔ اس سے پہلے ہارورڈ یونیورسٹی کے دو پروفیسروں نے ''دی لابی'' کے نام سے ایک رپورٹ شائع کی جس میں اسی طرح کی بہت سی معلومات دی گئی ہیں۔ اس رپورٹ کو امریکہ میں شائع نہیں ہونے دیا گیا وہ لندن سے شائع ہوئی اور اس کے بعد پاکستان میں آئی۔ چنانچہ یہ درست ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں یہ کام بھی ہوتا ہے لیکن ہم نے اپنے آپ کو دونوں صورتوں سے محفوظ کرنا ہے۔

جنابِ والا! آزادی کا تحفظ ضروری ہے اور اس میں ہمیں اپنے لوگوں پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ البتہ اس کے لیے ضابطہ اخلاق اور اس کے نفاذ کا نظام بنانا ضروری ہے۔ پیمرا اس معاملے میں ابھی تک ناکام رہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس آرڈیننس کے ساتھ جو کہ اس وقت نافذ ہے صورتِ حال بہتر نہ ہوگی۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اصل آرڈر اور پھر ۲۰۰۷ء کا آرڈیننس یہ حقیقی پارلیمانی طریقہ کار کے بغیر بنے۔ یہ روایت ختم ہونی چاہیے۔ پارلیمنٹ میں مشاورت اور بحث سے چیزیں نکھر جاتی ہیں اور قانون زیادہ جامع صورت میں سامنے آتا ہے۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ ہمارے پرائیویٹ ممبران نے کچھ بل جمع کرائے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں اچھی باتیں بھی ہیں اور کچھ خامیاں بھی ہیں۔ پارلیمنٹ میں آنے کے بعد وہ اب کوئی خفیہ چیز نہیں رہے۔ پارلیمنٹ کا کام یہ ہے کہ وہ اچھی طرح چھانٹی کرے، ایک ایک چیز کو دیکھے کہ اس کے اثرت کیا ہوں گے۔ اسے بہتر بنائے، اس پر وقت لگائے اور اس پر رائے عامہ حاصل کرے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ چیز نہیں ہوتی بلکہ قانون سازی آرڈیننس کے ذریعے آتی ہے۔

میں اس آرڈیننس میں نومبر ۲۰۰۷ء کی ترامیم کے ذریعے سے آزادی کے نام پر حکومت کی بالادستی، تسلط، کنٹرول اور انتظام و انصرام کو شامل کرنے پر اپنے شدید اختلاف کا اظہار کرتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ جس طرح وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ پیمرا کے آرڈیننس کو ختم کیا جا رہا ہے، اس پر عمل ہو۔ پارلیمنٹ دونوں پہلوؤں پر غور کر کے صحافت کی

آزادی، دستور اور اقدار کے تحفظ کے درمیان توازن قائم کرے۔ حکومت اپنے آپ کو عقل کل سمجھنا ترک کرے، پارلیمنٹ پر اعتماد کیجیے، قوم پر اعتماد کیجیے اور ایسے ادارے بنایئے کہ جو ان نزاکتوں کو سامنے رکھ کر معاملات کو ٹھیک کر سکیں۔ (۵ مئی ۲۰۰۸ء)

پاکستان ٹیلی ویژن کا کردار: جناب چیئرمین! میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ نیوز اور حالات حاضرہ کے علاوہ میں خود کوئی ٹیلی وژن پروگرام نہیں دیکھ پاتا لیکن میرے گھر کے افراد دیکھتے ہیں وہ اور ان کے علاوہ جو لوگ مجھ سے ملتے ہیں وہ اپنی آراء کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ ان سب کی رائے پر مبنی ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ میری نگاہ میں پی ٹی وی نے کچھ اچھی چیزیں پیش کی ہیں۔ ان میں پروگراموں کا چناؤ بھی ہے، معیار کی بہتری بھی ہے اور خاص طور پر پی ٹی وی ورلڈ کی بناء پر باہر کی دنیا میں پاکستان کی جو تشہیر ہو رہی ہے وہ اس کا ایک بہتر کام ہے میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ دوسرا یہ ہے کہ مجھے دنیا کے مختلف ممالک میں وہاں کے ٹی وی سٹیشنوں کو دیکھنے کا اور وہاں جا کر انٹرویو دینے کا موقع ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے کم وسائل، کم سہولتوں اور خود ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بہت غیر ترقی یافتہ ہونے کے باوجود جو خدمت یہ ادارہ اور اس کے کارپرداز انجام دے رہے ہیں، میں اس کا قدر دان ہوں۔ اس اعتراف کے بعد میں دو تین باتیں اور رکھنا چاہتا ہوں۔

اوّل یہ کہ پی ٹی وی پر ایک بہت بڑی ذمہ داری اس پہلو سے ہے کہ اطلاعات، تعلیم اور تفریح ان تینوں کے درمیان ایک اچھا توازن ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ پروپیگنڈہ اور ابلاغ دو مختلف چیزیں ہیں۔ آپ ابلاغ کے لیے ہیں، پروپیگنڈہ کے لیے نہیں۔ سیاسی حکومتیں اسے ہمیشہ پروپیگنڈہ کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں۔ آج بھی دباؤ ہے لیکن اس کے باوجود اس بات کی ضرورت ہے کہ پالیسی اور نظام کار جو بھی آپ بنائیں اس میں اتنی آزادی ہو کہ دوسرے نقطہ نظر کو دیانت داری کے ساتھ پیش کر سکیں اور آپ کی بات کو اعتبار حاصل ہو۔ اگر یہ نہیں ہو گا تو پھر جیسا کہ میرے دوستوں نے کہا، یہی ہو گا کہ

۹ بجے کی خبریں وہ کسی اور چینل سے سنیں گے کیونکہ پی ٹی وی پر اعتبار نہیں ہو گا۔

میں یہ بھی یاد کرانا چاہتا ہوں کہ ایک دور میں فی الحقیقت پی ٹی وی کے ڈرامے کو اندرون و بیرون ملک غیر معمولی طور پر سراہا جاتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ میری بہن ڈاکٹر سعدیہ عباسی نے بھی یہ بات کہی اور میری بھی اطلاع یہی ہے کہ ڈرامے کے میدان میں ہم پیچھے رہ گئے ہیں اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالات حاضرہ سے متعلق پروگراموں میں آپ ذرا زیادہ وسعت قلبی کا مظاہرہ کریں۔ اس وقت آپ کی خبر ایک جانب باسی ہو جاتی ہیں اور دوسری جانب ایک خاص ترتیب کہ صدر، وزیر اعظم، وزیر اور اس کے بعد صوبوں میں بھی گورنر، چیف منسٹر وغیرہ کی بناء پر غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ یعنی آپ نے اس کی بنا پر اپنی کارکردگی کو بہت محدود کر دیا۔ درست بات یہ ہے کہ خبریت جس چیز میں بھی ہو اسے آپ اہمیت دیں۔ خانہ پری کے لیے ان اعلیٰ شخصیات میں سے ہر ایک کا چہرہ روزانہ ٹی وی پر آنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس معاملہ پر آپس میں اتفاق رائے ہونا چاہیے۔ اسی طرح علاقائی زبانوں اور علاقائی روایات کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ بہت ضروری ہیں۔ میں ان کی تائید کرتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستانی زندگی کا پورا تنوع آپ کے پروگراموں میں منعکس ہونا چاہیے۔ اس بارے میں میری نگاہ میں آپ کو تحقیق بھی کروانی چاہیے بصری مواد بھی حاصل کرنا چاہیے۔ آزاد اداروں سے آپ تحقیق کروایئے اور اس طریقے سے پورے نظام کو بہتر کرنے کی کوشش کریں۔

ایک اور بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پی ٹی وی اور بحیثیت مجموعی الیکٹرانک میڈیا دراصل صرف سوسائٹی کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ سوسائٹی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ ملک میں غربت ہے، جس ملک میں چالیس فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے، جس میں لوگوں کو دو وقت کی روٹی میسر نہ ہو، اس میں اگر آپ اپنے پروگراموں میں اس طرز زندگی کو دکھاتے ہیں جو شہری ہے اور شہری بھی وہ جن میں امراء ہیں اور یوں پروگراموں میں دولت کی ریل پیل ہی نظر آتی ہو تو حقیقت یہ ہے کہ یہ محرومی کے

احساسات کو اور بھی بڑھاتا ہے ۔ دیکھنے والوں میں جو خواہشات اوراس کے نتیجے میں احساس محرومی پیدا ہوتا ہے اس سے سماجی انتشار جنم لیتا ہے۔ یہ چیز میں صرف پاکستان کے حالات میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ پوری دنیا میں جرائم کے بارے میں آگہی کے حوالہ سے بہت اہم سائنسی تحقیقات موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ٹی وی کس طریقے سے محض ترجمانی ہی نہیں کر رہا بلکہ اثر اندازی بھی کر رہا ہے۔

جناب چیئر مین ! ان باتوں کو سامنے رکھ کر آپ ایک متوازن پالیسی اختیار کریں۔ ایسی پالیسی جو سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے اعتدال پر مبنی ہو۔ ہمارا ایک اسلامی معاشرہ ہے اور ہماری کچھ اقدار ہیں ان کو پروگراموں میں ضرور منعکس ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اطلاعات اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تفریح بھی زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن تفریح کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ تفریح کو ان حدود کے اندر ہونا چاہیے۔ جو کچھ آپ فروغ دیں وہ صحتمند معاشرہ کا عکاس ہو تاکہ صحتمند روایات کو ملک میں پروان چڑھا سکیں۔ ایک بات جو میری بہن سینیٹر سعدیہ عباسی نے کہی ہے وہ اہم ہے کہ صلاحیت کو تلاش کرنا اور صلاحیت کو استعمال کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے جو اقدام بھی ہیں ترغیبات ہیں، مقابلے ہیں، یہ سب آپ کیجیے، اس طرح آپ بہتر خدمت انجام دے سکیں گے۔ (۱۹ جنوری ۲۰۰۴ء)

سینیٹ آف پاکستان کے بارے میں 'مسلم' اخبار کا توہین آمیز تبصرہ

میں مندرجہ ذیل تحریک استحقاق کی تحریک پیش کر رہا ہوں:

اخبار دی ''مسلم'' نے اپنے آج کے شمارے (۱۳ نومبر ۱۹۹۳ء) میں سینیٹ اور اس کے اراکین کے بارے میں ادارتی تبصرہ کیا ہے۔ ان تبصروں کا باعث مبینہ طور پر سینیٹر منظور گچکی کی جانب سے سینیٹ میں پیش کیے گئے حالیہ پرائیویٹ بل اور سینیٹ کی مئی ۱۹۹۱ میں منظور کردہ قرارداد ہے۔ جو پیش کرنے کا مجھے اعزاز

حاصل ہوا اور جسے سینیٹ نے بھاری اکثریت سے منظور کیا۔

ہم آزادی صحافت کے علمبردار ہیں، یہ بھی ضروری ہے لیکن پریس کو بھی ذمہ داری کا صحیح احساس اور حقائق کے احترام کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ آزادی کے حق کے غلط استعمال اور کسی کو بدنام کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ادارتی تبصرہ حقائق کے خلاف ہے کیونکہ اس میں الزام لگایا گیا ہے کہ سینیٹ کے انتخاب کا طریقہ غیر جمہوری ہے اور اس کے ایک چوتھائی ارکان نامزد ہیں۔ اس نامزدگی کا دو مرتبہ حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "آج سینیٹ میں ایسے ارکان ہیں جو یونین کونسل کا الیکشن بھی نہیں جیت سکتے"۔ ایک فرضی اور خیالی تصور پیش کیا گیا ہے کہ سینیٹ کا احتساب نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح سینیٹ اور قومی اسمبلی کے درمیان خیالی تصادم کی نفیری بجائی گئی ہے۔ سینیٹ پر پچھلی بے نظیر حکومت کو ہراساں کرنے اور شرمندہ کرنے کا بھی الزام بھی لگایا گیا ہے۔ سینیٹ پر بار بار شرارت اور نقصان پہنچانے اور گندہ کھیل کھیلنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ اداریہ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ بہت اونچا اُڑتے ہیں وہ صرف اپنے پیندے کو عریاں کرتے ہیں، یہ اداریہ بدنیتی پر مبنی ادارتی بہتان کا بدنما ٹکڑا ہے، جس کا مقصد سینیٹ کی بدنامی ہے۔ یہ سینیٹ اور اس کے ارکان کے استحقاق کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ براہ راست ان دو سینیٹرز سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ سینیٹر منظور گچکی جنہوں نے حالیہ پرائیویٹ بل پیش کیا ہے اور میں خود جس نے مئی ۹۱-۱۹۹۰ میں قرارداد پیش کی تھی۔

اس لیے میں اس موقع پر سینیٹ اور اس کی استحقاق کمیٹی سے درخواست کرتا ہوں کہ ایوان اس معاملے پر براہ راست بحث کرے یا اسے تحقیقات اور سفارش کے لیے استحقاق کمیٹی کے پاس بھیج دے۔

جناب چیئرمین! پریس کی آزادی ایک مسلمہ حقیقت بھی ہے اور ایک ضرورت

بھی۔ ہمارے دستور میں بھی پریس کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ جمہوریت کا اور اسلامی نظام شوریٰ کا یہ بنیادی اصول ہے کہ پریس کو، افراد کو، پارٹیوں کو اپنی رائے کے اظہار کی آزادی ہونی چاہیے۔ قرآن میں **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** کو امت کی اور اس کے افراد کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ چیز اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ آپ اختلاف کی اور تنقید کی آزادی نہ دیں۔ یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پریس کی آزادی، اس کا یہ حق کہ وہ تنقید کرے، سب پر، افراد پر بھی، اداروں پر بھی، یہ مسلّم ہے، اور یہ متنازعہ نہیں ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اختلاف، تنقید اور احتساب کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی عزت سے کھیلا جائے، ان پر ایسے الزامات لگائے جائیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو ایسی باتیں پیش کی جائیں اور ایسے دلائل دیئے جائیں جو حقائق سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، اور پھر اس کے لیے وہ زبان استعمال کی جائے جو باعث رسوائی اور کثیف ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زبان کا استعمال آزادی اظہار کے سہارے سے نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی مہذب معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا، دنیا کے تمام ممالک میں ہتک عزت اور گندی زبان کے استعمال کے خلاف قوانین موجود ہیں، اسلام میں اس کے الگ قوانین موجود ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو بات کرنے کی اور اختلاف کرنے کی اجازت ہے، لیکن آپ نے یہ کام ذمہ داری سے کرنا ہے۔ یہ ذمہ داری اس طرح ادا کرنی ہے کہ دوسرے کی عزت کے ساتھ آپ نہ کھیلیں۔

جناب چیئرمین! ہم آزادی صحافت کے قائل ہیں، اس کے لیے ہم نے کوشش کی ہے، قربانیاں دی ہیں، لڑے ہیں اور آئندہ بھی لڑیں گے، لیکن اس آزادی کا غلط استعمال کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ زیر بحث اداریے کو اگر آپ بلا کسی جذباتی انداز کے خالص معروضی طریقے سے، اور جس بھی انداز سے آپ دیکھیں تو اس میں اس کے اندر پہلی بات ہی غلط بیانی پر مبنی ہے۔ اس میں کہا گیا:

سینیٹ کو اپنی اصل شکل میں ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق نے خاص طور پر منتخب اسمبلی اور وزیر اعظم کو اپنے انگوٹھے کے نیچے رکھنے کے لیے ڈیزائن کیا تھا۔

جنابِ والا! سینیٹ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تخلیق ہے، اور آپ کو یاد دلاؤں کہ اس سے پہلے جب پہلی دستور ساز اسمبلی ملک کے مستقبل کے دستور کا خاکہ بنا رہی تھی تو دو ایوانی مجلس قانون ساز نظام تجویز ہوا تھا۔

دنیا کے دوسرے ۲۸ ممالک ایسے ہیں جہاں دو ایوانی نظام جاری ہے اور میں موازنہ کر کے بتاؤں گا کہ جو اسٹرکچر ہماری سینیٹ کا ہے وہ کوئی نادر چیز نہیں ہے، وہ کوئی اختراع نہیں ہے، وہ کسی ڈکٹیٹر نے اپنے مفاد کے لیے مسلط نہیں کیا بلکہ معروف جمہوری روایات اور فیڈریشن کے تحفظ اور فیڈریشن کے حقوق کو بروئے کار لانے کے لیے یہ کیا گیا ہے۔ آٹھویں ترمیم کے تحت سینیٹ کی حیثیت میں بلاشبہ اضافہ ہوا ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد بڑھائی گئی۔ یہ اس لیے بھی رکھا گیا کہ سینیٹ میں ایک دستوری روایت بنائی گئی جس کے ذریعے سے ٹیکنوکریٹس علماء، ماہرین یہاں لائے جاسکتے ہیں۔ سینیٹ کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ اس کی مدت چار کی بجائے چھ سال کی گئی اور اس میں جو انتخاب ہے وہ آدھے افراد کا ہر تیسرے سال کے بعد ہو گا۔ یہ چند تبدیلیاں ہیں جو اس میں کی گئی ہیں۔ ان میں سے کون سی چیز ہے جسے آپ محض 'ڈکٹیٹر کے دماغ' کی تخلیق قرار دے سکیں، ان میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کی بنیاد پر قومی اسمبلی کی حیثیت متاثر ہوئی ہے، یا وہ ڈکٹیٹر کے انگوٹھے کے نیچے آگئی ہے، یوں میں یہ سمجھتا ہوں کہ اداریہ میں کہی گئی بات سراسر آئین کے خلاف بات ہے۔

دوسرے جنابِ والا! یہ بات بار بار کی گئی ہے کہ:

قومی اسمبلی سے بہتر طور پر مقابلہ کرنے کے لیے اپنے (سینیٹ کے) اراکین کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق قومی اسمبلی کی ۲۰۰ عام نشستیں جبکہ خواتین کے لیے

۱۰ مخصوص نشستیں تھیں، کل ملا کر ۲۱۰ سیٹیں تھی۔ ۱۹۸۵ء میں ایک صدارتی حکم نمبر ۱۴ کے ذریعے عمومی نشستوں کی تعداد میں سات اور خواتین کی نشستوں کی تعداد میں ۱۰ کا اضافہ کیا گیا جبکہ اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے ذریعے دس نشستوں کا اضافہ کیا گیا اس طرح کل ۲۳۷ نشستیں ہو گئیں۔ اسی طرح سینیٹ میں اراکین کی تعداد جو پہلے ۶۳ تھی ۲۴ نشستوں کے اضافے سے بڑھ کر ۸۷ ہو گئی۔ لیکن قومی اسمبلی کی تعداد تو سینیٹ کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھی یوں یہ بات سیاق وسباق سے بری طرح متصادم ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

> (سینیٹ میں) ایک چوتھائی اراکین کا انتخاب نامزدگیوں کے ذریعے کر کے ایک انتہائی غیر جمہوری طریقہ متعارف کرایا گیا۔

جنابِ والا! ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ایک قومی روزنامہ جو ملک اور ملک سے باہر جاتا ہے، اس کے اداریہ نگار کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ملک کے سینیٹ میں انتخاب کا طریقہ کیا ہے؟ اسے معلوم نہیں کہ پاکستان کے سینیٹ میں ایک فرد کی بھی نامزدگی نہیں ہوتی۔ جناب والا! دنیا کے دوسرے ممالک میں جنہیں جمہوری ممالک تسلیم کیا جاتا ہے سینیٹ میں نامزدگی بھی ہوتی ہے، لیکن پاکستان کے سینیٹ کے ۸۷ ارکان میں سے ہر ایک منتخب ہوتا ہے۔ بلاشبہ انتخاب کے طریقے میں فرق ہے، ۱۹ افراد ہر صوبے سے آتے ہیں اور ہر صوبے کی منتخب اسمبلی انہیں منتخب کرتی ہے اور یہ ایوان بالا کے انتخاب کا ایک معروف طریقہ ہے اس کے بعد فاٹا کے ارکان اور قومی اسمبلی کے ارکان کے ذریعہ ان کے انتخاب کے لیے ایک طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے جو میری نظر میں قابل اصلاح ہے، لیکن بہر حال وہ بھی ایک طریقہ انتخاب ہے۔ یہ انتخاب بلاواسطہ نہیں تھا، لیکن اتنا واضح ہے کہ سینیٹ میں کوئی ایک شخص بھی نامزدگی کے ذریعے نہیں آیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کے اداریے میں دوبار صراحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ یہاں پر نامزدگی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جناب والا! کہا گیا ہے کہ:

اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آج سینیٹ میں ایسے ممبران ہیں جو یونین کونسل کا الیکشن نہیں جیت سکتے۔

یہ پہلے دی گئی اس دلیل پر مبنی ہے کہ چونکہ نامزدگی ہوتی ہے اور نامزدگی کے ذریعے جو لوگ آرہے ہیں وہ منتخب ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ بات غلط ہے۔ سینیٹ میں جو لوگ آئے ہیں وہ نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے ذریعہ منتخب ہوئے ہیں اور انہوں نے امتیازی خدمات انجام دی ہیں جن خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ دوسری جانب ایسا بھی ہے کہ سینیٹ سے جاکر لوگ قومی اسمبلی میں منتخب ہوئے ہیں۔ اس طرح در اصل ان کے اوپر یہ الزام لگانا کہ وہ انتخاب جیت نہیں سکتے اور اس کو اداریے کی بنیاد بنانا حقائق کے خلاف بھی ہے اور اصول جمہوریت کے خلاف بھی ہے۔

جنابِ والا! اس کے بعد کہا گیا ہے:

> اس اصول کے ذریعے کہ ہر تین سال بعد نصف ارکان ریٹائر ہو جاتے ہیں اس بات کی یقین دہانی حاصل کی گئی ہے کہ منتخب حکومت کسی بھی وقت اپنی پارٹی کے نصف سے زیادہ سینیٹرز نہیں رکھ سکتی اور باقی نصف کے لیے اپنے پیشرو کے منتخب کردہ سینیٹرز کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے اور اگر کوئی سیاسی حکومت سینیٹ میں اپنی پوزیشن مضبوط کرتی ہے تو اس کے لیے آرٹیکل ۵۸(۲)(بی) کی تلوار لٹک رہی ہے۔

جنابِ والا! بڑا دکھ ہوتا ہے اداریے میں اس نوعیت کے الزامات کو پڑھنا، اس لیے کہ یہ پورا مفروضہ ہے کہ سینیٹ اور اسمبلی برسرِپیکار ہیں اور سینیٹ کا کام یہ ہے کہ وہ اسمبلی کے کام کو روکے حالانکہ سینیٹ اور اسمبلی پاکستان کی جمہوریت کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اور ہر گاڑی کی طرح یہ گاڑی بھی دونوں پہیوں پر چلتی ہے۔ یقیناً یہ دونوں ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔ اگر کسی معاملے میں سینیٹ کسی بل کو تبدیل کرتی ہے تو دستور کے دیے ہوئے اختیارات کے تحت کرتی ہے، اس مقصد سے کرتی ہے کہ اس بل کو بہتر کیا جا سکے۔

اس ملک کے لیے اس کو بہتر بنایا جا سکے جنابِ والا! یہ ریکارڈ ہے کہ سینیٹ نے ایسے بلوں کو بھی قبول کیا ہے جو فی الحقیقت قانونی اعتبار سے کمزور تھے، جمہوری اعتبار سے کمزور تھے اور ان کی اس کمزوری کا اعتراف حکومت وقت نے سینیٹ میں کیا بھی ہے لیکن سینیٹ نے ان کا راستہ روکنے کی بجائے کوشش کی کہ ایسے بلوں کو بھی پاس کر دے اور حکومت کو موقع دے کہ وہ اس میں ترمیم کرے۔ کم از کم تین بل ایسے ہیں جس پر میں نے خود اعتراضات کیے، میرے ساتھیوں نے کیے اور اس کے بعد گورنمنٹ نے تسلیم کیا کہ ہاں ہم نے یہ بل جلدی میں پاس کر دیا آپ کا یہ اعتراض درست ہے ہم اس کو ترمیم کے ذریعے سے درست کریں گے تو یہ تو دراصل تعاون کی فضا ہے۔

پھر جس طرح سینیٹ نظر ثانی کر سکتا ہے اسمبلی سے پاس کردہ بل پر بالکل اسی طرح سینیٹ کے پاس کردہ بل پر اسمبلی بھی نظر ثانی کر سکتی ہے۔ شریعت بل یہاں پاس ہوا ہے۔ اسی طرح نواں ترمیمی بل پہلے یہاں پاس ہوا اور اس کے بعد اسمبلی میں گیا لیکن اسمبلی نے اس کو پاس نہیں کیا۔ کیا اس کے معنی ہیں کہ اسمبلی ویٹو کرنے کے لیے ہے۔ ایسا نہیں ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر چلتے ہیں اور یہ دستور کے عین مطابق ہے۔

پھر بنیادی سیاست کے جو اصول ہیں ان میں یہ بات جاننی چاہیے کہ نیشنل اسمبلی کو کسی وقت بھی معزول کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ آرٹیکل ۵۸(۲)(بی) آج بھی موجود ہے سینیٹ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے اور تین بار جب بھی اسمبلی ٹوٹی سینیٹ نے اعتراض کیا، تنقید کی، اختلاف کیا ۸۸ء میں بھی ۹۰ء میں بھی اور ۹۳ء میں بھی۔ یہ آن ریکارڈ ہے کہ اس نے کبھی بھی نیشنل اسمبلی کے ٹوٹنے پر خوشی نہیں منائی اس نے اس کو پارلیمنٹ کے وقار کے خلاف اور جمہوری عمل کے لیے نقصان دہ سمجھا ہے اور اس کے اوپر حکومتِ وقت کا احتساب کیا ہے۔ سینیٹ کے ریکارڈ میں اس کے واضح ثبوت موجود ہیں لیکن جنابِ والا! اس اداریے کے اندر جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سینیٹ اور اسمبلی ایک دوسرے کے خلاف متحارب قوتیں ہیں گویا کہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو ناکام کرنے پر تلے

ہوئے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ الزام ہے جو جمہوریت اور فیڈریشن دونوں کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔

جنابِ والا! جمہوری ملکوں کے اندر یہ ایک عام چیز ہے کہ مرکز میں حکومت ایک پارٹی کی ہوتی ہے اور صوبے میں کسی دوسری پارٹی کی آجاتی ہے۔ اسی طرح قومی اسمبلی یعنی ایوان زیریں میں اکثریت کسی اور کی ہوتی ہے اور ایوان بالا میں کسی دوسرے کی ہو جاتی ہے۔ امریکہ میں آپ کو معلوم ہے کہ بارہا یہ ہوا ہے کہ صدر کسی دوسری پارٹی کا ہوتا ہے اور ایوان نمائندگان اور سینیٹ میں مختلف پارٹیوں کو اکثریت حاصل ہے۔ لیکن یہ سب لو اور دو کے ساتھ تحدید و توازن کے ذریعے سے کام کرتی ہیں۔

جنابِ والا! زیرِ بحث ادار یہ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ نیشنل اسمبلی تو بڑی مظلوم ہے جو بار بار معزول ہو جاتی ہے اور سینیٹ بہتر ہے کہ وہ معزول نہیں ہوتی۔ جنابِ والا! یہ بنیادی اصول ہے پارلیمنٹری جمہوریت کا کہ پرائم منسٹر اپنے صوابدید میں جس وقت چاہے اسمبلی کو معزول کرے اور نئے الیکشن کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انگلستان میں ایک بڑے معاہدہ کے سلسلے میں جب جان میجر کے لیے کوئی اور راستہ نہیں رہا کہ اپنی پارٹی کی تائید حاصل کرے تو اس نے دھمکی دی کہ یا اسے پاس کر و ورنہ میں الیکشن کروا دیتا ہوں۔ تو بات یہ ہے کہ وزیر اعظم کو آپ نے ایک ایسا اختیار دے دیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر وہ جب چاہے اسمبلی کو معزول کر دے۔

جنابِ والا! یہ جمہوری روایات کا اور جمہوری عمل کا حصہ ہے۔ اسمبلی کا بار بار منتخب ہونا اور سینیٹ کا تسلسل در اصل یہ نظام کے تسلسل کے لیے ضروری ہے اور دنیا کے بیشتر ممالک میں اسی لیے سینیٹ کی مدت اور ہوتی ہے اور اسمبلی کی اور ہوتی ہے، سینیٹ معزول نہیں ہوتا۔ اسمبلی ہر جگہ معزول ہوتی ہے کچھ مقام پر سینیٹ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں ایوان زیریں کی مدت چار سال اور سینیٹ کی چھ سال ہے لیکن سینیٹ میں ہر دو سال بعد ایک تہائی ارکان تبدیل ہوتے ہیں۔

سیاسی نظام کے تسلسل کے لیے ضروری ہے کہ سینیٹ خود معزول نہ ہو تاکہ اسمبلی جب نہ ہو تب بھی سینیٹ جمہوری فورم کے طور پر موجود رہے۔ ہمارے ملک میں پچھلے آٹھ سال میں جب تین مواقع پر اسمبلی نہیں تھی تو سینیٹ نے جمہوری فورم کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سوالات کے ذریعے سے، تحریک التواء کے ذریعے سے اور آرڈیننسز کے بارے میں سیاسی ایشوز اٹھائے۔ جیسا کہ ابھی آپ نے کہا سینیٹ کو یہ فخر ہے کہ اس نے آرڈیننس کے بارے میں ایک دفعہ سومرو صاحب کے کہنے کے اوپر یہ اقدام کیا کہ آرڈیننس کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ چنانچہ آرٹیکل ۸۷ کے تحت سینیٹ نے آرڈیننس منع کر کے واپس بھیج دیا۔ اس طرح کا تسلسل جمہوری عمل میں اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ سینیٹ کی مدت اور اسمبلی کی مدت مختلف ہو۔ اس بنا پر جناب والا! جتنے بھی اعتراضات اس ادار یہ کے اندر کیے گئے وہ حقائق کے خلاف ہیں۔ گندی اور تحقیر آمیز زبان اپنی جگہ ہے لیکن اس بارے میں حقائق دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ادار یہ نگار کو کچھ معلوم نہیں کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اور جمہوریت اور فیڈریشن کے اصول کیا ہیں اور کس طرح سے یہ سارے معاملات طے پاتے ہیں۔

جنابِ والا! مناسب ہو گا کہ یہاں سینیٹ کی مدت اور الیکشن کے حوالے سے کچھ معلومات بھی ایوان کے سامنے پیش کر دوں۔ ارجنٹینا میں سینیٹ کی مدت ۹ سال ہے اور ایک تہائی ارکان کے ہر تیسرے سال انتخابات ہوتے ہیں، ارکان کی کل تعداد ۴۶ ہے اور یہ بالواسطہ منتخب ہیں جس طرح کہ پاکستان میں ہیں۔ آسٹریلیا میں سینیٹ کی مدت چھ سال ہوتی ہے جس میں سے ہر تین سال کے بعد نصف ریٹائر ہوتے ہیں۔ آسٹریا میں ۶۳ ممبرز ہیں اس کی پانچ سے چھ سال مدت اور یہ متناسب نمائندگی کی بنیاد پر بیک وقت ممبر اور متبادل ممبرز ہوتے ہیں اور سٹیٹ یا پروونشل اسمبلی سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ بیلجئیم میں سینیٹ کی مدت چار سال ہے ۱۸۲ افراد میں سے ۱۰۶ براہ راست منتخب ہیں پچاس بالواسطہ ہیں۔ برازیل میں سینیٹ کی آٹھ سال مدت ہے اور ہر چار سال کے بعد پہلے چار سال میں ایک تہائی ممبر ریٹائر

ہوتے ہیں۔ کینیڈا میں ۱۰۴ ممبران ہیں اور یہ سب کے سب وزیر اعظم کے مشورے پر حکومت کینیڈا کے مقرر کردہ ہیں۔

جناب چیئر مین! میں تفصیل میں اس لیے جارہاہوں کہ اس موضوع پر فی الحقیقت کچھ تعلیم کی بھی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کے سامنے تمام حالات رہیں۔ میں خاص طور پر "دی مسلم" کے ذمہ داران کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان تمام حقائق پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے ایسی باتیں کہہ کر جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے پارلیمانی نظام کا تصور خراب ہوا ہے۔ تو جنابِ والا! میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ چیکوسلواکیہ میں ۱۵۰ افراد ہیں جس کی پانچ سال کی مدت ہے ممبران میں براہ راست ۵۰ فیصد اور بالواسطہ ۵۰ فیصد منتخب ہوئے ہیں۔ فرانس میں جہاں ۳۱۷ افراد ہیں ۹ سال کی کل مدت ہے یعنی ہر تیسرے سال ایک تہائی تبدیل ہوتے ہیں ۳۱۷ میں سے ۲۹۶ وہ ہیں جو مقننہ یا شہری نمائندگان کے ذریعے بالواسطہ منتخب ہوتے ہیں۔ جرمنی میں ۴۵ کا ہاؤس ہے اور یہاں پر بھی صورتِ حال یہ ہے کہ ۴۱ ریاستی حکومتیں مقرر کرتی ہیں اور ۴ فیڈرل حکومت مقرر کرتی ہے۔ ہندوستان جہاں ۲۴۴ کا ہاؤس ہے، ان کے ۲۳۲ بالواسطہ منتخب ہوتے ہیں اور ۱۲ کو صدر نامزد کرتا ہے۔ پاکستان میں کوئی نامزدگی نہیں ہے لیکن انڈیا میں نامزدگی ہے۔ آئر لینڈ میں ۶۰ کا ہاؤس ہے جس میں سے ۴۹ براہ راست منتخب ہیں اور باقی بالواسطہ منتخب ہیں۔ اٹلی میں سینیٹ کی پانچ سال کی مدت ہے اور ۳۲۱ افراد ہیں جس میں سے ۳۱۷ براہ راست منتخب ہوتے ہیں۔ جاپان میں چھ سال کی مدت ہے ۱۹۲ براہ راست منتخب ہوتے ہیں اور ۱۰۰ متناسب اتفاق رائے سے بالواسطہ منتخب ہوتے ہیں۔ ملائشیا میں ۶۹ کا ہاؤس ہے جس میں سے ۲۳ بالواسطہ منتخب ہیں اور ۴۶ نامزد کردہ ہیں۔ میکسیکو میں براہِ راست انتخابات ہیں۔ نیدر لینڈ میں چار سال کی ٹرم ہے ۷۵ افراد ہیں اور بالواسطہ انتخابات ہیں۔ سپین میں چار سال کی ٹرم ہے ممبرز ۲۰۸ ہوتے ہیں اور ۴۸ بالواسطہ منتخب ہوتے ہیں۔ سوئٹزر لینڈ میں براہ راست انتخابات ہیں۔ یوکے میں خاندانی نواب یا سیاسی بار تبہ لوگ

ایوان بالا کا حصہ بنتے ہیں۔ امریکہ کا ذکر بار بار کیا جارہا ہے۔ امریکہ میں اس وقت سینیٹ براہ راست منتخب ہوتی ہے لیکن ۱۹۱۳ء تک سینیٹ وہاں بھی بالواسطہ منتخب ہوتی تھی۔ ریاستی اسمبلی ان کو منتخب کرتی تھی۔ سینیٹ سے تعاون اس وقت بھی موجود تھا۔

اس کے بعد جنابِ والا! چونکہ مالی اختیارات کے بارے میں بھی بار بار بات کہی گئی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ بھی آپ کے سامنے رکھ دوں کہ دنیا میں جن ۲۸ ممالک میں اس وقت دوایوانی پارلیمان ہیں ان میں سے چودہ ایسے ہیں جن میں مالی معاملات میں سینیٹ اور ایوان زیریں میں کوئی فرق نہیں۔ ان چودہ میں سے صرف تین راست منتخب ہیں اور گیارہ بالواسطہ منتخب ہیں لیکن ان بالواسطہ منتخب سینیٹ کو فنانس بل کو منظور کرنے اور ترمیم کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ باقی ۱۴ میں پوزیشن مختلف ہے۔ صرف پاکستان واحد ملک ہے جہاں سینیٹ کو یہ اختیار بھی نہیں کہ وہ فنانس بل پر غور کرے، اپنی رائے دے سکے[1]۔ باقی تمام ممالک کے اندر بلاشبہ سینیٹ کے مالی معاملات پر اختیارات ہیں لیکن انہیں محدود کیا گیا ہے۔ دو پہلوؤں سے ایک یہ کہ وہ ویٹو نہیں کرسکتے اور نامنظور نہیں کرسکتے، بحث کرسکتے ہیں اور سفارش کرسکتے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ وہ مؤخر کرسکتے ہیں لیکن وہ غیر ضروری تاخیر نہیں کرسکتے۔ چنانچہ کچھ ممالک میں پندرہ دن اور کچھ میں ایک مہینے کا وقت ہے کہ اتنے وقت کے اندر اندر ایوان بالا کو اپنی رائے بھیجنا ہوگی اور آخری فیصلہ پھر ایوان زیریں ہی کرتا ہے لیکن پاکستان واحد ملک ہے جہاں اس کو خارج کیا گیا ہے۔

جنابِ والا! اگر یہ حقائق آپ اپنے سامنے رکھیں تو اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں جہاں دو ایوان ہیں وہاں آج بھی سینیٹ بالواسطہ منتخب ہے یا سینیٹ کا بڑا حصہ بالواسطہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں سینیٹ کو قانون سازی کرنے کے

---

[1] یہ صورت ۱۸ ویں ترمیم کے تحت تبدیل ہوگئی ہے اب سینیٹ فنانس بل پر غور کرکے رائے دیتی ہے۔

لیے اور قانون کو نامنظور کرنے کے لیے اختیارات حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد پھر طریقہ کار تلاش کیا جاتا ہے کہ جب دونوں میں اختلاف ہو تو اسے کس طرح حل کیا جائے۔ کہیں اس کے لیے مشترکہ اجلاس کا راستہ ہے جو ہمارے ہاں بھی ہے، کہیں اس کے لیے مشترکہ کمیٹیاں ہیں، کہیں اس کے لیے یہ راستہ ہے کہ ایک ایوان دوسرے ایوان کو بھیجتا ہے وہ پھر واپس بھیجتا ہے اور اس طرح تعامل سے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر چیز جمہوری روایات، جمہوری تجربات اور ایک فیڈرل نظام کی حقیقی ضرورت ہے۔

میں یہاں اس بات پر بھی زور دینا چاہتا ہوں کہ اگر قومی اسمبلی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے ارکان راست منتخب ہوتے ہیں تو سینیٹ کو یہ اعزاز اور یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں وفاقی یونٹوں کی مساوی نمائندگی ہے۔ اس طرح فیڈریشن کے حقوق اور فیڈریشن کے تقاضے اس میں پورے ہو سکتے ہیں۔ جب سینیٹ اور قومی اسمبلی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے، ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے چلیں گے تو بہتر صورت حال ہو گی۔ سینیٹ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قومی اسمبلی کی رائے کا احترام کرے لیکن قومی اسمبلی کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ وہ سینیٹ کی رائے کا احترام کرے اور یہی چیز جمہوریت کی روح ہے۔ یہ مخالفت نہیں ہے۔ ان کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہے، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی معاملہ نہیں ہے بلکہ قوم کے مفاد میں اور فیڈریشن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہر ایک کے اپنے اپنے کچھ امتیازات ہیں اور امتیازات کی بناء پر وہ صحیح فیصلے ہونے میں یا قانون سازی میں اور صحیح نمائندگی کا حق ادا کرنے کے معاملے میں مدد کرتے ہیں یہ ہیں وہ وجوہ جس کی بناء پر جناب والا! سینیٹ کا یہ ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے۔

اب جنابِ والا! میں آپ کے سامنے استحقاق کی بات رکھنا چاہتا ہوں، یعنی اب تک میں نے یہ ثابت کیا ہے:

نمبر ۱.   یہ کہ اداریہ میں جن چیزوں کو حقائق قرار دیا گیا ہے وہ حقائق نہیں ہیں۔

نمبر ۲.   سینیٹ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ غلط ہے۔ اس تصویر میں دستور کے نظام اور سینیٹ کی کارکردگی اور سینیٹ کی تعریف کے مابین کوئی مطابقت نہیں ہے۔

نمبر ۳.   تیسری چیز یہ کہ سینیٹ کے لیے جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ تحقیر آمیز ہے، توہین آمیز ہے، بدنام کرنے بلکہ اس کو نیچا دکھانے کی ہے۔ اس کی تذلیل کی گئی ہے۔

یہ تین چیزیں میں نے اب تک ثابت کی ہیں۔ اب میں آپ کو لے جانا چاہتا ہوں، جنابِ والا! استحقاق کے قانون کی طرف جیسا کہ Erskine May کی کتاب Parliamentary Practices میں یہ جملہ ہے کہ:

"یہ ایوان اور اس کے اراکین کے کچھ بنیادی حقوق ہیں استحقاق نہیں ہیں"۔

یہاں میں یہ بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ کچھ استحقاق انفرادی طور پر ارکان کے ہیں لیکن کچھ استحقاق ایوان کے بطور ایوان ہیں۔ جس چیز کو ایوان کے استحقاق کے طور پر جانا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بلا شبہ اس کے فیصلے پر تنقید بھی کی جاسکتی ہے اور آپ اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ اس کی تذلیل نہیں کر سکتے، آپ اس کی ایمانداری کو مشکوک نہیں بنا سکتے۔ اس کا جو احساس ذمہ داری ہے اس پر آپ حرف گیری نہیں کر سکتے اور سیاسی ڈھانچہ میں اس کا جو آئینی مقام اور حیثیت ہے اس پر آپ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ زیر بحث معاملہ میں یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو ایوان کے استحقاق کے خلاف ہوئی ہیں۔ 'May' کا ۲۰واں ایڈیشن میرے پاس ہے۔ وہ کہتا ہے:

"استحقاق کی نمایاں علامت اس کا معتدل کردار ہے، یہ اراکین کو حاصل ہیں کیونکہ ایوان اپنے ارکان کی خدمات کے استعمال اور اپنے جائز اختیار اور وقار کی توثیق کے بغیر اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا"۔

جنابِ والا! میں یہ الفاظ دہراؤں گا کہ:

”اپنے اختیار اور وقار کی توثیق“

اگر کوئی چیز اس کے اختیار اور اس کے وقار کو مجروح کرنے والی ہو تو یہ دراصل توہین کی تعریف میں آتی ہے اور یہ اس لیے آتی ہے جیسے کہ 'May' نے دوسری جگہ کہا ہے کہ:

”پارلیمنٹ کا استحقاق وہ حقوق ہیں جو اس کے اختیارات پر عمل درآمد کے لیے بالکل ضروری ہیں“۔

تو جنابِ والا! یہاں میں سب سے پہلے 'May' ہی سے شروع کرتا ہوں۔ 'May' نے اس مسئلہ کو لیا ہے کہ ایک طرف پریس کی آزادی اظہار ہے اور دوسری طرف پارلیمنٹ کی عزت۔ تعمیری تنقید کا کردار کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۵۲ پر وہ تحریر کرتا ہے:

”۱۷۰۱ میں، ہاؤس آف کامنز نے فیصلہ کیا کہ کسی بھی کتاب، کو چھاپنا یا شائع کرنا جو ایوان کی کارروائی کی رسوائی کرے۔ ایوان کے حقوق اور استحقاق کی سنگین خلاف ورزی ہے ایوان کو کردار یا کارروائی کے حوالے سے جو مقام مرتبہ حاصل ہے اس پر مسلسل حملے کیے جائیں۔ ایوان بالا اور ایوان زیریں دونوں ان اصولوں پر قائم ہیں کہ اس طرح کی کارروائیاں ایوانوں کو ان کے کاموں کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں اور ان کی وجہ سے عزت واحترام کو نقصان پہنچتا ہے“۔

اور اس کے بعد پھر 'May' نے ۳۰ سے ۳۵ مثالیں دی ہیں جس میں مختلف مسائل پر جیسے اخبارات میں یا کتابوں میں اس قسم کی باتیں لکھی گئی ہیں جو توہین آمیز تھیں اور ان کا نوٹس لیا گیا بلکہ کئی پر سزائیں بھی دی گئیں۔ یہ ساری تفصیلات آپ کو وہاں پر ملیں گی۔

جنابِ والا! آگے چل کر 'May' میں آتا ہے:

”کہے گئے الفاظ یا شائع شدہ تحریروں کے علاوہ دیگر طریقوں سے جو ایوان یا اس کی کارروائی کی رسوائی کا باعث نہیں حالانکہ وہ ایوان کی کارروائی یا کاموں کی انجام دہی میں براہ راست مزاحم یا رکاوٹ نہیں ڈالتے ہیں پھر بھی بالواسطہ طور پر ان کا

نتیجہ ایوان کی توہین، ہتک، ذلت، تضحیک ہو یا اس کے اختیار کو کم کرنا توہین کا باعث بن سکتا ہے"۔

اور اس حوالے سے مجھے یاد آتا ہے کہ ایک کارٹون بھی زیر بحث آیا ہے اور اس کارٹون پر بھی پارلیمنٹ نے گرفت کی ہے۔ آگے چل کر کے یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ:

"غلط کی عدم موجودگی کا مطلب توہین آمیز سچائی کا پیش خیمہ ہے یا لاعلمی کا مطلب الزام سے برأت نہیں"۔

تو معلوم ہوا کہ اگر لاعلمی کی بناء پر کیا گیا ہے یا نیت درست بھی ہو جب بھی اگر ایسے الفاظ استعمال کیے گئے جو پارلیمنٹ کی توہین ہیں تو وہ توہین کے ذیل میں آتے ہیں۔ اسی سلسلے میں جنابِ والا! میں ایک اور کتاب سے بھی آپ کو حوالہ دوں جو حال ہی میں آئی ہے اور آئین پر بڑی اچھی کتاب ہے۔ یہ کتاب جسٹس ہدایت اللہ کی ادارت میں حال ہی میں تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہدایت اللہ بھارتی سپریم کورٹ کے جج رہے ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اس مسئلے کے اوپر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور اس میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ:

"توہین عام طور پر ایوان یا اس کے اراکین کے اختیار یا وقار کے خلاف جرم ہے جیسا کہ قانون کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایوان کے اختیار یا وقار کے خلاف جرم کو مٹایا نہیں جاسکتا اور نہ ہی توہین کی سزا دینے کے اختیارات کو سلب کیا جاسکتا ہے ماضی میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی"۔

اسکے علاوہ 'ہندوستان میں پارلیمانی استحقاق کا قانون' میں رام چندرن نے بھی اس پر گفتگو کی ہے۔ یہ تمام حوالے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اگر کسی بھی نیت سے پارلیمنٹ کے کسی ہاؤس کے بارے میں مذمتی الفاظ استعمال کیے جائیں، اس کی حیثیت کو گرایا یا اس کے اختیار کو چیلنج کیا جائے اور اس کے وقار پر حرف گیری ہو تو یہ واضح طور پر

ایوان کے استحقاق کی خلاف ورزی ہے۔

میں نے دنیا کے پارلیمانی مباحث و تفصیلات سے حقائق آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس اداریے میں واضح طور پر بدنیتی کے ساتھ اور وہ زبان استعمال کرتے ہوئے جو تہذیب کے ہر معیار سے گری ہوئی ہے سینیٹ کا تمسخر اڑانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس پر گرفت ضروری ہے۔ یہ سچی صحافت کے خلاف ہے۔ ورنہ پریس اپنی حدود میں رہتے ہوئے آزادی صحافت کے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو گرفت کرے ہم نے ہمیشہ اس کا خیر مقدم کیا ہے اور آئندہ بھی خیر مقدم کریں گے۔ لیکن آزادی صحافت کے نام پر گالیوں کی آزادی، تحقیر اور تذلیل کی آزادی اور عزت سے کھیلنے کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا اس ایوان کو لازماً نوٹس لینا چاہیے۔

میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ چند دن پہلے غالباً ''فرنٹیئر پوسٹ'' کے بھی کسی اداریے میں اسی قسم کے اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن وہ چونکہ میں نے دیکھے نہیں تھے اس لیے میں نے اس کو شامل نہیں کیا۔ لیکن جیسا کہ منظور گچکی صاحب کہہ رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس کو بھی شامل کیا جائے۔ اس اخبار کے نمائندے کو بھی بلایا جائے ان سے وضاحت لی جائے اور اس کے بعد پھر اس سلسلے میں کمیٹی مناسب کارروائی کرے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اس قرارداد کو ایوان کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

[بعد ازاں معاملہ تفصیلی غور و خوض کے لیے سینیٹ استحقاق کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔]

(۲۶ دسمبر ۱۹۹۳ء)

اشاریہ

آ

آزاد جموں وکشمیر، ۲۶ / آزاد کشمیر، ۲۶، ۸۶، ۹۲
آزادی اظہار، ۷، ۲۰۷، ۲۱۸، ۲۲۹ / آزادی صحافت، ۷، ۲۰۷، ۲۱۱، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۳۱ / آزادیٔ فکر، V
آزادی کا تحفظ، ۲۱۰، ۲۱۳
آسام، ۱۶۸
آسٹریا، ۳۶، ۲۲۴
آسٹریلیا، ۷، ۳، ۵۴، ۷، ۲۰، ۲۲۴
آغاز بلوچستان پیکج، ۱۶۰
آفات سماوی وارضی، ۱۰۰
آفت زدہ علاقہ، ۱۰۳
آفتاب احمد خان شیر پاؤ (وزیر داخلہ)، ۱۳۷
آل پارٹیز کانفرنس، ۸۲
آمنہ امین اللہ رئیسانی، ۲۰۳
آئر لینڈ، ۲۲۵
آئی ایم ایف (IMF)، ۱۱۴
آئی آر آئی این (Integrated Regional Information Networks)، ۱۵۸
آئی جے آئی (اسلامی جموری اتحاد)، ۱۸۱
آئی جی (انسپکٹر جنرل پولیس)، ۱۳۰، ۱۵۱
آئین ۱۹۷۳ء، ۱
آئینی ترمیم - آٹھویں، ۳۰، ۵۱، ۵۹، ۲۱۹ / ۱۸ویں، ۱، ۲، ۶، ۸، ۱۷، ۱۸، ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۱۲۲، ۲۲۶

ا

ابتدائی طبی امداد، ۸۶
ابلاغی جنگ، ۱۹۸
ابو غریب (جیل)، ۳۵
ابو شحمہ (فرزند حضرت عمر فاروقؓ)، ۱۴۸
اٹلی، ۳۶، ۸۷، ۹۹، ۲۲۵
اجتماعی توبہ، ۹۶
اجتماعی شعور میں کمی، ۱۴۲
اجتماعی قبر، ۱۵۸
اجمل دہلوی، ۱۶۶
احساس محرومی، ۱۷۲، ۲۱۶
احمدی، ۳۸
ارجنٹینا، ۲۲۴
ارسکن مے (Erskine May)، ۶، ۲۲۸، ۲۲۹
اسامہ بن زید، ۷۶، ۱۴۱
استحصال نسواں، ۳۵
استعماری نظام، V
اسٹیٹ بینک، ۹۱
اسٹینڈنگ کمیٹی برائے زراعت، ۲۰۴
اسکاؤٹس، ۸۶، ۹۲
اسلام آباد ٹریفک پولیس، ۱۴۲ / اسلام آباد کمشنر، ۱۲۷ / اسلام آباد کیپٹل ٹیریٹری، ۳
اسلام آباد کی ڈرگ مافیا، ۱۲۹
اسلام آباد پولیس کے جرائم پر رپورٹ، ۱۲۶
اسلام آباد ہائی کورٹ، ۱، ۲، ۳، ۶ / اسلام آباد ہائی کورٹ کے قیام کا قانون، ۱ / اسلام آباد ہائی کورٹ کی پرنسپل سیٹ، ۳
اسلام پر مبنی سوچ، ۱۷۴ / اسلام کا اصول، ۴۳
اسلام کے خلاف ایک عالمگیر جنگ، ۴۴
اسلام کا قانون قصاص و دیت، ۱۳۳
اسلامی تاریخ، ۵۹، ۱۴۹ / اسلامی تناظر، ۱۲
اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۲ / اسلامی ریاست، ۱۴۶

اسلامی شریعت کے مقاصد، ۴۵

اسلامی فکر، ۱۳۸

اسلامی قانون، ۸، ۴۸، ۵۰، ۵۷، ۶۰، ۷۵، ۷۷، ۱۳۱ / اسلامی قوانین، ۳۷، ۴۰، ۴۵، ۶۹، ۱۳۳ / اسلام کا تصور قانون، ۴۸

اسلامی معاشرہ، ۸۷، ۱۳۸، ۲۱۶

اسلامی نظام شوریٰ، ۲۱۸

اسلامی نظام عدل، ۵۴

اسلامی نظریاتی کونسل، ۴۹، ۵۲، ۶۱، ۶۹، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۵۰

اسلامی و مشرقی معاشرت کی روایات، ۸۷

اسوۂ حسنہ، ۶۵

اصول جمہوریت، ۲۲۱

اصول فقہ، ۴۹

اطلاعات تک رسائی، ۲۰۷

اعجاز رحیم (پلاننگ کمیشن)، ۱۹۱

اغواء، ۳۴، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۵، ۱۵۴، ۱۵۵

افتخار اللہ بابر (سیکرٹری سینیٹ)، ۱۲۴

افغان کیمپ، ۹۴

افغانستان کی سرحدوں سے دہشت گردی، ۱۵۴

اقتصادی اصلاحات، ۲۹

اقتصادی بحران، ۱۵۳ / اقتصادی و معاشی ترقی، ۱۴۴

اقوام متحدہ، ۷، ۱۸، ۳۶، ۲۰۶ / اقوام متحدہ کا ۱۹۴۸ء کا انسانی حقوق کا چارٹر، ۳۶

اکبر، مغل بادشاہ، ۶۰

اکرام چوہدری، ۳۵

اکرم ملک، ۱۹۱

القاعدہ، ۵۸

البقرۃ (سورۃ)، ۱۳۸

الحجرٰت (سورۃ)، ۱۷۱

النور (سورۃ)، ۴۶، ۵۶، ۷۵، ۷۷

الٰہی بخش سومرو، ۱۱۲

الیکٹرانک میڈیا، ۲۰۸، ۲۱۵

ام المومنین عائشہؓ، ۶۷

امت کا استحکام، ۳۷

امت مسلمہ ہند، ۷۱

امتیاز عالم، ۵۱

امتیازی قانون، ۱۸۶

امریکن سرٹیفکیٹ، ۱۵۳

امریکہ کی انسانی حقوق رپورٹ، ۳۸

امریکہ کی حکومت، ۷۱، ۷۳

امریکہ کی نیشنل سیکورٹی کونسل، ۳۸

امریکی این جی او RAINN (Rape, Abuse & Incest National Network)، ۶۴

امریکی سفارت خانہ، ۲۷، ۳۷ / امریکی سفیر، ۲۷

امریکی عورتیں، ۶۴

امریکی نقطۂ نظر، ۳۶

امن کمیٹیاں، ۱۷۶

امن و امان، ۲۹، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶

امین اللہ رئیسانی، ۲۰۳

انتہا پسند اسلام، ۳۷

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، ۸۹

انڈونیشیا، ۹۰

انسانوں کی آزادی، ۱۵۶

انسانی اعضاء کی پیوند کاری، ۱۱۷ / انسانی اعضاء کی تجارت، ۱۱۷، ۱۱۸

انسانی حقوق، ۷، ۸، ۹، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۱۳۰، ۱۵۰، ۱۵۸، ۱۵۹، ۲۰۷ / بنیادی حقوق، ۷۱، ۱۵۰، ۱۵۵، ۲۲۸ / انسانی حقوق کا بین الاقوامی اعلامیہ، ۲۰۷ / انسانی حقوق کمیٹی، ۹، ۱۳۰ / انسانی حقوق کمیشن پاکستان کی رپورٹ، ۱۵۸ / انسانی حقوق کی خلاف ورزی، ۷، ۸ / انسانی مساوات، ۱۳۹ / انسانی وقار، ۱۵۵ / انسانیت کی

فلاح،۵۳/ انسانیت کے ارتقا،V
انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس، ۱۹۰
انشورنس، ۲۹
انگلستان (انگلینڈ)، ۱۲، ۲۱، ۶۴، ۱۰۹، ۱۶۲، ۱۶۷، ۱۸۲، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۱۲، ۲۲۳، ۲۲۵/ انگلستان پریس کونسل، ۲۱۲
انہدام حدود اللہ قانون، ۴۴
انیتا ایم ویز (Anita M. Weiss)، ۶۷
اورماڑہ، ۱۰۰
اوستہ محمد، ۱۳۰
اوگرا (آئل اینڈ گیس ریگولیٹری اتھارٹی)، ۱۲۱
اے آر وائی (ٹیلی وژن) ۲۱۰
اے کے بروہی، ۶۱
ایدھی فاؤنڈیشن، ۱۱۳
ایڈمرل زینی، ۲۷
ایڈوائس سسٹم، ۲۱۳
ایران، ۴۰، ۸۷، ۹۶
ایف آئی اے (فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی)، ۱۷۰
ایف آئی آر (فرسٹ انفارمیشن رپورٹ)، ۶۹
ایم کیو ایم (متحدہ قومی موومنٹ) الطاف گروپ، ۱۷۲
ایم کیو ایم، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۷۵
ایم کیو ایم، حقیقی، ۱۷۲
ایمانوایل کانٹ، ۲۱۰
ایمل کانسی، ۲۷
ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ، ۱۵۶
این ڈی خان (وزیر قانون)، ۱۶۶
این آر او (National Reconciliation Ordinance)، ۱۵۳
ایوان جائزہ، ۲۱
ایوان بالا، ۶، ۲۱، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۲۹
ایوان زیریں، ۵۳، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۲۹
ایوان کی توہین، ۲۳۰

ب

بابوزئی (ضلع سوات)، ۱۵۸
بار ایسوسی ایشنز، ۱۴، ۱۵/ بار کونسل ایکٹ، ۱۴
بائبل، ۳۵/ تلمود، ۳۵
بجلی کا بحران، ۲۴
بحالیات کا ادارہ، ۹۱
بدکاری، ۶۷
برصغیر، ۳۱، ۱۶۸
برازیل، ۲۲۴
برآمدات، ۱۱۳
برطانوی پارلیمنٹ، ۱۲۳
برطانوی دور کے پولیس ایکٹ، ۱۵۷
برطانوی صحافی، ۸۲
برطانوی نوآبادیاتی سامراج، ۳۱
برطانوی وفد، ۱۶۷
برطانیہ، ۸۷
برمنگھم، ۱۹۹
برہمن، ۱۶۸
بُری حکمرانی، ۱۶۰
بش انتظامیہ، ۲۱۳
بش (George W. Bush)، امریکی صدر، ۳۷، ۵۷، ۵۸
بگرام، ۳۵
بگلہیار ڈیم، ۱۰۳
بلتستان، ۲۶
بلغاریہ، ۳۶
بلوچستان، ۸، ۱۴، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۳۰، ۱۳۷، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۶۰، ۱۶۸/ بلوچ، ۱۳۰، ۱۷۰، ۱۷۱
بم دھماکے، ۱۳۷

بنکنگ،۲۹
بنگال،۱٦۸
بنوعباس،۱۴۹
بنیاد پرست،۳۹
بنیادی ادارتی ڈھانچے کی تعمیر،۱۰۵
بنیادی اقدار،۱۳،۳۷
بنیادی معاشرتی اصلاحات،۱۳۲
بہار،۱٦۸
بہبود کے ادارے،۱۸۰
بونیر،۹۷
بے حیائی کا جھوٹا الزام،۵٦
بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام،۱۷
بے نظیر بھٹو،۱۷،۵۳،۱٦۵،۱۷۹،۲۱۷
بیجنگ کانفرنس،۱۸
بیرونی سامراج کے کارندے،۳۷/ بیرونی ہاتھ،۱۵۴
بیلجئیم،۲۲۴
بین الاقوامی امدادی ادارے،۸۴
بین الاقوامی رائے عامہ،۲۰۴
بین الاقوامی سازش،۴۰/ بین الاقوامی مسائل،VI
بین الاقوامی معاہدے،۲۰۴
بین الاقوامی این جی اوز،۱۰۱/ غیر ملکی این جی اوز،۹۵/ این جی اوز،۸۴
بین الاقوامی قانونی ادارے،۲۰۴
بین الاقوامی مذہبی آزادی رپورٹ،۱۷
بھٹو، ذوالفقار علی،۲۹،۳۸،۵۹،۱۷۲،۱۷٦،۱۹۳

پ

پاکستانی فوج کی قیادت،۲۷
پارلیمانی مباحث،۲۳۱/ پارلیمانی کمیٹی کا قیام،۹۱
پارلیمانی نظام کا تصور،۲۲۵/ پارلیمانی نظام کے بنیادی اصول،۳۸
پارلیمنٹ - استحقاق،۲۲۹/ کی توہین،۲۳۰/ کی عزت،۱٦۴،۱٦۴/ کا فیصلہ سازی میں کردار،۸۸
پارلیمنٹ دستور کی محافظ،۱۹٦/ پارلیمنٹ ہاؤس کی حفاظت،۱۲۳/ پارلیمنٹ کے اختیارات،۳۰
پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس،۸۲/ پارلیمنٹ ہاؤس میں آتشزدگی،۱۲۲/ پارلیمنٹ ہاؤس،۱۲۲،۱۲۳،۱۲۵،۱۵٦
پاک امریکن دستاویزات،۲۷
پاکستان اسکول،۲۰۲/ پاکستان انٹرنیشنل اسکول دمشق،۲۰۳
پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائن،۱۸۸/ پی آئی اے کا فنانس ڈیپارٹمنٹ،۱۸۹
پاکستان بار کونسل،۱۴،۱۵
پاکستان بھارت تعلقات،۲۰۱/ پاک وہند،۲۰۱
پاکستان ٹیلی ویژن،۲۱۴/ پی ٹی وی،۲۰۹،۲۱۴،۲۱۵/ پی ٹی وی ورلڈ،۲۱۴
پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی،٦۱
پاکستان کا قیام،۸۷
پاکستان- بنیادی تصور،۱۹۸،۲۰۱/ بیرونی دنیا میں تاثر،۱۹٦/ سفارت کار،۲۰۲/ معاشی شہ رگ،۱٦۵
پاکستانی آرمی،۱۵۸
پاکستانی پارٹی،۱٦۹
پاکستانی- سفارت خانے،۱۹۷/ سوچ،۱۷۴/ کارڈ،۱۷۰ کمیونٹی،۱۹۷/ کونصلر،۲۰۱
پانی کی تقسیم کی منصفانہ پالیسی،۲۰۵/ پانی کی سپلائی،۲۰٦/ صاف پانی کی فراہمی کا منصوبہ،۱۱۹
پاور جنریشن اور مینجمنٹ،۲۴
پبلک اکاؤنٹس کمیٹی،۱٦
پختون،۱٦۰،۱۷۱/ پشتو،۱۷۰
پرائیویٹ پاور اینڈ انفراسٹرکچر بورڈ،۲۴
پروفیسر این آر مداوا،۵٦

پسنی، ۱۰۰

پشاور ہائی کورٹ، ۲۱

پشاور، ۲۱، ۸۵، ۱۴۹

پلاننگ کمیشن، ۹۹، ۱۰۳، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲

پناہ گزین، ۹۴

پنجاب، ۱، ۸، ۱۴، ۴۷، ۹۷، ۱۰۹، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۵۵، ۱۶۳، ۱۶۸، ۱۷۱، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۱۱/ حکومت، ۱۲۰/ پولیس، ۲۱۱/ پنجابی کارڈ، ۱۷۰

پہلی جنگ عظیم، ۳۶

پولیس کی اصلاح، ۵۰، ۱۴۲، ۱۶۳/ پولیس اصلاحات، ۱۵۱/ پولیس ریفارم، ۱۳۷

پولیس کا طرزِ عمل، ۶۸/ پولیس کا فرسودہ نظام، ۳۲/ پولیس کا کردار، ۱۴۲/ پولیس کا مجرمانہ کردار، ۱۵۷/ پولیس کی ٹریننگ، ۱۶۳/ پولیس کی سیاسی بنیادوں پر تشکیل، ۱۵۷

پولینڈ، ۳۶

پیپلز پارٹی، ۵، ۱۰، ۱۶، ۵۱، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۳۰، ۱۴۶، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۸۷/ پیپلز پارٹی کا دور، ۱۸۷/ پیپلز پارٹی کی حکومت، ۱۰، ۱۸۱

پیس (Peace) چینل، ۲۱۱

پیمرا آرڈیننس، ۲۰۸/ پیمرا کی اتھارٹی، ۲۰۹

ت

تارکین وطن، ۱۱۴

تخلیق آدم، ۱۳۸

تربیلا اور منگلا کے متاثرین، ۱۰۴

ترکی، ۸۷، ۹۰، ۹۶، ۱۴۹

ترنول پولیس اسٹیشن، ۱۲۹، ۱۳۰

تسنیم احمد قریشی (وزیر مملکت برائے داخلہ)، ۱۳۰

تشدد کا راستہ، ۱۶۹/ تشدد مسائل کا حل نہیں، ۱۶۸

تصور جہاد، ۳۸، ۴۵

تعزیر، ۴۵، ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۶۰، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۷۵، ۷۹/ تعزیری نظام انصاف، ۱۲

تعلیم، ۱۷، ۳۳، ۴۴، ۶۹، ۷۰، ۸۳، ۹۵، ۹۸، ۱۱۳، ۱۳۲، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۶، ۱۷۷، ۱۹۱، ۲۰۰، ۲۱۴، ۲۱۶، ۲۲۵/ تعلیم کا بجٹ، ۱۱۳/ تعلیم کا حق، ۱۷/ تعلیمی نظام، ۱۴۲

تعمیر نو اور بحالی، ۹۰

تعمیری تنقید، ۲۲۹

تفتیش کا مرحلہ، ۱۱

تفہیم دین اکیڈمی، ۱۴۹

توانائی، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۱۱۳

تھانہ کلچر، ۱۵۱

ٹ

ٹارگٹ کلنگ، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۹

ٹائم (ہفت روزہ)، ۱۹۹

ٹائمز، ڈیلی، ۱۱۷

ٹرانسپورٹ کا مسئلہ، ۱۷۷

ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل، ۱۰۲

ٹونی بلیئر (برطانوی وزیر اعظم)، ۳۷، ۳۹

ٹیکنالوجی کے ادارے، ۱۸۰

ث

ثقافتی اقدار، ۲۱۲

ج

جاپان، ۳۶، ۸۷، ۲۲۵

جاگیر دارانہ نظام، ۳۳

جامع منصوبہ بندی، ۹۲
جان محمد جمالی، ۱۳۰
جان میجر (سابق وزیر اعظم برطانیہ)، ۲۲۳
جج میڈ لاء(Judge made law)، ۶۰
ججز کے مقدمے، ۱۴
جدید امریکی قدامت پسند، ۳۷
جدہ، ۲۰۰
جرائم کی تحدید، ۵۴ / جرم، ۵۵
جرگہ، ۱۳۱
جرمن، ۳۶، ۲۱۰ / جرمنی، ۳۶، ۲۲۵ / جرمنی کی نازی حکومت، ۳۶ / جرمنی کی شکست، ۳۶
جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلیس، ۵۴
جسٹس خواجہ محمد احمد صمدانی، سیکرٹری قانون، ۶۱
جسٹس افضل چیمہ، ۶۱
جسٹس کاکا خیل، ۶۱
جسونت سنگھ، ۲۷
جعفر حسین مجتہد، ۶۱
جعلی ادویات، ۱۱۶
جماعت اسلامی، ۱۱، ۶۱، ۱۵۶، ۱۶۹ / امیر، ۱۶۹
جمعیت علماء اسلام پاکستان، ۶۱، ۱۶۵ / جمعیت علماء پاکستان، ۶۱
جمہوری اصول، ۱۷۳ / جمہوری تجربات، ۲۲۷ / جمہوری روایات، ۳۸، ۱۴۶، ۲۱۹، ۲۲۳، ۲۲۷ / جمہوری عمل، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴ / جمہوری فورم، ۲۲۴ / جمہوری ممالک، ۱۶۲، ۲۲۰
جمہوریت، ۲۳، ۵۳، ۱۲۴، ۱۳۹، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۲، ۱۷۳، ۱۹۵، ۲۰۶، ۲۱۸، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۷
جمہوریت کی روح، ۲۲۷
جنت بی بی (زوجہ قیصر خان عمرانی)، ۱۳۰
جنرل پرویز مشرف، ۱، ۳۱، ۳۸، ۴۰، ۴۲، ۵۱، ۵۲، ۵۸، ۶۰، ۷۲، ۷۷، ۸۵، ۹۰، ۹۳، ۱۰۳، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۶، ۱۵۲، ۱۸۷، ۱۹۳، ۱۹۴
جنرل ایوب خان، ۱۱، ۵۹، ۷۲، ۱۷۲
جنرل جہانگیر کرامت، ۷۲
جنرل ضیاء الحق، ۲۹، ۳۱، ۴۹، ۷۲، ۱۳۳، ۱۷۲، ۲۱۹
جنرل گلزار جمشید کیانی، لیفٹیننٹ، ۱۹۳
جنرل محمد زبیر، لیفٹیننٹ، ۱۹۰، ۱۹۱
جنرل یحییٰ خان، ۵۹، ۷۲
جنسی تلذذ، ۵۰ / جنسی جرائم، ۶۳
جنوبی ایشیا، ۱۰۲
جنیوا، ۹۸
جونیجو، محمد خان، ۶۱، ۶۹، ۱۲۴
جہاد، ۱۴۸ / جہادی تنظیمیں، ۸۴
جی ایچ کیو (جنرل ہیڈ کوارٹرز)، ۹۹
جیالوجسٹ، ۸۴
جیکب آباد، ۱۲۰
جیو ٹی وی چینل، ۱۳، ۲۱۰، ۲۱۱
جیوانی، ۱۰۰
جھوٹی گواہی، ۳۱

چ

چارسدہ، ۹۷
چارلس کنیڈی، پروفیسر، ۶۶، ۵۳
چوری کی سزا کا مجوزہ قانون، ۲۱
چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا، ۵۵
چوری، ۲۱، ۲۲، ۳۱، ۴۸، ۵۵، ۵۶، ۷۶، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۵
چوہدری پرویز الٰہی، ۷۹، ۸۰
چوہدری شجاعت حسین، ۳۲، ۴۲، ۷۰، ۷۹، ۸۰
چوہدری ظہور الٰہی، ۶۱
چیف جسٹس کی تقرری، ۳ / چیف جسٹس کی بحالی، ۱۴۷
چیف جسٹس پاکستان، ۵۴
چیف کمشنر اسلام آباد، ۱۳۰

چیک، ۱۶، ۳۶، ۱۱۳ / چیکوسلواکیہ، ۲۲۵

چیئرمین ایف بی آر (فیڈرل بورڈ آف ریونیو)، ۲۶

ح

حدود اور تعزیر، ۲۲، ۴۴، ۴۵، ۵۷ / حد اور تعزیر میں فرق، ۴۵ / حد کی سزا میں تخفیف نہیں، ۴۸ / حددو اور حدود قوانین میں فرق، ۶۱

حدود اللہ، ۴۰، ۴۴، ۴۸، ۵۳، ۷۵

حدود آرڈیننس، ۳۱، ۳۴، ۴۰، ۴۲، ۴۳، ۴۸، ۵۳، ۵۷، ۵۸، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۶، ۶۸، ۷۰، ۷۱، ۷۵، ۷۸، ۷۹ / حدود قوانین، ۲۲ / حدود آرڈیننس پر اعتراضات کا جائزہ، ۵۷ / حدود آرڈیننس خواتین کے لیے امتیازی قانون، ۶۶ / تحفظ نسواں قانون، IX، ۳۱، ۳۴، ۳۹، ۴۹، ۶۲ / حدود آرڈیننس کے بعد جرائم میں اضافہ، ۶۲ / حدود پر مبنی نظام اور مغرب کا پروپیگنڈہ، ۵۲ / حدود خدا کے خلاف جرائم کی سزائیں، ۶۰ / حدود شرعیہ، ۸۷، ۱۴۹ / حدود کی سزا، ۲۱

حدود قوانین اور پاکستان کے معاملات میں بیرونی مداخلت، ۷۰ / حدود قوانین کی بالاتر حیثیت کا خاتمہ، ۴۸

حدیث، ۳۶، ۴۷، ۵۶، ۶۷، ۱۴۱

حرکی اسلام، ۳۷

حزبِ اختلاف، ۸، ۳۲، ۷۱، ۷۹، ۱۰۱، ۱۴۳، ۱۵۴، ۱۶۵، ۱۷۳

حزبِ اقتدار، ۸، ۱۴۳، ۱۷۳

حضرت آدم علیہ السلام، V

حضرت عبدالرحمٰن اوسط، ۱۴۸

حضرت عمر فاروقؓ، ۱۴۸

حضرت عمرو بن العاصؓ، ۱۴۸

حضور پاک ﷺ، V، ۸، ۳۶، ۴۰، ۴۵، ۴۷، ۴۸، ۵۳، ۵۶، ۵۹، ۷۱، ۷۶، ۷۸، ۸۳، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۴۱، ۱۴۹

حق حکمرانی، ۱۶۲، ۱۶۳

حقوق کی پاسداری، ۱۳۸ / حقوق کی پامالی، ۱۳۸، ۱۵۹ /

حقوق کی عدم ادائیگی، ۱۷۱

حکومت کی بالادستی،، ۲۱۳

حیاتیاتی حقیقت، ۵۵

حیدر آباد ڈویژن کی انسداد دہشت گردی کی عدالت، ۶۹

حیدر آباد، ۱۶۸

خ

خالد اسحاق ایڈووکیٹ، ۶۱

خالق کائنات، ۱۳۸

خاندان، ۴۴، ۷۶، ۱۰۳، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۴۱، ۱۸۰، ۱۸۱، ۲۰۰، ۲۰۳

خانہ جنگی، ۱۵۹، ۱۷۲

ختم نبوت ﷺ کا قانون، ۳۷

الخدمت، ۱۱۳

خطرناک ادویات کی فروخت، ۱۱۵

خلفائے بنوامیہ، ۱۴۹

خلفائے ترکی، ۱۴۹

خلفائے راشدینؓ، ۱۴۹

خلفائے سپین، ۱۴۹

خلفائے مصر، ۱۴۹

خواتین کی ترقی، ۱۸ / خواتین کی حفاظت، ۵۷ / خواتین کے حقوق، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۶۶، ۱۳۱

خواتین کی عزت کو پامال کرنا، ۵۶

خواجہ محمد صفدر، ۶۱

خود احتسابی، ۱۱۲

خودکش حملے، ۱۵۴

خود مختار قوم کا قانون سازی کا نظام، ۳۷

خودکشی، ۱۸

خونی انقلاب، ۱۶۳

سرحد (خیبر پختونخوا)، ۸، ۱۴، ۸۲، ۸۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۴، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۵۴، ۱۵۸، ۱۶۸، ۲۰۵

خیمہ بستیاں، ۹۴

د

داخلی یا بیرونی تصادم، ۱۱۵
دارالافتاء دیوبند، ۱۴۸
دبئی، ۱۵۹
دستور، ۲، ۳، ۶، ۸، ۱۳، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۳۲، ۳۸،
۵۹، ۶۹، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۸، ۸۹، ۱۱۱، ۱۲۱، ۱۴۰،
۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۲،
۱۶۴، ۱۷۰، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۹،
۲۱۴، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۸
دستور پاکستان، ۱۹، ۸۷/ دستور پاکستان کے تقاضے، ۸۷/
دستور سازی، ۱۵۵/ دستور کی پامالی، ۱۴۰، ۱۴۱/
دستور کی تنسیخ، ۱۴۰/ دستوری نظام، ۲۲۸
دستور وفاق کی علامت، ۳۸
دستوری ادارہ، ۱۹۳، ۱۹۴/ دستوری پیکیج، ۱۴۷/ دستوری
حق، ۱۷/ دستوری وعدالتی اصلاحات، ۱۵۳
دفاعی پیداوار، ۱۸۸
دہشت گردی، ۳۵، ۳۷، ۶۹، ۹۳، ۱۱۱، ۱۵۳، ۱۵۴،
۱۵۵، ۲۰۹
دہشت گردی کے خلاف جنگ، ۹۳، ۱۱۱، ۱۵۳، ۱۵۴
دہلی، ۱۶۸
دوایوانی مجلس قانون ساز، ۲۱۹
دور رسالت، ۱۴۹/ عہد رسالت ﷺ، ۶۵
دولت مشترکہ کے سیکرٹری جنرل، ۱۰۲
دی لابی، ۲۱۳
دی مسلم، ۲۱۶، ۲۲۵
دی نیوز (The News)، ۱۱۸، ۱۲۶، ۱۳۰
دیت کی ادائیگی کی مدت، ۱۳۴/ دیت کی عدم ادائیگی،
۱۳۳/ دیت کا قانون، ۱۳۳
دین کی حفاظت، ۴۶
دینی تعلیم، ۳۷، ۴۴
دینی جماعتیں، ۸۴
دیوار برلن، ۲۰۱، ۲۰۲

ڈ

ڈاکٹر اشفاق حسن خان، ۱۹۰، ۱۹۱
ڈاکٹر حسن ترابی، ۶۱
ڈاکٹر راشد امجد، ۱۹۰، ۱۹۱
ڈاکٹر فاروق (وکیل)، ۳۵
ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان، ۲۰۷
ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی، ۷۹، ۸۰
ڈاکٹر مشتاق احمد، ۱۴۹
ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا، ۶۱
ڈاکٹر معروف الدوالیبی، ۶۱
ڈاکٹر ذاکر نائیک، ۲۱۱
ڈان، روزنامہ، ۱۱۲، ۱۵۸، ۱۶۵
ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن، ۱۹۱
ڈونلڈ ٹرمپ، امریکی صدر، ۵۸
ڈی ایس پی، ۱۲۹
ڈی آئی جی، ۱۵۱
ڈی چوک، ۱۴۵
ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی، ۱۰۱

ذ

ذرائع ابلاغ، ۵۸، ۱۰۹، ۱۱۷، ۱۷۹، ۱۹۸، ۲۰۷، ۲۱۱/
میڈیا، ۱۳، ۸۲، ۹۸، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۵۸، ۱۹۸، ۲۰۸،
۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۵/ پریس کی آزادی، ۲۲۹
ذیشان، ۱۳۰

ر

رام چندرن، ۲۳۰
راولپنڈی، ۸۵، ۱۶۰، ۹۵/پنڈی کانالہ لئی، ۹۸
رائے عامہ، ۱۴۲، ۱۹۱، ۱۹۸، ۲۰۴، ۲۱۳
رحمٰن ملک (وزیر داخلہ)، ۱۳۰، ۱۵۹
رسم ورواج، ۱۳۲
روائید اد خان (سابق سیکرٹری داخلہ)، ۲۷
روزگار کا حصول، ۹۴/روزگار کا مسئلہ، ۱۷۷
روزہ، ۴۲، ۸۳
روس، ۳۶
روشن خیالی، ۳۸، ۳۹
رومانیہ، ۳۶
ریاست، ۶۰، ۷۵، ۹۰، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۴۶، ۲۱۰/جان و
مال کا تحفظ ریاست کی بنیادی ذمہ داری، ۱۳۷
ریاستی پالیسی کے رہنما اصول، ۱۷
ریاستی تشدد، ۱۷۰
ریلیف کمشنر، ۸۸
رینجرز، ۱۴۵، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۴
رینجرز کمانڈر، ۱۷۴

ز

زانی مرد، ۴۶
زانیہ عورت، ۴۶
زر تلافی، ۱۸۹
زراعت، ۱۱۳، ۲۰۴
زرداری، آصف علی، صدر، ۲۰۳
زلزلہ پیما نقشہ، ۸۵
زلزلہ متاثرین ۲۰۰۵ء، ۱۰۶
زلزلہ، ۸۱، ۸۴، ۸۵، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۰۶/زلزلہ
اکتوبر ۲۰۰۵ء، ۱۰۱
زنا آرڈیننس، ۵۲، ۶۲
زنا بالجبر، ۳۱، ۳۴، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۶۲، ۶۳، ۶۴،
۶۷، ۶۸، ۷۴، ۷۵
زنا بالجبر کے مرتکب کے لیے سزا، ۴۳
زنا بالرضا، ۳۱، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۵۰، ۶۳، ۶۸، ۷۴
زنا کا تصور، اسلامی و مغربی قانون میں، ۴۷
زنا کی تعریف، ۴۷
زنا کے معاملات میں عورت کی گواہی، ۶۴

س

ساؤتھ کیرولینا، ۵۸
سپریم کورٹ، ۱، ۱۳، ۱۴، ۳۶، ۵۴، ۵۶، ۵۷، ۶۷، ۱۵۶،
۱۷۶، ۱۸۷، ۱۹۵، ۲۳۰/سپریم کورٹ اپیلیٹ بنچ، ۴۲
سپین، ۲۲۵
سر جان ولیم سالموند کے سی (Sir John William
Salmond KC)، ۵۴
سرائیکی بیلٹ، ۱۵۴
سردار نصر اللہ دریشک، ۷۹، ۸۰
سرقہ، ۵۰
سرمایہ پرستی، ۱۱۸
سرمایہ دارانہ نظام، ۱۱۸
سرمایہ کاری، ۲۴، ۲۹، ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۶۶، ۱۹۷/سرمایہ
کاری کانفرنس، ۱۶۷
سزائے موت، ۱۰، ۱۱، ۱۲
سعودی قانونی نظام، ۶۰
سعودی عرب، ۴۰، ۶۱
سعیدہ یاسمین رئیسانی، ۲۰۳
سکھر، ۱۲۰
سلمان فاروقی (سابق وفاقی سیکرٹری)، ۱۹۱
سلوویکیا، ۳۶
سماجی اقدار، VII

سماجی تحفظ کا آئینی حق، ۱۷/ سماجی تحفظ کا نظام، ۱۷
سندھ، ۱۴، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۲۰، ۱۳۷، ۱۵۷، ۱۶۳، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶
سندھ طاس معاہدہ، ۲۰۴، ۲۰۶
سندھ کارڈ، ۱۶۹، ۱۷۰
سندھ کے وزیر اعلیٰ، ۱۰۹، ۱۶۶
سنسر شپ پالیسی، ۲۱۲
سنگین غداری، ۱۴۰
سنن نسائی، ۱۴۱
سوات، ضلع، ۱۵۸
سوڈان کے اٹارنی جنرل، ۶۱
سول سروس ایکٹ، ۱۷۹
سول سوسائٹی، ۲۰، ۳۳
سومرو، میاں محمد، ۲۲۴
سونیا گاندھی، ۲۱۱
سوئٹزر لینڈ، ۳۶، ۲۲۵
سوئی ناردرن، ۱۸۴
سی آئی اے، ۳۵، ۱۷۰
سی پی، ۱۶۸
سی ڈی اے، ۱۲۴
سیاسی قتل، ۱۵۵/ سیاسی مقدمات، ۱۷۵/ سیاسی جماعتیں، ۸۴/ سیاسی اسلام، ۳۷/ سیاسی بے یقینی، ۱۵۳/ سیاسی عدم استحکام، ۲۹، ۱۵۳/ سیاسی نظام کا تسلسل، ۲۲۴
سیالکوٹ، ۱۵۵، ۱۵۷
سیشن جج، ۳۴، ۵۰، ۶۲، ۶۹/ سیشن کورٹ، ۳۴، ۵۰
سیکرٹری آبی و توانائی وسائل، ۲۶
سیکرٹری پٹرولیم، ۲۶
سیکرٹری پلاننگ، ۲۶
سیکرٹری خزانہ، ۲۶
سیکورٹی کا انحصار، ۱۴۶/ سیکورٹی کا مسئلہ، ۱۱/ سیکورٹی کا
ہنگامی منصوبہ، ۱۲۵
سیکولرازم، ۳۸، ۵۱/ سیکولر قانون کا غلبہ، ۳۹
سیلاب سے تباہی (۲۰۱۰ء)، ۱۰۷/ سیلاب کی مانیٹرنگ کا نظام، ۱۰۸
سیلف سنسر شپ، ۲۱۲
سینیٹ آف پاکستان، ۱، ۱۰، ۳۲، ۸۱، ۱۳۰، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۵۴، ۱۶۵/ سینیٹ استحقاق کمیٹی، ۲۳۱/ سینیٹ فنانس بل، ۲۲۶/ چیئرمین سینیٹ کا فنڈ، ۱۰۶/ سینیٹ کا احتساب، ۲۱۷/ سینیٹ کا تسلسل، ۲۲۳/ سینیٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی برائے قانون اور انسانی حقوق، ۷/ سینیٹ کی تعریف، ۲۲۸/ سینیٹ کی کارکردگی، ۲۲۸
سینیٹر آفتاب احمد شیخ، ۲۱، ۲۲
سینیٹر اسرار اللہ زہری، ۱۳۰
سینیٹر ایس ایم ظفر، ۱۶
سینیٹر بی بی یاسمین شاہ، ۱۳۰
سینیٹر چوہدری انور بھنڈر، ۱۲، ۲۱
سینیٹر ڈاکٹر عبد المالک بلوچ، ۹۷
سینیٹر سعدیہ عباسی، ۲۷، ۱۴۵، ۱۴۶، ۲۱۵، ۲۱۶
سینیٹر سعید قادر، ۱۲۳
سینیٹر شہزاد گل، ۲۱
سینیٹر شیری رحمٰن، ۲۱۲
سینیٹر طارق عظیم، ۱۸۸
سینیٹر ظہیر الدین بابر اعوان، ۶، ۱۶
سینیٹر عبد الرحیم خان مندوخیل، ۹۷، ۹۸، ۱۱۸، ۱۷۵
سینیٹر کامران مرتضیٰ، ۱۳۳، ۱۴۵
سینیٹر گل نصیب خان، ۹۷
سینیٹر محمد علی درانی، ۲۰۴
سینیٹر منظور گچکی، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۳۱
سینیٹر نیئر حسین بخاری، ۱۳۳
سینیٹر وسیم سجاد، ۷، ۱۱

ش

شالیمار پولیس اسٹیشن، ۱۲۹، ۱۳۰
شام کے سابق وزیر اعظم، ۶۱
شام میں پاکستانی سفیر، ۲۰۲
شاہ ولی اللہ، ۵۹
شاہراہوں پر لوٹ مار، ۱۳۹
شراب کی سمگلنگ، ۱۲۹ / شراب کی فروخت، ۱۲۹ / شراب کشید کرنا، ۱۲۶
شراب نوشی، ۳۱
شریعت بل، ۲۲۲
شریف الدین پیرزادہ، ۶۱
شفافیت اور محاسبہ کا نظام، ۹۳
شمالی علاقہ جات، ۱۵۴
شودر، ۱۶۸
شہری دفاع، ۸۶، ۹۲، ۹۸
شہریوں پر تشدد، ۱۵۸

ص

صحافتی کونسل، ۲۰۸
صحافیوں کا تحفظ، ۲۰۷
صدارتی فنڈ، ۹۳
صدام حسین، عراقی صدر، ۵۸
صوبائی اسمبلی، ۲۲۱/ پرووِنشل اسمبلی، ۲۲۴/ صوبائی اسمبلی کا کردار، ۱۷۶/ صوبائی بار کونسل، ۱۵/ صوبائی حکومت، ۱۵، ۸۹، ۱۰۱/ صوبائی خود مختاری، ۲۷
صوبوں کے چیف سیکرٹری، ۲۶
صوفی اسلام، ۷، ۳، ۴۴

ض

ضابطہ فوجداری، ۵، ۷، ۱۰، ۳۱، ۵۰، ۷۵

ط

طلاق، ۴۹، ۷۷

ع

عالمی قوانین، VIII
عاقلہ، ۱۳۳
عبداللہ شاہ، سید (وزیر اعلیٰ)، ۱۶۶
عبدالغفور حسین، فاضل جج، ۶۹
عدالت عالیہ، ۶۸ / عدالت عظمیٰ، ۱۴۰
عدالتوں میں ججوں کی تقرریاں، ۱۴
عدالتی چارہ جوئی کا طریقہ کار، ۳۲/ عدالتی نظام، VII
عدلیہ کی آزادی، ۱۴
عدلیہ میں کرپشن، ۳۳
عدم تشدد پر مبنی تحریک، ۱۶۹
عدم رواداری، ۲۰۹
عراق، ۵۷، ۵۸
عسکری بالادستی، ۸۹
عصمت دری، ۳۹، ۵۷، ۱۳۹ / عصمت دری، اجتماعی، ۵۷ / عصمت دری کا قانون، ۳۹
عقل کی حفاظت، ۴۶
علاقائی روایات، ۲۱۵
علماء کرام کی سفارشات، ۸۷
عماریاسر، حافظ، محمد، ۹۷
عوام کی جان کی حفاظت، ۱۱۵
عورت کی آزادی، ۳۱/ عورت (Woman) کی تعریف، ۱۹
عورتوں پر مظالم، ۳۲، ۵۲
عورتوں کے لیے امتیازی قانون، ۶۶

غ

غربت اور افلاس، ۱۱۸/ غربت کی لکیر، ۱۷، ۲۱۵/
غریب طبقات،۱۸۵
غلام اسحاق خان،۶۱
غلام نبی کاٹھیو،۶۸،۶۹
غوث بخش،۱۳۰
غیر جانبدار انتظامیہ،۱۷۵
غیر ملکی عطیہ دھندگان،۱۱۱

ف

فاٹا،۲۲۰/ وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقے،۳
فاشزم،۳۷
فاطمہ بنت اسود،۶۷،۱۴۱
فاطمہ بنت محمد ﷺ،۴۸،۶۷،۱۴۱
فاطمہ دختر امیر علی عمرانی،۱۳۰
فحاشی،۴۳،۵۰،۷۹،۱۲۶،۲۰۹
فرانس،۳۶،۱۰۹،۲۲۵
فرقہ واریت،۱۵۴،۱۶۶/ فرقہ وارانہ معاملات،۱۳
فرنٹیئر پوسٹ،۲۳۱
فرنٹیئر کور،۱۶۱
فقہ حنفی،۱۳۱/ حنفیہ،۷۷
فوج کی سیکورٹی،۸۷/ فوج کی موبلائزیشن،۸۵
فوج کی عملاً حکمرانی،۱۵۸
فوجداری انصاف، ۶۰، ۱۶۳/ فوجداری عدالتی نظام، ۱۶۳/ فوجداری معاملات، ۱۲/ قانون فوجداری میں ترمیم (۲۰۱۰ء)،۱۳۳
فوجی حکومت کا خاتمہ، ۱۵۳/ فوجی ڈکٹیٹر، ۵۸/ فوجی مداخلت،۱۶۳
فوزیہ دختر امام بخش عمرانی،۱۳۰
فیڈرل ایریا،۳
فیڈرل پبلک سروس کمیشن،۱۹۳
فیڈرل شریعت کورٹ، ۴۲/ فیڈرل کورٹ، ۲/ وفاقی شرعی عدالت، ۳۱، ۴۹، ۶۴، ۶۷، ۶۸/ وفاقی شریعت کورٹ،۶۲
فیڈرل گورنمنٹ سروس،۱۸۴
فیڈرل نظام،۲۲۷
فیڈریشن کے حقوق،۲۱۹،۲۲۷
فیصل آباد،۱۲۰

ق

قانون مؤثر بہ ماضی،۱۹۶
قانون برائے انسانی حقوق کمیشن،۷
قانون جیل خانہ جات،۱۰/ جیلوں کے قوانین وضوابط، ۱۰/ جیلوں میں مامور اسٹاف،۵۴
قانون سازی، ۱، ۲، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۹، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۷، ۶۶، ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۸۸، ۹۱، ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۸۵، ۱۹۳، ۲۰۸، ۲۱۳، ۲۲۶، ۲۲۷/ قانون تعزیرات،۴۶/ قانون سازی میں غیر سنجیدگی،۱۴۳
قانون کا احترام، ۱۴۳، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۶۱/ قانون کی بالادستی، ۱۵۲، ۱۵۴/ قانون کی حکمرانی، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۶۱، ۱۶۴/ توہینِ رسالت ﷺ کا قانون،۱۷/ ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کا قانون،۳۷/ قانون کی برابری کا فقدان، ۱۴۱/ قانون کی حفاظت، ۱۴۲/ پیشہ قانون، ۳۳/ قانون کے نفاذ کی مشینری،۱۵۱
قانونی علم Jurisprudence،۵۳
قاہرہ،۱۸
قائد اعظم، محمد علی جناح،۱۷،۹۳،۲۰۱
قائد ایوان،۸،۱۰۵،۱۴۳،۱۴۷/ قائد حزبِ اختلاف، ۸،۹/ لیڈر آف دی اپوزیشن،۱۷۳

قبائلی چپقلش، ۱۵۴/ قبائلی علاقے، ۱۵۴
قبیلۂ بنو مخزوم، ۷۶
قتل، ۳۶، ۵۰، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۵، ۱۵۵، ۱۶۵، ۱۶۶
قدرتی آفات، ۸۱، ۸۶، ۱۰۸، ۱۱۵
قدیم جاہلی دور، ۱۳۲
قذف، ۳۱
قرۃ العین امین اللہ رئیسانی، ۲۰۳
قرآن و سنت، ۳۱، ۴۲، ۴۹، ۵۳، ۷۱، ۷۴، ۷۵، ۷۷، ۷۸، ۹۷، ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۵۰/ قرآن و سنت کے احکام، ۷۴، ۷۸، ۱۴۳/ قرآن کا فیصلہ، ۴۸
قرطبہ یونیورسٹی، ۱۴۹
قریش، ۷۶، ۱۳۸
قصاص، ۶۰، ۶۵، ۱۳۳
قصر ناز، ۱۷۴
قوانین اور حدود، ۱۳۳
قوانین کو اپنانے کا اختیار، ۴
قومی اسمبلی (نیشنل اسمبلی)، ۲، ۷، ۸، ۹، ۲۱، ۲۳، ۲۹، ۳۲، ۳۸، ۷۱، ۷۸، ۹۷، ۸۲، ۱۳۵، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۷
قومی اہمیت کا مسئلہ، ۱۸۱
قومی بجٹ، ۸۹
قومی رضاکار تنظیم، ۸۶، ۹۸/ قومی رضاکار فورس، ۱۰۲
قومی کمیشن برائے اسٹیٹس آف ویمن بل، ۱۸
قومی یکجہتی، ۸۲

ک

کاٹھیو (ذات)، ۶۸، ۶۹
کارچوری، ۲۱، ۱۳۷، ۱۳۹
کارگل کا واقعہ، ۴۷
کاروکاری، ۱۳۱
کالا باغ ڈیم، ۱۰۴
کبل (سوات)، ۱۵۸
کترینہ، سمندری طوفان، ۸۳
کراچی کا مسئلہ، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۷۵/ کراچی کے شہری، ۱۶۷/ کراچی میں ہجرت، ۱۷۷
کرائسس مینجمنٹ، ۸۷، ۹۶
کرک، ۹۷
کروشیا، ۳۶
کشمیر، ۲۶، ۱۹۸، ۲۰۵، ۲۰۶
کمال ازم، ۳۸، ۵۱
کمیشن کی دستوری حیثیت، ۱۹۴
کوٹری بیراج، ۱۱۲
کور کمانڈر، ۸۵
کوڑوں کی سزا/ سنگسار کی سزا، ۳۱
کوسٹل ہائی وے، ۱۰۰
کوئٹہ، ۸۱، ۱۰۵/ کوئٹہ میں زلزلہ (۲۰۰۸ء)، ۱۰۵
کینیڈا، ۲۲۵/ حکومت کینیڈا، ۲۲۵

گ

گارڈین، ۱۵۸
گالف کلب، ۹۹
گلگت، ۲۶، ۱۳۷/ گلگت بلتستان، ۲۶
گلوبل لائف واٹر، ۱۲۰
گوئبلز، ۶۶
گوادر، ۱۰۰
گوانتاناموبے (جیل)، ۳۵
گوجرانوالہ، ۸۶، ۱۱۷
گوجرہ، ۱۵۵
گورنر ہاؤس، ۱۶۱
گولڈن ہینڈ شیک، ۱۸۶، ۱۸۷
گوہر ایوب خان، ۱۷۲

ل

لابنگ،VIII
لاپتاافراد،۱۵۵
لادینیت کاایجنڈا،۳۵/لادینی تناظر،۱۲
لاقانونیت،۱۳، ۳۳، ۴۲، ۴۴، ۴۷، ۱۴۸
لاہور،۹۳، ۱۲۰
لاہورہائی کورٹ،۱
لاءاینڈ آرڈر کامسئلہ،۱۵۱
لاءڈویژن،۴۹
لاءریفارمز کمیشن،۱۵۰
لائن آف کنٹرول،۸۸
لڑکی(Girl) کی تعریف،۱۹/ لڑکیوں کوزندہ درگور کر
دینا،۱۳۲
لعان،۶۷، ۷۷
لعل محمد خان(وفاقی وزیربرائے خصوصی اقدامات)،۱۲۰
لندن،۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۱، ۲۱۳
لیبر اتاشی،۱۹۹

م

مارشل لاء،۱۱، ۱۶۲، ۱۷۲/مارشل لاء۱۹۵۸ءکا،۲۷
مالیاتی حکمت عملی،۹۳
مانسہرہ،۹۷
ماوردی،۵۹
متاثرہ علاقوں کے لیے فوری پیکیج،۱۰۳
متناسب نمائندگی،۲۲۴
مجلس شوریٰ،۱۴۰، ۱۸۶
محسن،۴۷
محکمہ موسمیات،۸۴، ۸۵، ۱۰۸
محمد اقبال عرف بالابنام سرکار،۶۴
محمد اسحٰق،۲۰۳
محمد علی بنام سرکار،۶۴
مرادپلوانی،۱۳۰
مردم شماری،۱۷۷
مرکزاور صوبوں کے درمیان کوارڈی نیشن،۹۰
مرکز کی سول حکومت،۸۹
مس عباس،۲۰۳
مسلم فیملی لاء،۴۹
مسلم دنیا،۳۹، ۴۰
مسلم لیگ،۶۱، ۱۷۵، ۱۸۳، ۱۸۷
مسلم لیگ(ق)، حکمران پارٹی،۳۲، ۴۲، ۵۲، ۷۰، ۷۲،
۷۷، ۷۹
مسلم لیگ(ن)،۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳
مسلمان عورت،۳۶، ۳۷، ۴۴/ مسلمان عورت کے
حقوق،۳۷
مشرق وسطیٰ،۵۸
مشرقی ممالک،۵۵
مظلوم کی حفاظت،۱۴۲
معاشرتی جرائم،۳۱
معاشی ترغیبات کامسئلہ،۱۷۷/ معاشی تشدد،۱۷۰/
معاشی عدم استحکام،۱۵۳
مغرب کی مادر پدر آزاد معاشرت،۸۷
مغربی استعمار،۵۹
مقاصد شریعۃ،VIII
مقامی حکومت،۱۱۹، ۱۷۶
مقامی حکومتیں،۸۹، ۹۰، ۹۷، ۱۰۱، ۱۰۲
مقتدرہ برائے امدادوبحالی زلزلہ زدگان،۸۸
مکہ مکرمہ،۱۳۸
ملائشیا،۲۲۵
ملتان،۱۵۵
ممتاز علی بھٹو(سابق گورنر)،۱۶۹
منصوبہ بندی کمیشن،۱۱۰، ۱۹۱

منگلا، ۱۰۴
مینجنگ ڈائریکٹر واپڈا، ۲۶
موٹروے ٹریفک پولیس، ۱۴۲، ۱۶۳
موسمیاتی انتظام کا ادارہ، ۹۲
موضع گڑھی رحمان، ۱۳۰
مولانا اخلاق احمد، ۷۹، ۸۰
مولانا ڈاکٹر محمد عبد الرزاق، ۴۲
مولانا زاہد الراشدی، ۷۹، ۸۰
مولانا سمیع الحق، ۴۲
مولانا ظفر احمد انصاری، ۶۱
مولانا فضل الرحمٰن، ۷۹
مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، ۴۲، ۷۹، ۸۰
مولانا محمد تقی عثمانی، مفتی، ۴۲، ۴۵، ۶۱، ۶۸، ۷۹، ۸۰
مولانا محمد رفیع عثمانی، مفتی، ۴۲
مولانا محمد حسن جان، ۴۲، ۷۹، ۸۰
مولانا مفتی غلام الرحمٰن، ۷۹، ۸۰
مولانا مفتی منیب الرحمٰن، ۷۹، ۸۰
مولانا یوسف بنوری، ۶۱
مہاجر کارڈ، ۱۷۰
مہاجر، ۱۱۲، ۱۶۵، ۱۷۰ / مہاجر صوبے کا نعرہ، ۱۶۵
مہذب فلاحی معاشرہ، ۱۴۲، ۱۴۳
میاں بانڈہ، ۱۵۸
میثاق جمہوریت، ۱۵۳
میرانی ڈیم، ۱۰۴
میرو، ۶۹
مرک (Merck) فارماسیوٹیکل کمپنی، ۱۱۶، ۱۱۷
میکسیکو، ۲۲۵

ن

نائن الیون ۹/۱۱ کمیشن کی رپورٹ، ۳۸
نجی سرمایہ کاری کے فروغ اور تحفظ کا ترمیمی قانون، ۲۹
نسل اور مال کی حفاظت، ۴۶
نصیر آباد، ضلع، ۱۳۰
نصیر خان، ۱۱۸
نظامِ احتساب، ۳۴ / نظامِ عدل، ۳۴، ۶۵، ۱۳۱، ۱۴۷
نفس کی حفاظت، ۴۶
نکاح، ۴۷، ۱۳۱
نوابزادہ نصر اللہ، ۶۱
نواں ترمیمی بل، ۲۲۲
نو آبادیاتی نظام قانون، ۳۲
نوبل پرائز، ۱۸۳
نیدرلینڈ، ۲۲۵
نیشنل پولیس کمیشن اینڈ کمپلینٹ اتھارٹی، ۱۳۷
نیشنل کرائسز سیل، ۱۰۱ / نیشنل کرائسز کمیشن، ۹۹
نیلم ڈیم، ۱۰۳
نیویارک ٹائمز، ۲۱۳

و

واشنگٹن، ۳۹، ۱۱۴، ۱۵۴
وائٹ ہاؤس، ۳۹
ویوکس (دوائی کا نام) Vioxx، ۱۱۶
وِدیادھر مہاجن، پروفیسر، ۶۰
وزارتِ امور خارجہ، ۲۰۰ / وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری، ۱۲۴ / وزارتِ دفاع، ۱۸۸، ۱۸۹ / وزارتِ صحت، ۱۱۵، ۱۱۶ / وزارتِ قانون، ۱، ۲، ۳، ۱۶، ۱۹، ۷۹
وزیر اطلاعات، ۸۵، ۲۰۸
وزیر تعلیم، ۸۶
وزیر خارجہ، ۲۰۲
وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار، ۵۸
وفاقی یونٹوں کی مساوی نمائندگی، ۲۲۷
وی وی آئی پیز، ۱۴۱
ویٹو، ۲۲۲، ۲۲۶

ہ

ہارورڈ یونیورسٹی، ۲۱۳

ہاؤس آف کامنز، ۲۲۹

ہائی کورٹ، ۱، ۲، ۶، ۱۰، ۱۳۰، ۱۷۶، ۱۹۵

ہتک عزت، ۲۱۰، ۲۱۸

ہٹلر (Adolf Hitler)، ۳۶

ہندو فوجداری قانون کے ماہرین، ۵۶/ ہندو مؤرخین، ۵۹

ہندوستان سے مذاکرات، ۲۰۴/ بھارت، ۱۶۲، ۲۰۱، ۲۰۶/ انڈیا، ۲۲۵/ انڈین پینل کوڈ ۱۸۹۸ء، ۳۲/ انڈین چینلز، ۲۱۰/ ہندوستان کی تقسیم، ۲۰۱/ ہندوستان کے ثقافتی حملے، ۲۱۰/ ہندوستان کی سپریم کورٹ، ۵۶/ یوپی (بھارت)، ۱۶۸

ہندوستان میں پارلیمانی استحقاق کا قانون، ۲۳۰

ہنگامی صورتِ حال کے لیے مستقل نظام، ۱۰۸

ہنگری، ۳۶

ہولوکاسٹ، ۳۶

ہیلتھ کا بجٹ، ۱۱۳

ہیلی کاپٹر، ۸۷، ۹۹، ۱۰۶

ی

یونان کی سیاسی فکر، ۱۴۶

یوٹیلیٹی سٹورز، ۱۸۴

یورپ، ۳۵، ۳۶، ۳۷/ یورپ میں عورت اور مرد کا تصادم، ۳۷

یورپین یہودی، ۳۶

یوسف رضا گیلانی (وزیر اعظم)، ۱۴۷

یونان، ۹۰

یونین کونسل، ۱۰۲، ۲۱۷، ۲۲۱

یہودیوں، ۳۵، ۳۶